NOVEL
JALALI BOOKS
نعمت خانہ
خالد جاوید

نعمت خانہ

خالد جاوید

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

نام کتاب	:	نعمت خانہ (ناول)
مصنف	:	خالد جاوید
پتہ	:	شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی
ای۔میل	:	khalidjawed_09@yahoo.co.in
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق	:	دانش فراز، لیزا
بیک کور	:	ویزگاف: آلو کھانے والے
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Nemat Khana (Novel)

by Khalid Jawed

Edition : June 2014 **Rs.: 440/-**

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائل بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ

arshia publications

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)

Mob: (0) 9899706640, 9971775969 Email: arshiapublications@gmail.com

Composed at: *Frontech Graphics*

Abdul Tawwab 9818303136
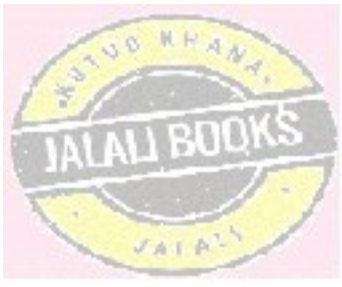
شہریار

اور

وارث علوی

کی یاد میں

فہرست

''اس عزیز نے کمال تکلف سے سامان ضیافت کا مہیا کر کے سفرہ دعوت کا آراستہ کیا اور انواع طعام ہائے لذیذ و خوشگوار و اقسام شیرینی ہائے حلاوت بخش و چاشنی دار و اصناف شربت ہائے گلاب و بید مشک و گوناگوں میوہ ہائے تر و خشک وغیرہ و لوازمہ اکل و شرب از قسم نان پروی و نان ورقی و نان تنکی و نان پنیری و نان خمیری و نان باقر خانی و گاؤ زبان و گاؤ دیدہ آبی و روغنی و خطائی و شیر مال و نان گلدار، قلیہ و دو پیازہ، نرگسی و شیرازی و زعفرانی و بادامی، کباب، قلیہ، کوفتہ، خاگینہ، ملغوبہ، پن بھتہ، بورانی، بریانی نور محلی و خراسانی، رومی، تبریزی و شب دیگ، دم پخت، خشکہ و مزعفر و شولا و تنجن پلاؤ و قورمہ پلاؤ، یخنی پلاؤ و حبشی پلاؤ و بیگمی، چاشنی، عنبری، کاشانی و ماہی کباب و مرغ کباب و سیخ کباب، بیضہ کباب و حلیم و حریسہ و سموسہ و قبولی و طاہری و کھچڑی و فرنی و ملائی و حلوہ فالودہ و نمش، قندی بامشک نافہ و ساق عروس و نوریات، اچار، مربے، ناشپاتی، بہی، انگور، انجیر، سیب، انار، کشمش، بادام، چھوارے، پستے وغیرہ اغذیہ و اشربا قسم قسم کے جن کی چاشنی کی حلاوت اور ذائقہ سے ارواح فرشتوں کو بھی تازہ ہو جاوے۔''

— میر محمد حسین عطا خان تحسین

''گھنگروؤں کو آپس میں جوڑ جوڑ کر میں نے یہ آنتیں بنائی ہیں۔ اور یہ خیال مجھے تب آیا جب میری آنتوں میں ایک بھیانک انفیکشن ہوا۔ یہ ایک استعارہ ہے۔ ٹھوس استعارہ۔ اِسے آپ Exhibit 320 گیلری، لاڈو سرائے، دہلی کے ایک کمرے میں پورے فرش پر بکھرا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

جب آنتیں پیٹ میں گھنگھروؤں کی طرح بجتی ہیں تو دِن اور رات ہونا بند ہو جاتے ہیں اور نئے زمان و مکان وجود میں آتے ہیں۔''

—— وِبھا گلہروترہ

وژن — ؟

''میرا خیال ہے کہ ہمارا وژن تو بچپن میں ہی تشکیل پالیتا ہے۔ اکثر یہ ایک مادّی وژن ہوتا ہے اور 'کھانے' سے اِس کے معاملات کچھ زیادہ ہی گہرے ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے وطن سے کتنی محبت ہوگی، اس کا تعین بھی وہ مختلف اقسام کے 'کھانے' ہی کر سکتے ہیں، جو ہم نے بچپن میں کھائے تھے۔''

— انتھونی برگیس

''اگر فرائیڈ کا کہنا تھا کہ ہم سب بیمار ہیں تو میرا کہنا ہے کہ ہم سب غیر معیاری ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ ہم کسی اچھی کتاب کو رد کریں، دراصل وہ تو اچھی کتاب ہی ہوتی ہے جو ہمیں رد کرتی ہے۔''

—— ٹرلنگ
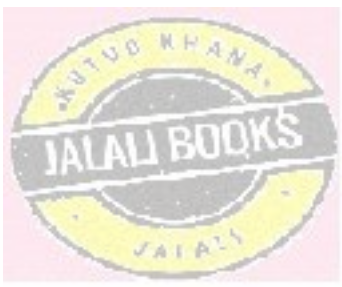
''جس طرح سانڈ بار بار لال رنگ کی طرف لپکتا ہے، اُسی طرح میں بار بار ایک ہی موضوع کی طرف کشش محسوس کرتی ہوں۔''

— سوئیلے یلے مارو

”کسی ملک کا شہری اگر چاہے تو غیر جانب دار رہ سکتا ہے۔ اپنی مرضی سے
مگر ایک ادیب ہمیشہ اپنے آپ کو ”جانب دار“ پاتا ہے۔ وہ چاہے نہ چاہے اس
سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

—لاڈسیلاؤ فکس

"فن کو کسی مخصوص "طرزِ فکر" سے آزاد کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ فن کو طرزِ احساس اور داخلی بصیرت اور اس داخلی بصیرت کے ذریعے دنیا میں معنویت کے وجود کے استحکام کی قوت سے بھی خالی قرار دے دیا جائے۔ فن کار براہِ راست معنی خلق کرے یا نہ کرے۔ وہ ایسی وضع، ایسی ہیئت ضرور خلق کرتا ہے جس سے معنی برآمد ہوتے ہیں۔"

— شمس الرحمٰن فاروقی

''ایک پیشہ ور مکے باز کو معلوم ہے کہ کم سے کم کوشش سے ہی کس طرح کام چلایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ساری طاقت کو اپنے وار میں مجتمع کرنا جانتا ہے اور اس طرح وہ صرف اُن عضلات کو ہی حرکت میں لاتا ہے جن کے ذریعے فوری اور یقینی طور پر اپنے مقابل کو ہرایا جا سکتا ہے۔ یہی اُس کی کامیابی ہے۔ مگر ایک غیر پیشہ ور، دوسرے مکے باز کو یہ مہارت اور ہنر میسر نہیں۔ وہ صرف چند مخصوص عضلات کو حرکت میں نہیں لاتا بلکہ اپنے پورے جسم کو حرکت میں لا کر پوری طاقت اور جوش کے ساتھ وار کرنا چاہتا ہے۔

پہلا وار ایک مکے باز کا ہے اور دوسرا وار ایک انسان کا۔''

——اونا مونو

''میں دُوسروں کی موت سے مُردہ ہوں مگر یہ ایک بے ایمان وفاداری ہے کیونکہ
یہ مجھے دُوسروں سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیتی ہے، جس کا مطلب اُن سب
کی لامحدود معروضیت کی تذلیل کرنا ہے۔''

— ژاک دریدا

"یہ خیال کہ مرنے کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا، بھیانک اور اُداس کر دینے والا ہے۔ کتنا بھی علم حاصل کر لیا جائے مگر بعد میں، یہ صرف دُور پھینک دیے جانے کے لیے ہے۔"

—امبراتیکو

پیش لفظ

(متضاد بیانات کی پانچویں قسط)

نعمت خانہ یعنی 'موت کی دوسری کتاب' حاضرِ خدمت ہے۔

'موت کی کتاب'' کا جو پُرجوش خیر مقدم کیا گیا اور اُسے گفتگو اور بحث کا موضوع بنایا گیا تو اس امر پر میں اپنی مسرّت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہی نہیں، میری انگلیوں کے ناخن بھی خوش ہیں اور پتھر پر ڈالی گئی خراشیں بھی گہری ہوئی ہیں۔ ع

''جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر''

میں اس ناول کو 'موت کی دوسری کتاب' کیوں کہہ رہا ہوں؟ یہ میری ایمانداری کا ثبوت ہے اور دوسری بات یہ کہ میری ہر تحریر ایک موت کی کتاب ہے۔ موت کی کتاب کے علاوہ میں اور کچھ لکھنے کے لائق ہی نہیں رہا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ بقول فرانسیسی فلسفی پاسکل ''دل کی اپنی عقل آرائی ہوتی ہے جسے عقل نہیں جانتی۔''

ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نہ کوئی افسانہ نگار ہوں اور نہ ناول نگار، تخلیق کار کے منصب پر خود کو براجمان دیکھنا محض میرا واہمہ ادراک ہے اور کچھ نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ایسی زبان میں لکھنے کی کوشش کرنا جو سیاسی اور سماجی اعتبار بلکہ ادبی اعتبار سے بھی اپنا روشن مستقبل اندھیرے کے سپرد کر چکی ہے، میرے اندر ایک احساسِ کمتری کا سبب بن گیا ہو، جس کی بنا پر میں خود کو ناول نگار کہہ رہا ہوں۔

تو یہ سب میرا بچکانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ میں جو بھی لکھتا ہوں، اُسے شائع کرانے میں ہی یہ بچکانہ پن چھپا ہوا ہے۔ میں بھی بس اپنی کتاب کو شیلف میں لگی ہوئی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی دھول سے اَٹی ہوئی کتاب۔ ایک ٹھوس کتاب، جس کا کاغذ اور جس کی جلد میں بار بار چھو سکوں۔ اسی لیے اپنی

تحریر کو طباعت کے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب دیکھیے، مثال تو کچھ بھونڈی ہے مگر سب سے زیادہ مناسب بھی یہی ہے کہ اولاد تو صرف ماں باپ کی ہی ہوتی ہے۔ اب وہ اولاد پیدا ہونے کی خوشی میں کچھ جشن منالیں یا مٹھائی وغیرہ بانٹ لیں۔ اولاد تو اُن کی ہی رہتی ہے۔ یہی معاملہ ––– کتاب کا ہے، کتاب تو لکھنے والے ہی کی رہتی ہے، وہی اُس کا پہلا اور آخری وفادار قاری ہوتا ہے۔

تو یہ تو رہا اپنی تحریر شائع کرانے کا جواز، میں اپنی کتاب کو دوسروں کی کتابوں کے ساتھ لائبریری میں رکھا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ اپنے بچّے کو دوسروں کے بچّوں کے ساتھ کھیلتا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

اور یہ حقیقت ہے ورنہ جب سے میں نے اپنا کنڈل (Kindle) خریدا ہے تو اُس میں دو ہزار کتابیں ڈاؤن لوڈ ہو چکی ہیں۔ ان میں قدیم کلاسیکی یونانی المیوں سے لے کر جوائس کا یولیسس تک شامل ہے مگر نہ تو کاغذ نظر آتے ہیں نہ اِن کتابوں سے کوئی خوشبو نکلتی ہے۔ نہ اِن میں دیمک سرسراتی ہے، نہ ان کی جلد نظر آتی ہے نہ جیکٹ۔ نہ ان کو چھوا جا سکتا ہے۔

یہ ای (E) کتابیں، کتابیں نہ ہو کر کتابوں کے بھوت ہیں۔ گوشت پوست اور جسم سے خالی۔ زندگی سے محروم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موت سے بھی محروم یا ماورا؟ اس لیے میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کبھی میری کتاب کا Kindle ایڈیشن تیار ہو اور جو میرے لیے نادیدہ ہو یا کسی بھی انسانی آنکھ کو کتابوں کی الماری میں رکھا نہ دکھائی دے۔ چاہے وہ اب ڈِجیٹل شکل میں ابدیت سے ہمکنار ہو چکا ہو۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ابدیت سے بھیانک کچھ نہیں۔ ابدیت نے وقت کی پیٹھ پر چھرا مارا ہے۔

یہ میرا خود اپنے بارے میں بیان ہے کہ میں خود کو کوئی ناول نگار وغیرہ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ میری منافقت تو دیکھیے کہ میں اپنی ناکام تحریر کو کبھی 'ناول' کا نام دیتا ہوں تو کبھی کہانی کا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی ہر تحریر کو 'موت کی کتاب' کا نام دوں۔ ایک نئی صنف، ایک نئی Genre، کیا خیال ہے؟ مگر ٹھہریئے! میرے پاس اس منافقت کا بھی جواز ہے۔ (ہر منافقت کا جواز ضرور ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے)

میں ہی نہیں، دُنیا کا ہر شخص ایک فکشن نگار ہو سکتا ہے، اگر اُسے لکھنا آتا ہو۔ ہر شخص کے ذہن میں ہمہ وقت ایک ناول، ایک افسانہ یا ایک کہانی چلتی ہی رہتی ہے۔ ہر شخص کے ذہن کی قواعد کی تعمیر فکشن

کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ فکشن بے ہیئت صداقت اور اشیا کو شکل عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ لفظ Fiction، لیٹن لفظ Fingo سے بنا ہے اور اس کے معنی تشکیل کرنا اور تزئین کرنا ہے۔ میں یہاں شکوہ محسن مرزا کے مضمون 'شعور اور فکشن' کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے نکلنے والے جریدے ''تنقید'' کے پہلے شمارے میں شائع ہوا تھا:

> ''فکشن میں واقعات باہم آمیز ہو کر معنی کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ معنی سبب اور نتیجہ کے اس منطق سے تعبیر پاتے ہیں جنھیں شعور مختلف واقعات کی ایک ترتیب میں دریافت کرتا ہے، یہ معنی واقعات اور اُن کے درمیان سبب اور نتیجہ کے تعلق اور شعور کے درمیان باہم ارتباط کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعور فکشن میں اپنا اظہار کرتا ہے۔''

شکوہ محسن مرزا نے بڑے پتے کی بات کی ہے اور انسانی شعور کے تخلیقی کردار کو اُجاگر کیا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''بنیادی بات یہ ہے کہ شعور آزمانے اور سچائی کو جانچنے کا ایک طریقۂ کار تشکیل دیتا ہے اور وہ، یہ جن وسائل سے کرتا ہے اُسے فکشن کہتے ہیں۔ یعنی فکشن خود ایک مخصوص نوع کی منطق ہے جو شعور کو خارجی صداقتوں کے انجذاب سے عہدہ برآ ہونے میں مدد کرتی ہے۔ اس لیے شعور کا عمل فکشن تشکیل کرنے کے طریقے میں منعکس ہوتا ہے اور جو بالآخر زبان میں اپنا اظہار پاتا ہے۔ یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ اس عمل میں شعور خود اپنی ترسیل اور اپنی مزید توسیع کرتا ہے۔''

اگر ہم شکوہ محسن مرزا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں (کم از کم میں تو تسلیم کرتا ہوں) تو پھر ہمیں یہ بھی قبول کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے کہ فکشن ذہن انسانی کی ایک بے حد عمومی اور فطری خصوصیت ہے۔ اس لیے ہر شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُس کے پاس، ایک کہانی ہے۔ ایک ناول ہے یا ہزاروں کہانیاں ہیں۔ ہزاروں ناول ہیں۔ تو بس یہی ایک جواز ہے میرے پاس کہ میں اپنی ان اُلٹی

سیدھی تحریروں کو ناول یا کہانی وغیرہ کا نام دیتا رہتا ہوں۔ مگر فکشن کو بطور ایک 'ادبی صنف لکھنے میں، میں بہر حال ناکام ہی ثابت ہوا ہوں۔ میرا فکشن ایک **جیتے جاگتے انسان** کے شعور کے ذریعے لکھا گیا ہے "ادیب" نام کی کسی **پیشہ ور مگر عمومی ہستی** کے ذریعے نہیں۔

مگر پھر بھی، اپنے شعور کو فکشن میں ڈھالتے وقت، لکھتے وقت میں اپنے کچھ دوسرے مقاصد کی بھی تکمیل کر لیتا ہوں۔ یہ مقاصد وہی ہیں جو میں 'موت کی کتاب' کے دوسرے ایڈیشن میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ یہاں ایک بار پھر دہراتا ہوں۔

کیونکہ میرے شعور کی مٹی "دُکھ" سے گندھی ہوئی ہے (ایسا مجھے لگتا ہے) اس لیے میں جو بھی لکھتا ہوں اُسے فکشن ایسی دستکوں میں بدل دیتا ہے جو ضمیر کے ڈھول بھرے صدر دروازے پر دی جاتی ہیں۔ میرا انفرادی شعور (اجتماعی شعور کی طرف نہ میں کان دھرتا ہوں اور نہ میرا ناول یا افسانہ) مروجہ ادبی اخلاقیات اور جمالیات بلکہ شعری جمالیات کو تواتر سے صدمہ پہنچانا چاہتا ہے۔ جمالیاتی انبساط کو مدِ نظر رکھ کر، گذشتہ پچیس سال سے نہ میں نے کوئی سطر پڑھی اور نہ لکھی۔

میں ادب کو اپنے ضمیر کے اوپر دائر ایک مقدمے کی صورت میں دیکھتا اور پہچانتا ہوں۔ اور سوسن سونتاگ کے اس قول پر یقین رکھتا ہوں کہ ادب ہمیں یہ تربیت دیتا ہے کہ کس طرح ہم اُن کے لیے روسکیں جو "ہم" نہیں ہیں یا "ہم" میں سے نہیں ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میری تحریریں اس نوعیت کی ہیں یا نہیں۔

میں اپنی تحریروں کے بارے میں کوئی بات کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے ان کے بارے میں اب کچھ نہیں معلوم کیونکہ ان سطروں کے لکھنے سے بہت پہلے ہی وہ میرے شعور سے باہر جا چکی ہیں (لاشعور کا مجھے علم نہیں)

پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اب پھر کہہ رہا ہوں کہ زبانی بیانیہ کی بات الگ ہے، مگر لکھنا اچانک اکیلے ہو جانے کا دوسرا نام ہے۔ اور میں محض اپنے دماغ کے دائیں طرف کے منطقی حصے سے نہیں لکھتا۔ میرا شعور اکیلے ہونے کے اس تکلیف دہ عمل میں، میرے سارے جسم کو شامل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میرے ناخن جو مُردہ خلیوں کے سوا کچھ نہیں، وہ پتھر پر خراشیں ڈالنے کے لیے خود بخود لپکنے لگتے ہیں۔

میں سنسکرت کی ''ہُوَا'' دھاتُو کی طرح لکھنا چاہتا ہوں جو آگ کے جلنے کی آواز ہے۔ ایسی آگ جس میں تحریر اور اُسے لکھنے والا دونوں جل کر راکھ ہو جائیں اور دونوں میں کوئی تفریق باقی نہیں رہے۔ مگر اس کے لیے **وجودی سطح پر زندہ انسان** کا ہونا ضروری ہے۔ باکمال اور پیشہ ور ادیب یہ اذیت نہیں اُٹھا سکتا۔

معاف کیجیے گا، یہ سب باتیں تو ضمناً اور برسبیل تذکرہ نکل آئیں۔ اصل مدعا یہ ہے کہ فکشن جب اتنی عام سادہ اور فطری سی شے ہے اور انسانی شعور سے اُس کا وہی رشتہ ہے جو گوشت اور کھال کا، تو پھر کسی بھی شخص کو ناول یا افسانہ لکھنے کے بعد اترانا نہیں چاہیے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ ہاں مگر ادبی نقاد کو بہرحال اترانے یا لاف وگزاف کرنے کا حق ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تنقید لکھنا فطری کام نہیں۔ اس میں زیادہ تر انفرادی شعور کے مخالف چلنا پڑتا ہے۔ ''شعور'' کے مخالف چلنے میں، بڑی علمیت، عقلیت اور دانشوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نقاد کا بہت احترام کرتا ہوں، کسی بھی ادب کو زندہ رکھنے کے لیے صرف اور صرف نقاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شعور کے مخالف چلنے کے باوجود، تنقید اور اُس کی منطق شعور سے آزاد نہیں ہو پاتی ہے۔ تنقیدی مفروضات بھی کسی نہ کسی شکل میں فکشن سے ہی مشابہ ہیں۔ یہاں بھی کچھ اکائیاں شعور نے پہلے ہی سے تخلیق کر رکھی ہیں۔ ان اکائیوں کو بعد میں معنی دیے جاتے ہیں۔ پھر اس داخلی منطق کو ایک معروضی دنیا کی بنیاد مان لیا جاتا ہے۔

یوں دیکھیں تو تنقید بھی ایک فکشن ہے۔ زیادہ دبیز، مشکل، گھنا، پیچیدہ مگر بصیرت آموز فکشن۔

ایک نقاد کو زیادہ محنت اور مشکل سے گزرنا پڑتا ہے اور علمی ڈسپلن کا پابند رہنا ہوتا ہے۔ تنقید لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ میں ان تخلیق کاروں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہتا جو تنقید اور تنقید نگاروں کو برا بھلا کہتے نہیں تھکتے۔ میرا مزاج اور ذہنی ساخت الگ ہے۔ میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے خیال سے متفق نہیں ہو سکتا۔ اُس نے ناول نگار کو فلسفی، سائنسداں، شاعر اور اولیا تک سے بالاتر سمجھا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ، لارنس **''کس قسم کے ناول نگار''** کی بات کر رہا ہے، اُس کو اپنی بات کہنے کے لیے تنقید نگار کا چولا پہننا پڑا۔ یہ حقیقت ہے کہ لارنس کی تنقیدی نگارشات اعلیٰ پائے کی ہیں۔ کاش

ہمارے ناول نگار بھی نقادوں کا منہ دیکھنے کے بجائے خود تنقید لکھنے کی کوشش کرتے۔ میں ایک ادبی ناقد، ایک فلسفی اور ایک سائنس دان کو ایک ناول نگار سے برتر اور اہم سمجھتا ہوں۔ مگر یہ میرے قطعی ذاتی نوعیت کے خیالات ہیں۔

آخر میں، ایک اعتراف اور کرنا ہے اور وہ یہ کہ اس بار پیش لفظ یا عرض مصنف جیسی کوئی شے لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا مگر بعض احباب کے اصرار پر مجھے زبردستی یہ ورق کالے کرنے پڑے۔ ناول کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سوائے اس کے کہ شعور کبھی جان بوجھ کر تجربہ نہیں کرتا۔ وہ تجربہ تو اُس کا مقدر ہوتا ہے۔ ہنری جیمس نے کہا تھا:
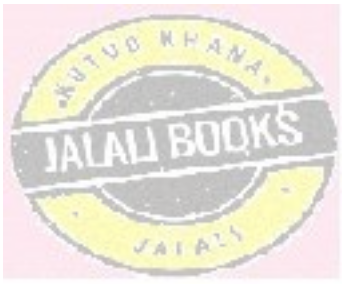
> ''تجربہ کبھی محدود نہیں ہوتا اور کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ یہ ایک وسیع حسیت ہے، ایک نوع کا وسیع مکڑی کا جالا، جس کے ریشمی تار شعور کے خلوت خانے میں جھولتے رہتے ہیں اور اپنے جال میں فضا کے ہر ذرے کو پکڑتے رہتے ہیں۔''

مگر اتنا ضرور ہے کہ اگر آج سے بارہ سال قبل میں نے ایک کہانی آخری دعوت نہ لکھی ہوتی تو شاید یہ ناول (ناول؟؟) بھی نہ لکھا جاتا۔

— خالد جاوید

پس نوشت: اس کتاب کے ابواب میں جو اشکال یا علامتیں نظر آرہی ہیں وہ سب قدیم تہذیبوں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھتی ہیں اور 'ریمنڈ بک لینڈ' کی کتاب 'Magical and Spiritual Symbolism' سے مستعار لی گئی ہیں۔ ان اشکال اور کتاب کی ابتدا میں درج تمام مقولوں نیز اشعار اور نظم کے ٹکڑوں کا متن سے کوئی گہرا تعلق تو نہیں ہے مگر اسے شوقِ فضول بھی نہ سمجھا جائے۔

پہلا حصّہ

ہوا
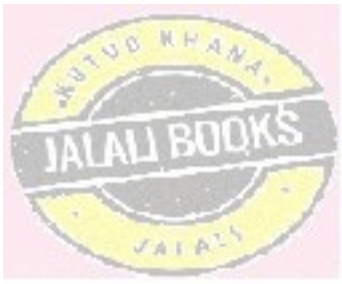
ہر آنے والا ضروری نہیں کہ آیا ہی ہو
کہ خود نہ آیا ہو وہ صرف اُس کا سایہ ہی ہو

فرحت احساس
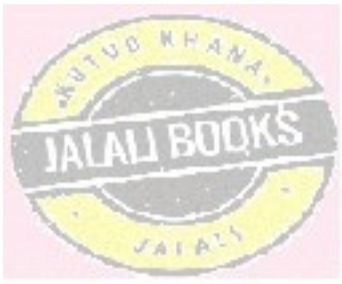
میں پُراسرار ہوں

مگر صرف جسم کے تعلق سے

میری روح عام اور معمولی ہے

اور سوچتی نہیں ہے

—فرنانڈو پیسوا

木

ہوا ہی وہ چشم دید گواہ تھی جس نے دیکھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں ایک اکیلے مگر اُداس کالے چور کی طرح داخل ہوا۔ گھر پتہ نہیں بن رہا تھا یا گر رہا تھا یا کہ کھنڈر بن رہا تھا۔ یہ بھی کوئی نہیں جانتا، صرف ہوا جانتی تھی۔

اُس کی اُداسی اُس کے پیروں سے گر گر کر زمین پر اکٹھا ہوتی جاتی تھی۔ یہ اُداسی بھی کیسی تھی؟ یہ کسی بند کنویں میں جھانکنے کے بعد آسمان کی طرف اُٹھنے والی ایک افسردہ نظر کی طرح تھی اور آسمان لامتناہی طور پر بے رحم تھا۔ یہ لامتناہیت صرف خوف پیدا کرسکتی تھی۔ سارے معنی، سارے مفہوم اسی لامتناہیت میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔

اس وسیع تر، بھیانک منظر میں محبت سے پکائی گئی دو روٹیاں ہی تھیں جو پرچم بن کر لہرا رہی تھیں۔ مگر یہ روٹیاں اب کسی معدے کے لیے نہ تھیں، یہ خون بن کر جسم میں دوڑنے کے لیے نہ تھیں۔ یہ فضلہ بن کر جسم سے نکل کر تاریک موریوں میں بہہ جانے کے لیے بھی نہ تھیں، یہ تو دو گواہیاں تھیں۔ روح کی گواہیاں، ریاضی کے دو شفاف ایماندار ہندسوں کی مانند۔۔ لُٹی پٹی، اُجاڑ شکل دنیا کے ماتھے پر، لافانی اور پاکیزہ بندیا کی طرح چمکتی ہوئی، چولہے کی راکھ تک ٹھنڈی ہوئی مگر یہ لافانی ہیں اور گرم ہیں۔

اِس لیے ہوا نے دیکھا کہ وہ صرف اُداس ہے۔ وہ رو نہیں رہا، وہ شاید روئے گا بھی نہیں۔ وہ اپنے نمک کو سنبھال کر رکھے گا، نمک میں لاشیں دیر سے سڑتی ہیں۔ اُسے ابھی کتنا کچھ بچا کر رکھنا ہے۔

ہوا نے بہت سائے دیکھے تھے، ایک زمانے سے وہ صرف سائے ہی دیکھتی آئی تھی۔ کتنے سائے

گہری، چوڑی اور ایک تاریک ندی میں چلتے چلے گئے ہیں۔ اُن کے پاؤں ریت سے اُتر کر گہرے پانیوں میں چلے گئے اور تب وہ اور بھی دبیز گہرے ساؤں میں بدل گئے۔ ہر سفر سے واپسی پر پانی ہی کی طرف جانا ہوتا ہے۔ خلا نام کی کوئی شے نہیں، سب کچھ پانی ہے جو نظر نہیں آتا، مگر وہ ہر اُس جگہ موجود ہوتا ہے جہاں محبت ہوتی ہے، یا پھر نفرت۔

وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ دو نفس اور بھی تھے، ایک کن کٹا اور لنگڑاتا ہوا خرگوش کا سایہ جو اُس کے پیچھے پیچھے تھا اور ایک کاکروچ تھا جو اُس کی قمیص کے کالر پر تتلی کی طرح بیٹھا تھا۔

ہوا، اس گھر کی یا اس مقام کی پرانی ہوا، یہاں کی ازلی مکین، ایک گرے ہوئے بھاری اور سوکھے درخت کے نیچے دبی کچلی پڑی تھی اور اب تقریباً پتھر بن چکی تھی۔

درخت اپنے پتوں، اپنی شاخوں کو نہ جانے کب کا کھو چکا تھا۔ صرف کچھ سوکھی جڑیں رہ گئی تھیں۔ زمین کے اندر ایک بے معنی اور مضحکہ خیز حد تک قابلِ رحم انداز میں پیوست، اور ہاں درخت کا تنا بھی تھا جو ایسی لکڑی بننے کے بہت قریب آ چکا تھا جس سے گھر کے دروازوں کے جوڑ اور چوکھٹیں بنائی جا سکتی تھیں۔

ایسی ہوا چلتی نہیں ہے۔ یہ نہ کسی کے جسم کو لگتی ہے نہ الگنی پر لٹکے کپڑے سکھاتی ہے۔ یہ بس پتھر بن کر اُس ملبے کے نیچے سے جھانکتی ہے۔ یہ اُس درخت کا ملبہ ہے جس سے نکل نکل کر وہ باہر آتی تھی۔ جھونکوں کی صورت چلتی تھی یا میلوں لمبی مسافت طے کر کے، جس کے پتوں اور ٹہنیوں تک وہ آتی تھی۔ وہ درخت!

وہ آم کا درخت جو گزرے زمانوں کے آنگن میں اگا تھا، ہوا کو معلوم تھا کہ درخت کی کب کی موت ہو چکی۔ پھر بھی وہ اُسے چھوڑ کر نہیں گئی۔ جس طرح ایک بدنصیب بندریا اپنے مُردہ بچّے کی لاش کو لادے لادے، اپنے قابلِ رحم پیٹ سے چپکائے چپکائے پھرتی ہے، بالکل اُسی طرح ہوا اپنے درخت کی لاش کو ڈھو رہی تھی اور اُس کے ملبے کے نیچے پتھر بن گئی تھی۔

پتھر سے بڑا چشم دید گواہ کون ہے؟

وہ لڑھکتا، ٹھوکر کھاتا، بچتا بچاتا چل رہا تھا۔ ہوا نے محسوس کیا، زمین کے سینے پر پڑے پڑے، کہ

اب زمین اپنا رونا نہیں روک پائی۔ زمین اس کے کرچ کے جوتوں پر رو رہی تھی جو گیلی مٹی پر دھنس رہے تھے، دھنس رہے تھے۔ ہوا کو یہ بھید بھی جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہاں ایک سناٹا بھی اپنی کہانی لکھ رہا تھا۔ ہوا کے لمبے لمبے کانوں میں سناٹا اپنی کہانی اُنڈیل رہا تھا۔

اور وہ — ؟ اس نے سناٹے کو اپنے ٹھنڈے، گیلے جوتوں میں بھر لیا — اُسے شاید معلوم تھا کہ کیا رُونما ہونے والا ہے۔ ایک پتلی ندی کا شکار کرنے کے لیے، کہیں سے گھوم کر ایک بھیانک دریا چلا آ رہا تھا۔ اور ندی، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اس دریا میں ملنے کو اپنا مقدر مانتی ہوئی آہستہ آہستہ خود ہی اُس کی طرف رینگ رہی تھی۔ یہ ایک جال تھا جس میں وہ خود ہی پھنستی جاتی تھی۔

ہوا نے دیکھا کہ وہ سائے کی طرح، ایک کونے میں کھڑا ہے۔

اُسی لمحے وہ سو سال پرانا سانپ جس کی پھنکار سے گھر کی مرغیاں دہشت زدہ ہو کر مر جاتی تھیں، لہراتا ہوا، تقریباً اُسے چھوتا ہوا گزر گیا۔ یہ سانپ بھی اس گھر کا پرانا مکین تھا، مگر اُس نے نہ اُسے دیکھا نہ محسوس کیا۔ اُس نے اُن بے شمار بندروں کے سائے بھی نہیں دیکھے جن سے یہ گھر بھرا ہوا تھا۔

ہوا نے دیکھا کہ ایک جھولتے ہوئے وزنی مگر دیمک زدہ شہتیر کے نیچے سے نکلتے وقت شہد کی مکھیوں کا ایک، خالی چھتہ اُس کے سر سے ٹکرایا تھا مگر اُسے پتہ نہ چلا۔ چھتہ جس میں کوئی مکھی نہ تھی۔ وہ ویران پڑا تھا، اس لیے اب وہ کتھئی سنہرے رنگ کا نہ ہو کر خالی اور سوکھے اجسام کی ایک سفید صورت تھا۔ اس کی مکھیاں بھٹکتی ہوئی کسی دوسرے سیارے پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ اب چھتہ نہ ہو کر چھتے کا کفن نظر آتا تھا۔ اتنا ہلکا، اتنا کمزور اور بے وقعت کہ بے حبس میں بھی، وہ آہستہ آہستہ ہلتا اور کانپتا تھا۔

مایوس کن حد تک خطرے سے خالی یہ چھتہ جب اُس کے سائے سے ٹکرایا تو گر جانے سے بال بال ہی بچا۔

ہوا نے دیکھا کہ اُس نے ٹھوکر کھانے سے بچتے ہوئے، درخت کے مردہ، سوکھے تنے کو پھلانگا ہے اور ٹھیک اُسی جگہ سے جہاں وہ تنہا اور سنسان کھوکا ہے جس میں لوسی اور جیک بارش سے پناہ لینے کے لیے آ کر بیٹھ جاتے تھے۔

کھوکا اُس تنے کے ''اکیلے پن'' پر گدا ہوا ایک دوسرا گیلا پن ہے۔ خالی گھونسلہ جو ایک بار چھوڑ

دیے جانے کے بعد پھر کبھی آباد نہیں ہوتا، وہ لوہے کا گھونسلہ بن جاتا ہے، اور درخت کا تنا اپنے پھولوں، پھلوں، پتّیوں اور شاخوں سب سے الگ، اکیلا اور اُس کے نیچے ایک کچلی ہوئی مگر زندہ ہوا، ہوا کو موت نہیں آتی کیونکہ وہ ہمیشہ سے اکیلی ہے۔ وہ جم کر پتھر بن سکتی ہے یا برف۔

ہوا چشم دید گواہ ہے کہ وہ اس طرح بھٹک رہا تھا جس طرح اگھوری سادھو شمشان میں بھٹکتے رہتے ہیں تاکہ کسی لاش میں اپنی روح داخل کر کے اُسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکیں۔

مفاد ـــ؟

نظر نہ آنے والے ہمارے آباؤ اجداد
ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
اُن چھوڑی گئی سڑکوں پر
کاروں کا شور، بچّوں کی کلکاری
جوان لڑکیوں کے جسم اُن کے آر پار جاتے ہیں
دھندلے، غیر مادّی، ہم اُن کے آر پار سفر کرتے ہیں

—اوکتاویو پاز

مفاد! مفاد کیا تھا؟

ہوا کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کیا کیا دیکھیں؟

اِن آنکھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں بھٹک رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں مٹی کی ہانڈی لیے اور دوسرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پیلا، بوسیدہ نسخہ لیے۔

وہ بھٹک رہا ہے مگر کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کوے تک کو نہیں جس کی حادثاتی موت پر نہ جانے کہاں سے، دور دور سے، بہت سارے کوے چلے آئے تھے اور حیرت انگیز طور پر بغیر کوئی شور مچائے باورچی خانے کی منڈیر پر سر جھکائے بیٹھ گئے تھے۔ ایک گری ہوئی کڑی پر وہی مرا ہوا کوا خاموش بیٹھا تھا مگر اُس نے نہیں دیکھا۔ قابلِ افسوس حد تک نہیں دیکھا۔

ہوا نے دیکھا کہ وہ کن کٹا خرگوش اُس کا ساتھ چھوڑ کر دراصل اپنی ہی قبر پر اُگی ہوئی گھاس کھا رہا تھا اور کاکروچ، اُس کی قمیص سے اُڑ کر، بدنیتی کے ساتھ رینگتا ہوا اُدھر، اس طرف جا رہا تھا جہاں باورچی خانے کی اینٹوں اور دیواروں کا ملبہ تھا۔

ہوا جانتی تھی کہ سارے گناہوں کو، سارے چٹورپن اور ساری بدنیتی کو اُدھر ہی جانا ہوتا ہے چاہے وہ سب بچپن کے کھیل ہی کیوں نہ ہوں۔ سب کا مقدر بہرحال ایک ہی ہے۔ شطرنج کی بساط پلٹنے کے بعد بھی، بندر کے مُردہ پنجے کے مانند گزر گئے وقت کو دوبارہ کھینچ کر لانے کے نتیجے میں صرف وحشت اور پشیمانی ہی حاصل ہو سکتے تھے اور کچھ نہیں۔ اصل بات بدنیت اور پیٹ کا کتّا بننا اور پھر مٹ

جاتا تھا۔ ایک مکمل انہدام کی جانب انسان کا ذہنی اور جسمانی سفر جاری ہے یہاں تک کہ حافظے کا انہدام ہی سب کی معراج ہے۔

ہوا اس دنیا کو بھی جانتی تھی کہ وہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا۔ خون کی زنجیر محض ایک حافظہ ہے۔ ساری عبادتیں، سارے مذاہب، سارے اخلاقی فعل دراصل حافظے سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں ہیں۔ وہاں سب اپنی تنہائی میں مسرور ہوں گے۔ ایک بھیانک بے شرمی کے ساتھ۔ ایسی بے شرمی سے تو بھوت بھی پاک ہے۔ بھوت اس لیے ہے کہ وہ اس دنیا سے بہرحال کوئی نہ کوئی رشتہ تو قائم رکھتا ہی ہے۔ یہ اور بات کہ اس رشتے میں بدنیتی، حسد اور شیطنت بھری ہو، مگر وہ اپنے حافظے سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس کی سزا اُسے نکیلے ناخنوں اور آنکھوں کے غاروں کے ذریعے دے دی جاتی ہے۔

تو اس دنیا کے تمام رشتے، تمام جذبے، محبتیں، نفرتیں، شہوتیں سب کو حافظے سے نکالنا ہوگا۔ انسان ایسی جنت میں جا کر کیا کرے گا، جہاں اُسے یہ بھی یاد نہ ہوگا کہ اُس کا باپ کون تھا؟

اس نفسانفسی کے عالم کو برداشت کرنا ہوگا۔ صبر کے ساتھ برداشت کرنا۔

ہوا کو اُس کا چہرہ پل بھر کو صاف نظر آ گیا۔ وہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر کر کے آنے والے کا تھکا ہوا چہرہ تھا۔ بہت طویل سفر، اتنا ہی طویل جتنا کہ گرم اور سرد ہوائیں طے کرتی ہیں۔ وہ ایک چلتی ہوئی ہوا کی طرح اپنے گھر آیا تھا۔

گھر؟

اگرچہ گھر شاید کہیں نہ تھا، بس ایک کالا پانی تھا اور ایک بہتا ہوا مہیب کنارہ تھا جو ملبہ نظر آتا تھا۔ جس پر وہ ٹھوکریں کھاتا ادھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔ ایک اندھے اور حواس باختہ شخص کی طرح ایک بار تو وہ اس طرح گرتے گرتے بچا جیسے کوئی سوکھا پتہ اپنی ہی پرچھائیں پر گرتا ہے۔ یہ خواب کی مانند تھا، مگر خواب دیکھتے وقت کوئی اپنی ایک آنکھ تک نہیں دیکھ سکتا۔ کاش کہ وہ دیکھ سکتا۔ ہوا کی مانند دیکھ سکتا اپنی اُس ایک آنکھ کی بدنصیبی، اُس کی خشکی اور اس کی نمی۔ افسوس کہ یہ کہاں ممکن تھا کہ جو آنکھ خواب دیکھے،

اُس آنکھ کو خواب دیکھنے والا بھی دیکھے۔ کہرے کی مارے، اپنے آخری اسٹیشن پر بہت دیر سے پہنچنے والے، شکست خوردہ، ایک شرمندہ اور تھکے ہوئے ریلوے انجن کا سا چہرہ دیکھے جو بس اُداس ہو کر سیٹیوں کی مُطلق خاموشی میں دھواں پھینکے جاتا ہے۔

ہوا کو وہ اپنی ہی طرح نظر آیا۔

یہ ہوگا بعد میں، ہماری موت کے بعد
کہ وہ مُردہ ہو جائے گا
اور گھنٹیاں بجیں گی مرنے والوں کی
اُس کے لیے

— ملارمے
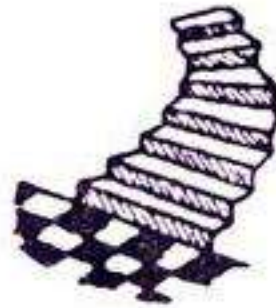
ہوا کو وہ اپنی ہی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ پُرانے مُردوں کے پاس آیا تھا اور ہر جذبے، احساس اور کیفیت سے خالی محض ایک چکراتا ہوا بگولا تھا یا ایک ایسی ممی بن چکا تھا جس کے دماغ کو اُس کی ناک کے ذریعے مہارت کے ساتھ باہر نکال کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ جسم سڑ گل نہ سکے۔ دماغ کوڑے دانوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جسم ہواؤں میں۔

دماغ اور جسم کی اس دائمی جدائی کے سبب دونوں کے درمیان صرف سائے پیدا ہوتے ہیں، جذبوں اور احساس سے خالی، محض تاریک سائے۔

یقیناً وہ جذبات ہی تو تھے جن کے دریا جیسے پاٹ پر وہ گناہوں اور جرائم کے گھڑے رکھ کر کھینچا کرتا تھا اور وہ دماغ ہی تو تھا جو ان گھڑوں کو بنانے اور پھر چھپانے کی ترکیبیں بجھایا کرتا تھا۔

تب یہ گھڑا آسانی سے کھنچتا چلا جاتا تھا کیونکہ اس میں اُس گھڑے کی مٹّی کے خالق اور اس کے دریا کا زور اور بہاؤ بھی شامل تھا۔ ایک زائد طاقت، ایک بیرونی امداد۔

مگر اب وہ ایک اکیلا آدمی تھا۔ دنیا کے پہلے آدمی کی طرح اکیلا اور غریب۔ خدا کے رحم و کرم پر بنی کیونکہ جہاں دریا بہتا تھا وہاں ریت کی ایک لمبی اور گہری کھائی ہے۔ اب اس پاپ کے گھڑے کو اکیلا، ریت پر وہی کھینچتا ہے۔ زوالِ آدم کے اِس تماشے کو ہوا دیکھ رہی ہے اور یہ بھی کہ اُس کے پاؤں کے نشانوں سے ریت پر سانپ کی سی لکیر بنتی جاتی ہے۔

یہ ہے میرا سانپ! مگر تمھارا سانپ کہاں ہے؟

اپنا سانپ بھی تو دِکھاؤ، اے فرشتو اور شریف نیک دل انسانو!

اُسے چیخ کر غصّے اور احتجاج کے ساتھ کہنا چاہیے تھا مگر نہیں کہا۔ اُس کے ہونٹ سڑے ہوئے شہد سے سنے ہوئے تھے اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بھنچ گئے تھے تاکہ اب تالو اور حلق میں خاموشی بھی سڑنے لگے۔

اُس کا کاکروچ باورچی خانے کی اینٹوں تک پہنچ گیا۔

ہوا نے دیکھ لیا کہ ٹھیک یہی وقت تھا جب اُس کا بایاں پیر مٹی کے گارے میں پھنس گیا اور اندر۔۔۔ گہرائی میں دھنستا ہی چلا گیا۔ اُس نے لوہے کے ایک پائپ کو کس کر پکڑ لیا، ورنہ منھ کے بل اپنے ہی سائے کے اوپر گر پڑتا، اگرچہ سایہ نظر نہ آتا تھا، وہ خود ہی ایک سایہ تھا۔

زنگ لگا ہوا لوہے کا یہ موٹا پائپ دراصل گزرے زمانوں کے پانیوں کا نل تھا۔

اس کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ ہوا چاہے کتنی بھی دبی کچلی ہو، وہ پھپھوندی لگی ایک چٹان یا پھر خدا کی مہربانی سے پتھر کی مورت ہی کیوں نہ بن جائے، وہ بارش کی آہٹ کو ہمیشہ، دور بہت دور سے ہی پہچان لیتی ہے۔ بارش سے ہوا کا ایک ابدی اور پُراسرار رشتہ ہے۔ ایک بھید، کچھ کچھ انسانوں کے درمیان کے بھیدوں جیسا۔

ہوا نے پہچان لیا کہ بارش آرہی ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسری، اجنبی ہوا بھی تھی۔ ایک ایسی ہوا جس کا تعلق اس گھر سے نہیں تھا؛ بارش کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ مُردوں کو گھسیٹ کر لے آنے والی ہوا۔

چلنے سے معذور، درخت کی سوکھی لاش کے نیچے دبی ہوئی ہوا نے اس غیر، اجنبی اور زور زور سے چلتی ہوئی، آنے والی ہوا کو سونگھا اور اُس کی بے رحمی کو پہچان لیا۔ اُسے اِس پرائی ہوا سے کوئی حسد نہیں ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ ہر ہوا کو ایک دن پتھر بن کر سنّاٹے میں جذب ہو جانا ہے۔

اور یقیناً وہ آئی۔

بارش آگئی، کسی دوسری دنیا کی ہوا کے کاندھوں پر سوار۔

بے آواز بارش میں اُس کا سر بھیگ رہا تھا۔

بارش ہوتی رہی۔ اُس کا سر بھیگ بھیگ کر جوؤں سے بھر گیا۔ وہ ایسے ہی، ملبے پر کھڑا رہا، خاموش، مٹی میں دبے اپنے ایک پاؤں کے ساتھ۔ وہ اُس پرائی اور کالی ہوا کی چپیٹ میں آ گیا۔ اس کا سرخ سویٹر، نیلی قمیص اور کرمچ کے سفید جوتے کالے پڑ گئے۔ اُس کی آنکھوں تک میں کالی ہوا بھر گئی، مگر ہر فیصلہ موت تک ہی نہیں منحصر ہوتا۔ وہ بعد میں بھی سنایا جا سکتا ہے، وہ کالی ہوا میں جھومتا اور بارش میں بھیگتا ایک پاؤں پر اسی طرح کھڑا رہا۔

''گڈو میاں آ گئے، گڈو میاں آ گئے۔''

ہوا نے سناٹے کی سفید چادر کے تھان سے کٹنے کی آواز کو سن لیا۔ یہ وہی آواز تھی جو کپڑے کی چادر کو تیز دھار والی سفاک قینچی سے کاٹنے پر پیدا ہوتی تھی۔

وہ اس سفید سناٹے کی دو گز کی کترن کو اپنے جسم پر لپیٹنا چاہتا تھا۔ وہ موت کا بہی کھاتا تیار کرنا چاہتا تھا، تاکہ اُس میں اپنی موت کے اندراج کے ساتھ دوسروں کا حصّہ بھی لکھ سکے۔ روٹی اور حلوے کے حصّے کی طرح تاکہ جلد ہی لگنے والی عدالت میں ایک ملزم کی حیثیت سے وہ غیر حاضر نہ ہو، چاہے عدالت میں کوئی منصف ہو یا نہ ہو۔

''گڈو میاں آ گئے۔''

ہوا نے کچھ خوش اور کچھ مغموم ہو کر دیکھا کہ بارش میں بھیگتے ہوئے اُس کے سائے نے اس بار اس توتلی آواز کو پہچان لیا تھا۔

ہوا نے مُردوں کے قدموں کی دھمک کو خاموشی سے سنا۔ وہ سب آ رہے تھے، ان کی تعداد کو اُن کے قدموں کی دھمک سے نہیں گنا جا سکتا تھا۔

لوہے کے پرانے زنگ لگے نل کو بائیں ہاتھ سے پکڑے، وہ اسی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا اور اُس کا بایاں پیر گیلی لیس دار مٹی میں پنڈلی تک اس طرح دھنسا ہوا تھا، جیسے اُس پر پیلی مٹی کا سخت اور مضبوط لیپ چڑھایا گیا ہو اور ٹوٹی ہوئی ہڈی ہل جُل نہ سکتی ہو۔

مگر یہ سب ہوا نے ہی دیکھا۔ وہی اس المیے یا طربیے کی اکلوتی عینی شاہد تھی۔

اور اگر وہاں ایک بار، بارش کے ساتھ کوندا نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی ہوا یہ دیکھ لیتی کہ باورچی خانے کی گرتی ہوئی دیواروں پر بے شمار کا کروچ اکٹھا ہو گئے ہیں۔ عدالت لگ گئی ہے۔

باورچی خانہ — ایک خطرناک جگہ ہے۔
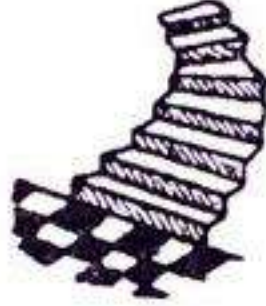
دوسرا حصّہ

شور

میری یادداشت ایک معجزہ ہے۔ مجھے سب یاد ہے بس شرط یہ ہے کہ جو بھی میں نے دیکھا ہو، شاید بصری یادداشت اسی کو کہتے ہیں۔ حالانکہ کچھ ایسا بھی ہے جو مجھے یاد نہیں آتا یا اُسے میں لفظوں کا جامہ نہیں پہنا سکتا، مثلاً مجھے ایک تاریک دُنیا کا بھی احساس ہے جسے آپ عدم کہہ سکتے ہیں، اگرچہ میرا خیال ہے کہ عدم محض ایک واہمہ ہے۔

تو مجھے اِس واہمے کا بھی احساس ہے، تاریک دنیا کی پرچھائیاں، وہاں کی اشیا جو چاقو کی نوک پر لرزتی ہوئی اُن شکلوں کی طرح ہیں جو کبھی نظر نہیں آتیں۔ شاید اِس لیے کہ چاقو سے صرف سفید کاغذ پر لکیریں ڈالی گئی ہوں؟

اور وہاں کے کھانے، اُن کا کھٹا میٹھا اور تیکھا ذائقہ۔ اور اُن کھانوں کی خوشبو، میرے پیٹ کی آنتوں کو اُلجھن میں مبتلا کرتے ہیں جس کی وجہ سے میرے دماغ کے بائیں حصے میں کچھ کشمکش کی سی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

میں کبھی کبھی تنگ آکر اس وبال سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر میرا حافظہ، وہ میرا وفادار کتا دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔

بچپن میں اکثر سڑکوں پر چلتے وقت مجھے لگتا تھا جیسے کوئی کتا میرے تعاقب میں ہے، اب جاکر میری سمجھ میں آیا کہ وہ میرا حافظہ تھا۔

خیر! اب تو بہت سی باتیں صاف ہو چکی ہیں مثلاً زندگی میں موت کی یاد اور موت میں زندگی کی یاد

اس طرح گھلی ملی ہوئی ہیں جیسے بھونے جاتے ہوئے مرغ میں مسالہ۔

ویسے بھی زندگی اور موت میں کوئی فرق تو ہوتا نہیں۔ موت کا چھینا ہوا زندگی میں حاصل ہو جاتا ہے اور موت کے اندھیرے میں کھوئی ہوئی تمام اشیا مل جاتی ہیں۔

اسی لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ زندہ انسانوں کا خون مُردوں پر چھڑکتے ہیں یا مُردوں کا خون زندہ انسانوں پر۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی برآمد ہوتا ہے، یعنی کچھ کھو کر پالینا یا کچھ پا کر کھو دینا۔

ریاضی کا ایک معمولی طالب علم بھی اس سے ایک مساوات بنا سکتا ہے۔ مگر اس مساوات کو حل کرنا یا ثابت کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے میں لگاتار دوچار ہوں اور شیطان کی آنت کی طرح یہ مساوات پھیلتی اور لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاید یہ ہے کہ اس سفر میں انسان اپنی روح کے جغرافیے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا۔ میں نے بچپن کی اپنی خاکی پتلون میں اپنی روح کے جغرافیے والا بوسیدہ کاغذ سنبھال کر رکھ لیا تھا، مگر عمر کے نہ جانے کس پڑاؤ پر اور پتہ نہیں کون سی بارش میں وہ گل سڑ گیا۔ میں نے اُسے گنوا دیا۔

اپنے اس بے رحم حافظے، زچ کر کے رکھ دینے کی حد تک اُس وفادار کتے سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے یہ ترکیب بھی سوچی کہ میں مڑ کر جلدی سے اس کتے کا پٹہ پکڑ کر اُسے ناول کے کنویں میں دھکہ دے دوں یعنی اپنی یادداشتوں کو میں ناول کے قالب میں ڈھال دوں اور اپنی جان چھڑاؤں۔

میں اور ناول؟ یہ خیال کر کے مجھے ہنسی آتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ایک ناول لکھوں۔ مگر میں ناول تو ناول ایک چھوٹی سی کہانی بھی نہیں گڑھ سکتا بلکہ میں ایک پیراگراف تک نہیں لکھ سکتا۔ اس کی ایک، بالکل سامنے کی وجہ تو یہ ہے کہ میرے اندر قابل رحم حد تک تخلیقیت کا فقدان ہے اور دوسری، شاید زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ بچپن سے ہی میری قواعد پوری طرح ٹھپ ہے۔ میں زمانوں میں فرق نہیں کر سکتا۔ ماضی بعید اور ماضی قریب میرے لیے ایک ہی ہیں بلکہ زمانہ حال اور زمانہ ماضی تو مجھے احساس کی سطح پر ایک دوسرے کے جڑواں نظر آتے ہیں۔ یہی حال مستقبل کا ہے، زمانۂ مستقبل مجھے گزرا ہوا زمانہ ہی نظر آتا ہے۔ بچپن میں امتحان میں قواعد کے پرچے میں بس رٹ رٹا کر کام چلا لیا کرتا تھا۔ اس لیے افسوس کہ میں تو صرف مقدموں کی اپیلیں اور عرض داشتیں وغیرہ ہی لکھ سکتا ہوں، اور وہاں بھی اکثر مجھ سے گڑبڑ ہو جاتی ہے، جسے میرا محرر ٹھیک کر دیا کرتا ہے۔ اس سلسلے

میں، میں اگر اتنا ناکارہ اور نااہل نہ ہوتا تو میں تو واقعی ناول لکھتا۔

میرا ناول ہی میرا گھر ہوتا۔

میرا گھر، میرا گھر۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ گھر کا سب سے خطرناک حصّہ کون سا ہوتا ہے؟

لہٰذا میرا المیہ یہ ہے کہ میں اپنے حافظے کے قدموں کی چاپ سے بھڑک بھڑک کر بھاگ رہا ہوں اور اُن لفظوں کے ساتھ جی رہا ہوں جو ابھی لکھے نہیں گئے۔ ان لفظوں کے شور میں اس طرح لاپروائی سے ہاتھ پیر پھینک کر چل رہا ہوں جیسے بہرا ہوں۔ میں تو بس اپنی گزری، بھولی بسری یادوں کے اندھیروں میں لڑکھڑا رہا ہوں۔

جائے سب کچھ جہنم میں جائے۔

میں لفظوں کی غلامی تو کرنے سے رہا، جس دنیا میں ہر انسان ایک خوفناک راز کی طرح دوسرے انسان کی زندگی پر چھایا ہوا ہو، اُس دنیا کے بارے میں، اور انسانوں کے بارے میں لکھنا ویسے بھی ایک کارِعبث ہی ہوتا۔

ہاں مگر، انسان کی ماہیت کے بارے میں ایک بات کا مجھے بخوبی علم ہے یا احساس ہے، بلکہ میں اسے احساس کی سطح پر ہی رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ احساس جیسے ہی علم بنتا ہے۔ لوگ علم کو اپنے دماغ پر اس طرح باندھ لیتے ہیں جیسے سُور کو باڑے میں۔

اور وہ احساس یہ ہے کہ انسان اپنی آنتوں کے اندر رہتا ہے۔ انسان کے اعضائے پوشیدہ تو محض انسانوں کے ہونے کے امکان، اُن کی پرچھائیوں کے ٹھکانے ہیں۔

ذہنی اور روحانی طور پر آدمی اپنی آنتوں کے اندر ہی چھپا رہتا ہے۔ اپنی بدنیتی، اپنے چٹورپن اور اپنی بھوک کو، دوسرے کے منھ پر مارتا ہوا، ایک دوسرے کی بھوک کے ذلیل لال رنگ سے دوسرے کا منھ سنا ہوا، یہ خون کی ہولی ہے۔

خون؟

خون، جس کی بُو میرے بچپن کی جیومٹری کی کتاب میں بنے ایک ایک دائرے، ایک ایک مثلث میں اور ہر اُس قضیے میں ایک خفیہ گناہ اور فاش غلطی کی مانند شامل ہے جسے میں کبھی حل نہ کر سکا۔

اور یہ بھی ایک خفیہ امر ہے کہ انسان کی آنتیں ہی اُس کا گھر ہیں۔
گھر؟؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ گھر کا سب سے خطرناک مقام کون سا ہے؟
یاد رکھیے، 'باورچی خانہ' ایک خطرناک اور مخدوش جگہ کا نام ہے۔

باورچی خانہ ایک خطرناک جگہ ہے۔

ہمارا گھر حویلی نما تھا، جس میں دو دالان تھے۔ ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ بیرونی دالان سے ملحق برآمدہ تھا جس میں ٹین پڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک وسیع وعریض کچا آنگن جس میں آم کا درخت لگا تھا۔ اندرونی دالان سے ملی ہوئی دونوں اطراف میں کوٹھریاں تھیں، ایک کوٹھری میں بکس ہی بکس رکھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کون کون سے زمانوں کے بکس اور ایک کوٹھری میں کتابیں، جو زیادہ تر پرانی اور خستہ حال تھیں۔

برآمدے کے ٹین کو لکڑی کے تھموں اور داسے کے ذریعے روکا گیا تھا، داسے میں جگہ جگہ لوہے کے ہُک نصب تھے جن میں لالٹین جلتی رہتی تھی۔ ٹین کے مشرقی حصے میں مرغیوں کا ڈربہ اور کبوتروں کی کابک تھی۔ مرغیوں کے ڈربے سے ملا ہوا زینہ تھا۔ چھت پر کوئی عمارت نہیں تھی۔ صرف منڈیریں تھیں جن پر دن میں کوے، فاختائیں اور جنگلی کبوتر منڈلاتے رہتے تھے اور رات میں آوارہ بلیاں اگرچہ ہمارے گھر میں بھی کئی پالتو بلیاں تھیں۔

آنگن میں دونوں طرف قطار سے چھوٹے چھوٹے پودے لگے ہوئے تھے اور ایک نارنگی کا درخت بھی تھا۔

چھتیں سب لکڑی کی کڑیوں کی تھیں اور خستہ حال ہو رہی تھیں، بارش کے دنوں میں جگہ جگہ سے ٹپکتی تھیں۔ کڑیوں میں چھپکلیوں اور چمگادڑوں نے بھی اپنے ٹھکانے بنا لیے تھے۔

آنگن کے مشرقی حصے میں ہتھے والا نل لگا تھا جس کے نیچے ایک چھوٹی سی حوضیہ تھی۔ یہاں کپڑے اور برتن دُھلتے رہتے تھے اور گرمیوں کے خشک موسم میں بھڑیں اکٹھا رہتی تھیں۔

اس نل کے سامنے بالکل ناک کی سیدھ میں وہ تھا۔

وہ—یعنی باورچی خانہ۔

باورچی خانے کی کڑیوں کی چھت، کم از کم جب سے میں نے دیکھا، دھوئیں سے کالی ہی دیکھی۔ ان کڑیوں میں لٹکتے ہوئے مکڑیوں کے جالے بھی دھوئیں سے کالے ہو گئے تھے اور اُن پر دھول اور غبار کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ جب کبھی بھی (ایسا کبھی سالوں بعد ہوتا تھا) انھیں بانس کے ڈنڈے سے صاف کیا جاتا تو وہ فرش پر کالے کپڑے کی پتلی اور باریک دھجیوں کی طرح نیچے گرتے باورچی خانے کی مکڑیاں اور چھپکلیاں بھی، وہاں زیادہ تر وقت گزارنے والی عورتوں کی طرح کالی پڑ گئی تھیں اور شاید اسی سبب سے اصل سے کچھ زیادہ زہریلی نظر آتی تھیں۔

ہر طرف کی دیوار کالی تھی اور ہر کونہ کالا تھا۔ مگر اس سیاہی سے وہاں ایک مانوسیت اور اپنے پن کا احساس قائم تھا۔ کبھی کبھار جب باورچی خانے میں چونے سے قلعی کروائی جاتی تو بھی یہ سیاہی، سفید چونے کے پیچھے سے جھانکتی ہی رہتی اور جلد ہی اس پردے سے نکل کر باہر آجاتی۔

باورچی خانے کا فرش کھرنجے کا تھا اور جگہ جگہ سے اُدھڑ رہا تھا، اس میں بڑی بڑی دراڑیں تھیں جن میں چیونٹیاں اور کنکھجورے رہتے تھے اور کبھی کبھی سانپ کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی رینگتے ہوئے انہیں دراڑوں میں گم ہو جاتے تھے۔

باورچی خانے کی چھت کے وسط میں ایک کڑی میں چالیس واٹ کا بلب، بجلی کے تار کی ایک ڈوری سے لٹکتا رہتا تھا۔ اُس زمانے میں ہمارے چھوٹے سے شہر میں بجلی آ گئی تھی۔ مگر بجلی زیادہ تر غائب رہتی تھی اس لیے باورچی خانے کے دروازے کی چوکھٹ کے اوپر بھی ایک لالٹین ہمیشہ لٹکی رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ یہ لالٹین زیادہ تر بھڑکتی رہتی تھی۔ اس میں کوئی عیب تھا۔ یہ مٹی کے تیل کو زیادہ مقدار میں برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ اکثر اس کی چمنی ایک چھناکے کے ساتھ پھٹ جایا کرتی تھی مگر پتہ نہیں کیوں، بار بار چمنی کو بدلتے رہنے کے باوجود، کبھی بھی اس لالٹین کو بدلا نہیں گیا، جس کے

پینڈے میں ہی کوئی خرابی تھی یا جس کا اپنی ہی بتّی سے کوئی جھگڑا تھا۔

بجلی کا تار لال رنگ کا تھا، مگر بعد میں، وہ بھی کالا پڑ گیا تھا اور اُس پر نہ جانے کیوں مکھیاں چپکی رہتی تھیں۔ باورچی خانے کی جنوبی دیوار پر روشندان تھا۔ جو پام کے ایک پیڑ کی طرف کھلتا تھا، کبھی کبھی جب پام کے پتے پرانے ہو جاتے تو روشندان سے باورچی خانے کے اندر جھانکنے لگتے بلکہ شاید اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے۔ پام کے یہ پتے بھی خوب تھے، ٹین سے ٹپکتی ہوئی بارش بھی پام کے اوپر سے گزرتی اور بوندیں یہاں الگ انداز سے گونجتیں۔ بے جان دھات، ٹین اور ایک جاندار شئے پتوں میں موسیقی کا ایک مقابلہ ہوتا، ایک اُداس جُگل بندی۔ پام کے یہ پتے جب بہت بڑے ہو جاتے تو انھیں آری سے کاٹ دیا جاتا اور گھر سے باہر پھینک دیا جاتا، جہاں محلّے کے بچّوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ جاتا۔ وہ اس دبیز، نم اور سبز غالیچے جیسے پتے پر بیٹھ جایا کرتے اور دوسرے بچّے ڈنڈی سے پکڑ کر اُس وسیع و عریض پتے کو سڑک پر گھسیٹتے پھرتے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں کبھی پتے پر نہ بیٹھ سکا۔ دراصل میری یادداشت میں پام کا پیڑ اور باورچی خانہ آپس میں اس طرح گڈمڈ ہیں کہ ایک کے بارے میں بات کرنا دوسرے کے بغیر اگر ناممکن نہیں تو ادھوری اور تشنہ ضرور ہے۔

دوسری طرف کی دیوار میں اینٹوں کی ایک جالی لگی تھی جو زینے کی طرف کھلتی تھی۔ زینے کی چوتھی سیڑھی پر بیٹھ کر باورچی خانے کا منظر ایک کالی تصویر کی مانند نظر آتا تھا جس کے وسط میں ایک سرخ دہکتا ہوا دھبہ تھا۔

یہ چولہا تھا، پنڈول سے پُتا ہوا، جس کے عقب میں اونلہ تھا۔ ایک کھانا پک جانے کے بعد اُس کی ہانڈی اونلے پر رکھ دی جاتی، تاکہ گرم رہے۔ لکڑیاں اگر سوکھی ہوتیں تو چولہے میں دھڑا دھڑ جلتیں اور اگر گیلی ہوتیں تو سارا باورچی خانہ دھوئیں سے بھر جاتا۔ چولہے کے سامنے بیٹھیں ہوئی عورتوں کی آنکھوں سے لگاتار پانی یا آنسو بہتے رہتے۔ جو باورچی خانے کی سیاہی میں گیلاپن بھی پیدا کر دیتے تھے۔ کھانا پک جانے کے بعد، چولہے میں بھوبل باقی بچتی۔ ایک سلیٹی رنگ کی راکھ جس کو کریدنے پر شعلے برآمد ہوتے تھے، اکثر رات کو دودھ کا برتن گرم کرنے کے لیے، اسے بھوبھل

پر ہی رکھ دیا جاتا تھا۔

ہمارے گھر میں گوبر کے اُپلوں کا رواج نہیں تھا۔ وہ نسبتاً غریب اور نچلے طبقوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ مگر مجھے جلتے اور سُلگتے ہوئے اُپلوں پر بنی چائے بہت پسند تھی۔ اُس چائے میں دودھ کی خوشبو بہت خالص اور ممتا سے بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے ایسی چائے کئی بار پی ہے۔

ہاں مگر ہمارے یہاں بُرادے کی انگیٹھی ضرور تھی، ہر پندرہ دن بعد ایک آدمی ٹھیلے پر بُرادے کی بوری رکھے ہوئے نمودار ہوتا اور بوری کو اپنی کمر پر لاد کر تقریباً دوہرا ہوتے ہوئے اُسے باورچی خانے کی اندھیری کوٹھری میں لے جا کر پٹک دیتا۔

اُس انگیٹھی میں برادے کو بہت ٹھونس ٹھونس کر بھرنا ہوتا جو ایک مشکل اور تکڑم والا کام تھا۔ ورنہ انگیٹھی اچھی طرح نہیں سلگ پاتی تھی۔

چولہے سے دو ہاتھ کے فاصلے پر دائیں طرف، دیوار پر اینٹوں کی ایک الماری تھی، جس میں روزمرہ کے برتن اور مسالے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اکثر یہاں پیاز سڑتی رہتی تھی، فرش پر ایک طرف آٹا گوندھنے کا پیتل کا تسلہ، کالے رنگ کا بڑا اور بھاری توا جو مجھے کالے سورج کی طرح دکھائی دیتا تھا اور جس پر بڑی بڑی گیہوں کی چپاتیاں پکتی تھیں۔ اُن دنوں چھوٹے پھلکوں کا رواج نہ تھا بلکہ اُنھیں بہت حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

توے کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر چمٹا اور پھکنی بھی پڑے رہتے۔ دونوں کالے رنگ کے تھے اور تشدّد آمیز محسوس ہوتے تھے۔ فرش پر ڈھیری سی، اونچی نیچی، لکڑی کی پٹلیاں تھیں جن پر بیٹھ کر عورتیں کام کرتیں اور جاڑوں کے دنوں میں سب لوگ اُنھیں پٹلیوں پر بیٹھ کر چولہے کے آگے کھانا کھاتے۔

شب برات کے دوسرے دن کی صبح تو دیکھنے کا منظر ہوتا۔ گھر کا ہر شخص، ناشتے کے وقت، باورچی خانے میں آ کر پٹلیوں پر بیٹھ جاتا اور رات کے باسی حلوے کو چولہے پر گرم کر کے، تام چینی کی رکابیوں میں باسی روٹی کے ساتھ کھاتا۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ باورچی خانے کے اندر ایک طرف، اندھیری کوٹھری تھی جس میں زیادہ

تر اناج، غلہ، گھی، تیل وغیرہ بھرے ہوتے تھے۔ اس میں بجلی کا بلب نہیں تھا اور دن میں بھی یہاں لالٹین یا مٹی کے تیل کی ڈبیہ لے کر جانا پڑتا تھا۔

باورچی خانے میں ہر طرف ایک بکھراؤ اور بدنظمی کا منظر تھا۔ جبکہ دیکھا جائے تو کھانا پکانے میں مددگار اشیا یا آلات وغیرہ بہت کم تھے۔ صرف توا، پھنکنی، چمٹا، پتھر کی سِل، ہاون دستہ اور چند چھوٹے بڑے چمچوں یا کفگیر وغیرہ سے ہی کام چلالیا جاتا تھا۔ گرم برتن کو اُٹھانے کے لیے کپڑے کا استعمال کیا جاتا تھا جسے صافی کہا جاتا۔ اگرچہ وہ چکنائی اور سیاہی سے اِس طرح سنا ہوتا کہ عورتوں کی انگلیاں اُس سے چپک جاتیں اور ویسے تو تجربہ کار یا منجھی ہوئی عورتیں بغیر صافی کے ہی گرم سے گرم برتن کو چولہے سے اُٹھالیتیں۔ ان کے ہاتھوں کی کھال سُن ہو چکی تھی۔

برتنوں میں زیادہ تر تو بدقلعی تھے۔ دیگچیاں، ہانڈیاں، پتیلے وغیرہ میں نے ہمیشہ بدقلعی ہی دیکھے۔ جہاں تک کھانا کھانے کے برتنوں کا سوال ہے تو باورچی خانے میں تو تام چینی کی رکابیاں ہی تھیں اور چائے پینے کے مگ بھی تام چینی ہی کے تھے۔ اچھے اور قاعدے کے برتن اندر، دالان میں ایک الماری میں رکھے تھے جو مہمانوں کی دعوت وغیرہ میں ہی باہر نکالے جاتے اور دھو کر فوراً دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیے جاتے۔

دعوتوں اور تیوہاروں وغیرہ کے موقعوں پر تو باورچی خانے کی یہ بدنظمی اور بھی بڑھ جاتی۔ خاص طور سے عید کے موقع پر جب چینی کے پیالوں میں سویّاں رکھی جاتیں اور کھرنجے کا فرش ان پیالوں سے ڈھک جاتا جس کو پھلانگ پھلانگ کر اور اپنے غراروں یا شلواروں کے پائینچوں کو اُٹھا اُٹھا کر عورتیں حواس باختہ سی، باورچی خانے میں اِدھر اُدھر بھاگا کرتیں اور اکثر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں۔

کیا کبھی اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے کہ باورچی خانے کی تقریباً تمام اشیا میں، چند خاص مواقع پر ایک خطرناک ہتھیار بن جانے کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ چاہے وہ ترکاری کاٹنے والی چھری ہو، توا ہو، چمٹا ہو، پھنکنی ہو، جلتی ہوئی لکڑی ہو، چولہے میں روشن، دھڑ ادھڑ جلتی ہوئی آگ ہو، مسالہ پیسنے والی سل ہو، پسی ہوئی مرچیں یا بھبکتی ہوئی بھوبل ہو یا پھر مٹی کا تیل ہی کیوں نہ ہو۔ گھر کے کسی اور حصے میں اتنی زیادہ تعداد میں ایسی اشیا نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ بیرونی دالان کی دیوار پر کیل

میں ننگی بندوق بھی ان اشیاء کے آگے حقیر اور کمزور نظر آتی تھی۔

گھر کے کسی بھی حصّے میں اتنے خطرناک بہروپیے نہیں پائے جاتے جتنے کہ رسوئی میں اور گھر کے کسی بھی اور مقام پر عورتیں اتنی برانگیختہ، برافروختہ، حسد سے بھری ہوئیں، تشدّد آمیز اور چھوٹی ذہنیت کی نہیں ہوتیں جتنی کہ باورچی خانے میں۔

باورچی خانہ چاہے گھر کے کسی حصّے میں ہو یا کسی بھی رُخ پر بنا ہو، چاہے واستوشاستر والوں سے کتنی ہی مدد کیوں نہ لے لی جائے، وہاں کے لڑائی جھگڑے نہیں جاتے۔ باورچی خانہ ایک میدانِ جنگ ہے اور پورے گھر، پورے خاندان بلکہ بنی نوع آدم کی قسمت کا فیصلہ اسی چھوٹے سے اور بظاہر پاک صاف مقام سے ہی ہوتا ہے۔ عدالت یہیں لگتی ہے، مقدمہ یہیں چلایا جاتا ہے۔ اور پورا گھر اپنی خاموش آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھتا ہے جب تک کہ آخر وہ کھنڈر نہ بن جائے۔ انسانی آنتوں کی بھوک اور دو وقت کی روٹی میں ایک پُراسرار اور بھیانک شہوت چھپی رہتی ہے۔ یہ شہوت صرف سیاہی اور خون کی طرف بڑھتی ہے۔ اور انجام کار بس ایک فحش اور مغالطہ آمیز بدنیتی بچ جاتی ہے۔ جس کے نشے کے زیرِ اثر کالی پیلی اور گوری عورتیں، گرم برتنوں کو اپنے سُن ہاتھوں سے اُٹھاتے رہنے کی عادی ہو کر باورچی خانے کے برتنوں سے وہی سلوک کرنے لگتی ہیں جو وہ اپنے مردوں سے کرتی ہیں۔ ان کے مرد آہستہ آہستہ چھوٹے بڑے برتنوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ باورچی خانے میں وہ سب بے حد حاوی اور خودغرض ہو جاتی ہیں۔ اُن کے جسم کی کھال سُن ہو جاتی ہے۔ عورتیں، باورچی خانے کے برتنوں کے ساتھ مباشرت کرتی ہیں۔

اپنی یادداشت پر اتنا غرور ہونے کے باوجود افسوس، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہمارے گھر میں ایک اور مسئلہ بھی تھا۔

اس گھر میں، باورچی خانہ کبھی کبھی کھسک کر چاروں طرف رینگنے لگتا تھا۔ ٹین میں دالان کے برابر لٹکا ہوا چھینکا جس میں زیادہ تر دودھ کا برتن ہوتا۔ (برابر میں سنبل کا پنجرہ جھولتا رہتا تھا) کبھی کبھی چھینکے میں سالن بھی ہوتا۔

دالان کے دوسرے سرے پر مدھم اور اُداس روشنی والی لالٹین۔ اس روشنی میں چھینکے کا سایہ ہوا میں آہستہ آہستہ ڈولتا تھا۔ اُس وقت آنگن میں پُراسرار طریقے سے غیر مرئی اشیا اکٹھا ہوتی جاتی تھیں۔ کہیں کسی چھینکے میں اُبلا ہوا گوشت لٹکا تھا، کہیں درختوں کی کیاری کے پاس رکھے ایک چھوٹے سے لکڑی کے اسٹول پر بچی ہوئی روٹیاں ڈلیا میں رکھی تھیں۔ باورچی خانے کے جھوٹے برتن نل کی حوضیہ میں پڑے تھے۔ گھر میں کتا کوئی نہ تھا اور بلّیوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ تو پاک صاف جانور تھے۔

آنگن میں کھانوں کی بے ہنگم ڈولتی اور کانپتی ہوئی پرچھائیاں جو چاندنی راتوں میں اپنی سیاہ لکیروں کی حدود سے، پُراسرار انداز میں ماورا ہوجانے کے درپے تھیں۔ اور ایک نعمت خانہ بھی تو تھا۔ باہر والے دالان میں، اندر کی طرف، مغربی دیوار سے لگا ہوا نعمت خانے میں ایک سیاہ جالی تھی۔ سیاہ تو وہ دُھول دھکّو سے ہوگئی تھی۔ جالی کے چھید، دھول خاک اور میل سے بند ہو چکے تھے۔ نعمت

خانے کا لکڑی کا ڈھانچہ جگہ جگہ سے گل رہا تھا۔ کبھی لکڑی پر سفید رنگ پوتا گیا تھا، مگراب یہ سفیدی بھی کلجماہٹ میں تبدیل ہوگئی تھی۔

نعمت خانے میں انڈے، ڈبل روٹی، بڑے بڑے گول بسکٹ، کچھ پھل مثلاً زیادہ تر تو امرود یا خربوزے وغیرہ رکھے رہتے تھے۔ سیب اور انار کبھی کبھی ہی آتے اور وہ بھی شاید بیمار لوگوں کے لیے پتہ نہیں اُس کو نعمت خانہ کیوں کہتے تھے۔ مجھے تو وہ نعمت خانہ صرف اسی روز محسوس ہوتا تھا جب اُس میں شاہی ٹکڑے یا فیرنی کے پیالے رکھے ہوتے تھے۔ یا پھر کوئی مٹھائی۔ مگر یہ اشیا نعمت خانے کو روز روز کہاں نصیب تھیں۔

تو بس کھانا، کھانا اور کھانا۔ پورا گھر گویا مٹی، گارے اور اینٹوں سے نہ بن کر پیاز، لہسن، ہلدی، دھنیہ، گرم مصالحوں اور گوشت اور ہڈیوں سے تعمیر ہوا تھا۔ سارا سفر باورچی خانے سے شروع ہوتا تھا اور باورچی خانے پر ہی ختم ہوتا تھا۔

ساری محبت، ساری نفرت، ہر قسم کی لگاوٹ اور ہر قسم کا تشدد باورچی خانے کے چولہے کی راکھ اور دھوئیں سے ہی نکل نکل کر گھر کے باقی حصوں یعنی برآمدے، دالان اور کوٹھریوں اور دروازوں تک پہنچتے تھے۔ باورچی خانہ ہی انسانوں کا گڑھا ہوا وہ متن تھا جس میں ہزار ہا معنی پوشیدہ تھے بلکہ معنی لگاتار پیدا ہوتے رہتے تھے۔

شادی، موت، ہر ہنگامے پر باورچی خانہ کا ایک انفرادی کردار ہوا کرتا تھا۔ نیاز، نذر اور تیوہار بس اسی مقام پر اپنی معنویت کا مرکز رکھتے تھے۔ رت جگوں کے گلگلے، کونڈوں کی پوریاں، کھیر، سویّاں اور موت کا حلوہ، سب اپنے ذائقے اور خوشبو کے لیے اسی کے مرہونِ منت تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ بقیہ تمام گھر، اُس کے آگے کمزور اور بے بس نظر آتا تھا۔ وہ قوت کا مرکز تھا۔ نئے زمانے کے جدید کچن کا باورچی خانوں کی عظیم مگر بھیانک روایت سے بظاہر کوئی تعلق نہیں نظر آتا۔

چندر گپت موریہ کے زمانے سے لے کر مغلیہ دورِ حکومت کے اختتام تک تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ رسوئی اور باورچی خانے کا رول حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے میں بہت اہم مگر خفیہ نوعیت کا رہا ہے۔ مہاتما بدھ کی موت بھی بھکشا میں ملے ہوئے سڑے ہوئے گوشت کے کھانے

سے ہی ہوئی تھی۔

باورچی خانے کا تعلق کھانا پکنے سے ہے اور کھانے کا تعلق انسان کی آنتوں سے اور بھوک سے اور بدنیتی سے بھی۔ کیا کبھی سوچا ہے کہ انسان کے اعضائے تکلم ایک دوسرا کام بھی تو کرتے ہیں جس طرح جنسی اعضاء دو کام انجام دیتے ہیں۔

منھ، زبان، تالو، جبڑے اور دانت کھانا بھی تو چباتے ہیں۔ کھانے کا ذائقہ، لمس، مہک اور اُس کا چبانا، ریزے ریزے کر دینا اور پھر نگل کر آنتوں میں پھینک دیا جانا سب انھیں اعضا کے رحم و کرم پر مبنی ہیں۔

مگر آدمی بولتا بھی تو انھیں کے سہارے ہے۔ انھیں اعضا نے تو انسان کو قوتِ گویائی بخشی ہے۔

آخر کیوں؟

آخر کیوں؟ یہی اعضا کیوں؟؟ آنکھیں اور کان اور ناک کیوں نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کھانا بھی ایک قسم کی وحشی اور گونگی بھاشا ہو اور بھوک اُس کے معنی!

ساری دنیا کی ایک عالمگیر زبان بھوک نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ اعضا زبان بولنے اور کھانا چبانے میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتے۔ ان دونوں کاموں سے اُنھیں ایک ہی قسم کی طمانیت اور سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ ایک حیاتیاتی سطح پر اور دوسرا تہذیبی سطح پر۔

مگر نہیں! کہاں کی حیات اور کہاں کی تہذیب، سب افواہیں ہیں اور دشمنوں کی اُڑائی ہوئی ہیں۔ معاملہ کچھ اور ہی ہوگا اور جو بھی ہوگا وہ بہت بھیانک ہوگا۔

بچپن سے ہی مجھے باورچی خانے سے ایک اجنبی اور نامانوس بُو کے آتے رہنے کا احساس تھا۔ یہ بُو ہلدی، مرچ، پیاز اور لہسن اور سرسوں کے تیل کے بگھار سے ملتی جلتی ہونے کے باوجود اُن سے الگ تھی۔ یہ زیادہ بھاری تھی اور اِسی لیے اس بُو کے سالمے بقیہ سے الگ اپنی ایک تہہ بناتے تھے۔ وہ ان سب اشیا کی بو میں گھل مل نہیں سکتے تھے۔

وہ نامانوس بو کس چیز کی تھی؟

تب تو نہیں مگر اب اِس عمر میں، تقریباً بوڑھا ہو جانے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ

درندوں اور جنگلی جانوروں کے جسم سے آنے والی بو تھی۔

باورچی خانہ، آخر سرکس کا ایک تنبو بھی تو تھا۔

سرکس کے اس تنبو میں، ایک مسخرہ بن کر جیتے جیتے اور جانوروں کی بدبوؤں کے ساتھ رہ کر میری روح کی تمام خوشبو گھل گھل کر ختم ہوگئی۔

شاید اب بھی میں کچھ جانوروں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اُن کا رنگ ماسٹر اگرچہ مجھے قابو نہیں کرتا مگر میں اپنے آپ ہی اُس کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں اُس کے چہرے اور اُس کے کوڑے دونوں ہی کے مزاج پہچانتا ہوں۔

میں جانوروں کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھ رہا ہوں۔ اُن کے ساتھ ہی میرا آب ودانہ ہے اور اُن کے ساتھ ہی میرا پیشاب پاخانہ۔

میں اِن سب سے اور باورچی خانے سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ کوئی بھی نہیں جا سکتا۔

انسان کہیں نہیں جاتا۔ سب چیزیں اُس کے پاس آتی ہیں، بالکل آنے والے کل کی طرح۔

آنے والا کل، شاید صرف اُس جسم کے لیے نہ ہو جو آنتوں اور معدے سے خالی ہو۔

مجھے ہندو دھرم کا یہ خیال بار بار چونکاتا رہتا ہے کہ جس طرح ہون کنڈ میں اناج اور غلّہ وغیرہ ڈالا جاتا ہے، اُسی طرح معدہ بھی ایک قسم کا ہون کنڈ ہے۔ اور بھوک ایک آگ۔ پیٹ کی آگ کے لیے کھانا چاہیے۔ کھانا کھانا ایک یگیہ سے مماثل ہے۔

ویسے بات کچھ خاص نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں استعارے سے کتراتا ہوں، مجھے تشبیہ پسند ہے۔

ہمارا گھر ایک عجیب وغریب اور مثالی مشترکہ خاندان تھا۔ میرے ماں باپ کو چھوڑ کر وہاں سب ہی رہتے تھے۔ ماں میری پیدائش کے کچھ ہی مہینوں بعد چل بسی تھیں۔ انھیں پرانی ٹی بی تھی اور باپ پولیس میں ملازمت کرتے تھے۔ میری عمر شاید دو سال رہی ہوگی جب ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ اُن کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے تھے۔ تو ماں باپ کا ذکر ہی کیا کرنا، وہ ایک بند کتاب کی طرح ہے، جسے شاید کبھی نہیں کھولا جاسکے۔

مگر اُن کے علاوہ گھر میں افراد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ خاص طور پر چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بھائیوں اور بہنوں کی، دادیہال کے علاوہ شاید میری پوری ننہال بھی یہیں آبسی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا حالات تھے جس کے سبب میری ننہال کے بہت سے لوگ مثلاً ماموں اور خالہ وغیرہ بھی اس گھر میں رہتے تھے جسے میں اپنا گھر کہہ رہا ہوں۔ اصل میں گھر کس کا تھا اور کس کے نام تھا۔ نہ مجھے معلوم تھا اور نہ کبھی یہ دریافت کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوئی۔ مجھے اصل میں کون پال رہا تھا، میری پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری کس کی تھی مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ گاؤں میں ایکڑوں کے حساب سے زمین تھی اور وہاں سے اتنا اناج اور غلّہ آتا تھا کہ گھر میں رکھنے کی جگہ نہ بچتی تھی۔

گھر میں کتنے افراد تھے، میں گن گن کر بتا سکتا ہوں، مگر مانا کہ میری یادداشت بہت اچھی ہے لیکن آخر اُس پر زور کیوں ڈالا جائے۔ دماغ کے ایک چھوٹے سے حصے میں اگر اتنی تصویریں زبردستی اکٹھا کر کے اُن کے نام لے لے کر گنایا جائے تو اس سے نہ تو اُن تصویروں کا کوئی بھلا ہوگا نہ دماغ کا۔ بہتر یہی ہے کہ میں پیچھے پیچھے آنے والے اُس وفادار کتے کی چاپ ہی سنوں۔ ادھر اُدھر کی دوسری

آہٹوں کو نظر انداز کر دوں۔

انجم باجی میری خالہ زاد بہن تھیں۔ عمر میں مجھ سے کم از کم دس سال بڑی ضرور رہی ہوں گی۔ اس بھرے پرے گھر میں شاید وہ سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ چھ سات سال کی عمر تک تو وہ مجھے گود میں لیے لیے بھی گھوما کرتیں اور باہری دالان کے داسے کے کنڈے میں لٹکے ہوئے طوطے کے پنجرے کے پاس مجھے لے جاتیں۔ اور طوطے سے کہتیں، ''لو گڈو میاں آگئے، گڈو میاں آگئے۔''

طوطا بڑا باتونی تھا، نقل اُتارنے کا ماہر، سُنبل اُس کا نام تھا۔ دو تین منٹ تک تو طوطا خاموشی سے اپنی آنکھیں گھما گھما کر ہم دونوں کو دیکھتا رہتا، پھر فوراً ہی اپنی واضح طور پر توتلی مگر غیر انسانی آواز میں بولتا۔

''گڈو میاں آگئے، گڈو میاں آگئے۔''

انجم باجی ایک ہری مرچ میرے ہاتھوں میں تھما کر کہتیں۔

''لو سنبل کو مرچ کھلاؤ۔''

مرچ کو چونچ میں دبائے دبائے وہ ہم دونوں کو دیکھتا رہتا۔ پھر انجم باجی اسی طرح مجھے گود میں لیے لیے نل پر چلی جاتیں، اور اُس سے ملی دیوار پر مٹی کے وہ گھر دکھانے لگتیں جو بھڑیں بنا رہی تھیں۔

انجم باجی بہت گوری اور دُبلی پتلی نازک سی لڑکی تھیں۔ تب تو نہیں مگر بہت بعد میں غصّے کے کچھ کمزور اور کمینے لمحات میں، میں نے جب اپنے خیالوں میں اُنھیں بے لباس کرنا چاہا تو یہ ممکن ہی نہ ہوا۔ شاید کپڑوں کے اندر اُن کا جسم تھا ہی نہیں، یا کپڑے اُتارتے ہی اُن کے بدن کے تمام نشیب و فراز دھواں ہو کر تحلیل ہو جاتے تھے۔

اُن کے گورے بدن میں ایک پیلاہٹ تھی، وہ جس رنگ کا بھی کپڑا پہنتیں، اُس پر مجھے پیلے پن کی ایک پاکیزہ مگر پُراسراری چھوٹ پڑتی ہمیشہ محسوس ہوتی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو کسی شخص میں بس کوئی ایک ہی چیز نظر آتی ہے۔ آخر آنکھوں کی اپنی حماقت بھی تو ہوتی ہے یا اُن کا اپنا انفرادی المیہ۔

میری آنکھوں کو نہ تو اُن کی آنکھیں کبھی صاف طور پر نظر آئیں اور نہ ناک یا ہونٹ اور جہاں تک

گردن کے نیچے کا سوال ہے تو اُن کے دوپٹے کا اُبھار مجھے دلکش تو لگتا تھا مگر جتنا دلکش لگتا تھا اُتنا ہی فطری اور عام بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ عورت اور مرد کا فرق تھا جس طرح ایک میز کرسی سے مختلف ہوتی ہے یا ایک کتاب پتھر کی سل سے۔ اس لیے میرے اندر انجم باجی کے سینے کے اُبھاروں کے بارے میں کوئی تجسس نہ تھا۔ یاد رکھئے جنسی معاملات میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اس لیے مجھے تو صرف ان کی گوری، اجلی، صاف ستھری رنگت ہی نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں وہ خوبصورت تھیں یا یوں ہی سی تھیں۔ میں اپنی فطری یادداشت کو اُلجھن میں کیوں مبتلا کروں؟ میں اُن کی رنگت سے ہی لپٹا رہنا چاہتا تھا۔ کاش! وہ سفید اُجلا رنگ انجم باجی کے جسم کی کھال سے نہ چپکا ہوتا۔ کاش! وہ رنگت اُن سے ماورا ہوتی، کہیں خلا میں، یا ہوا میں، یا آسمان میں اور تب میرے گناہوں کے اندھیرے اتنے گاڑھے نہ ہوتے۔ وہاں کچھ سفیدی باقی رہتی۔

مجھے انجم باجی سے محبت ہو گئی تھی، بچپن میں، جب میں نیکر پہنتا تھا اور زیر ناف میرے بال بھی نہیں اُگے تھے، مگر میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی ماہیت میں بچپن کا یہ عشق، جوانی بلکہ کسی بوڑھے بوالہوس کے عشق سے مختلف نہ تھا۔ باورچی خانے میں رکھے کچے گوشت کے مانند جس پر گرم مسالوں کی تہہ نہ لگی ہو اور جو ابھی ہانڈی میں اُبلنے کے لیے نہ رکھا گیا ہو۔

محبت اور نفرت میں ایک بڑا واضح اور خطرناک فرق ہے۔ محبت کی شکل صورت، اس کا جسم، اس کے خطوط اور خدوخال یاد نہیں رہتے، مگر نفرت ہمیشہ ایک جسم اور چہرہ رکھتی ہے۔

آفتاب بھائی سے مجھے نفرت تھی۔ ہمیشہ سے، چاہے انھوں نے مجھے کتنی بھی نافیاں اور قلاقند کھلائے ہوں۔ آفتاب بھائی لمبے چوڑے جسم کے مالک تھے، رنگت اُن کی بھی گوری تھی مگر وہ انجم باجی کی طرح ایک پاکیزہ پیلی سفیدی نہ تھی۔ اُن کی جلد کی سفیدی میں لال رنگ چھپا ہوا تھا۔ ایسی سفیدی ہمیشہ اندر سے داغ دار اور تشدد کی سیاہی سے پُتی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا پتہ بھلے ہی بعد میں چلتا ہو۔

اُن کی آنکھیں بھوری اور بے رحم تھیں اور دہانہ کسی بل ڈاگ سے ملتا جلتا تھا۔ جس کو وہ اپنی خاندانی وجاہت اور مردانہ پن کی شان سمجھتے تھے۔

آفتاب بھائی، انجم باجی کے پھوپھی زاد بھائی تھے تو میرے کون ہوئے؟ پتہ نہیں بڑی گڑبڑ ہے۔ نہ جانے کیوں اس گھر میں اتنے عم زاد آکر کیوں اکٹھا ہو گئے تھے؟ غنیمت یہی تھا کہ یہاں بندروں نے اپنا ٹھکانہ نہیں بنایا تھا ورنہ وہ بھی ان تمام زادوں میں شامل ہو جاتے تو کوئی بعید نہ تھا۔

یقیناً آفتاب بھائی میں ایسی کوئی شے نہیں تھی جو اُن کے جسم سے ماورا ہونے کا امکان رکھتی۔ وہ پیٹو تھے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے تھے۔ جس کے فوراً بعد مٹھی میں سگریٹ داب کر لگاتار گہرے گہرے کش کھینچتے۔ سگریٹ کی بو اُن کے آس پاس ہونے کی علامت تھی۔

آفتاب بھائی سے میری نفرت کی شدّت میں اُس دن غیر معمولی اضافہ ہو گیا جب میں نے انجم باجی کی سانسوں سے اُس سگریٹ کی بو آتی ہوئی محسوس کی۔

میں بڑا ہو رہا تھا یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے جسم کے اندر عمر کی مقدار بڑھ رہی تھی۔ جس سے جسم آہستہ آہستہ۔ آخرکار بڑھاپے کی طرف بلکہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔

اب انجم باجی مجھے گود میں نہیں لیتی تھیں۔ نیکر میں میری پنڈلیاں اور رانیں موٹی ہو گئی تھیں۔ میں واقعی موٹا ہو رہا تھا اور زیادہ تر وقت باورچی خانے میں گزرا کرتا تھا۔ باورچی خانے میں ایک دن جب میں شکر میں دیسی گھی ڈال کر اُسے باسی روٹی کے ساتھ کھا رہا تھا تو میں نے دیکھا۔

میں نے باورچی خانے کی جالی میں سے زینے کی چوتھی سیڑھی پر دیکھا، آفتاب بھائی انجم باجی کو اپنے ہاتھ سے کیک کھلا رہے تھے۔

میرے ہاتھ سے روٹی گر گئی۔

انجم باجی کا منھ چل رہا تھا۔ میں نے شاید پہلی بار اُن کا منہ کھلا دیکھا۔ وہ جلدی جلدی، گھبرا گھبرا کر کیک نگل رہی تھیں۔ میں نے پہلی بار اُن کے حلق کی حرکت اور اُس کی ہڈی کو دیکھا۔ شدید قسم کے غم و غصے نے مجھے آکر گھیر لیا۔

دوپہر تھی، مئی کی تپتی ہوئی دوپہر۔ باورچی خانے کی جالیوں میں زینے سے ہو کر آتی ہوئی لُو ہوک رہی تھی۔ آفتاب بھائی سے مجھے خوف سا محسوس ہوا اور اس بات پر افسوس بھی کہ اب تک میں نے یہ غور کیوں نہیں کیا تھا کہ انجم باجی کے پیٹ میں بھی آنتیں تھیں۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اُن کے

ہاتھ ہی کا پکا ہوا پلاؤ کھایا تھا۔ وہ بہت نفیس پلاؤ پکاتی تھیں۔ جس کا رنگ خود اُن کی اپنی رنگت سے ملتا جلتا ہوتا۔ اور اُن کے ہاتھ کا پکایا ہوا پتلا شوربہ جسے میں تام چینی کی سفید رکابی میں اُتار کر بڑے اہتمام سے کھاتا تھا، جس دن بھی انجم باجی کے کھانا پکانے کی باری آتی، میں پڑھنا لکھنا چھوڑ کر باورچی خانے میں اُن کے ساتھ ہی کھڑا رہتا۔ مجھے اُن کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ہی اچھا لگتا تھا اور باورچی خانہ بھی اُس وقت مجھے دنیا کا سب سے حسین مقام معلوم ہوتا تھا جب وہاں انجم باجی کچھ کام کر رہی ہوتیں۔ تو ارنگ برنگی چنگاریاں بکھیرتے ہوئے ہنسنے لگتا جب وہ روٹیاں پکاتیں۔

بارہا میں نے انجم باجی کو کھانا کھاتے دیکھا تھا، مگر نہ جانے کیوں مجھے کبھی اُن کے جسم میں (اگر اُن کا کوئی جسم تھا) آنتوں کے ہونے کا رتّی برابر شائبہ تک نہ ہوا۔

مگر آج مئی کی اس سنسان گرم، تپتی ہوئی دوپہر میں۔ جب آسمان پر چیل انڈا چھوڑ رہی تھی، اچانک انجم باجی کے پیٹ میں نہ جانے کہاں سے آنتیں آگئیں۔ پل بھر کو آفتاب بھائی مجھے وہ نفرت انگیز چیل نظر آئے جو سڑک کے کنارے سڑتی ہوئی کسی اوجھڑی کو اپنی چونچ میں دبائے وہاں اُڑ رہی تھی۔

یہ غلیظ اور کراہیت سے بھری ہوئی اوجھڑی کسی بھی پاک صاف مقام پر، پاکیزہ جسم پر گر سکتی تھی۔

مجھے یاد ہے میں چولہے کی بھوبل کے پاس بیٹھ کر رونے لگا۔

میں نے زینے سے آتی ہوئی سرگوشی سنی۔

''باورچی خانے میں گڈو میاں ہیں۔'' انجم باجی تھیں۔

''وہ احمق موٹا ہوتا جارہا ہے، سب اُسے گڈو میاں کیوں کہتے ہیں، اُس کا اصل نام حفیظ ہے، حفیظ ہی کہنا چاہیے۔'' آفتاب بھائی ہنسے۔

''ابھی چھوٹا ہے، بن ماں باپ کی اولاد — وہ گڈو ہی ہے۔ گڈو میاں۔'' انجم باجی کے لہجے میں پیار تھا۔

''یہ چھوٹا ہے... اب کیا بتاؤں اُس دن جب یہ سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا...'' آفتاب بھائی نے کچھ آہستہ سے کہا تھا۔ یا جملہ غیر مکمل چھوڑ دیا تھا

''شرم نہیں آتی۔'' انجم باجی غصے سے بولیں۔

اُس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ میں چولہے کی بھوبل کے پاس اُسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں اب رو نہیں رہا تھا۔ میرے کان آفتاب بھائی کے غیر مکمل جملے کے نقش پن کو مکمل کر رہے تھے۔

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ نفرت کا جسم بھی ہوتا ہے۔ اور چہرہ بھی۔ میں اپنی یادداشتوں پر تبصرہ کرتے رہنے کے لیے بھی مجبور ہوں۔ آخر جسم میں اتنی عمر آ گئی ہے اور دماغ کے خلیے کمزور ہو کر مت رہے ہیں۔ میں جھکّی ہوتا جا رہا ہوں۔

آفتاب بھائی اب میرے لیے سراپا نفرت کی ایک رسّی تھے۔ جس سے میں بندھا ہوا تھا۔ اس رسّی سے بندھے ہوئے کسی وحشی جانور کی طرح میں انجم باجی کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔

وہ کچھ نہیں سمجھتی تھیں یا جان بوجھ کر انجان تھیں۔ اُنھیں دنوں اُنہوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے لال رنگ کا ایک سویٹر بھی بُن کر دیا تھا۔ میں نے وہ سویٹر آج تک نہیں پہنا، وہ اُسی طرح اُس لوہے کے کالے صندوق میں بند ہے۔ جس کے بارے میں، میں نے سنا تھا کہ وہ میرے ماں باپ کا صندوق تھا۔

میں بظاہر اپنا وقت اسکول کی کتابوں میں گزارنے لگا۔ میں نے انجم باجی کے پاس جانا کم کر دیا۔

بس کبھی کبھی میں طوطے کے پنجرے کے سامنے جا کر اُداس کھڑا ہو جاتا۔ طوطا دیر تک آنکھیں گھما گھما کر مجھے دیکھتا اور پھر زور زور سے بولنا شروع کر دیتا۔

''گڈو میاں آ گئے، گڈو میاں آ گئے۔''
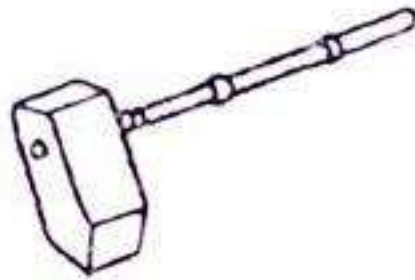
یہ گھر جس محلے میں واقع تھا، میرے بڑے ماموں اکثر بتایا کرتے تھے، ایک قبرستان پر آباد کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر ہر گھر کی زمین میں ایک قبر موجود تھی۔ جب بھی کسی کے گھر کی زمین کو گہرے کھودے جانے کا موقع آتا تو مزدوروں کا پھاوڑا کسی نہ کسی ہڈیوں کے ڈھانچے سے جا کر ضرور ٹکراتا۔ محلّے کے باشندوں کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ سب اس کے عادی ہو چکے تھے۔

گلیوں میں بھی جگہ جگہ پکی قبریں نظر آتیں جن کے تکیوں پر آوارہ لونڈے دن بھر بیٹھے ہڑدنگ مچاتے نظر آتے۔ رات میں انھیں قبروں پر بیٹھ کر جوا بھی کھیلا جاتا۔ کچھ قبریں ایسی بھی تھیں جنھیں مزار کہا جاتا تھا اور ہر جمعرات کو وہاں چادریں چڑھائی جاتی تھیں۔ اگربتی اور لوبان کے دھوئیں سلگتے، کھیلیں اور بتاشے تقسیم ہوتے اور قوالیاں بھی ہوتیں۔ ہر گھر میں نیاز نذر کا ماحول تھا اور دوسرے مسلک والوں کا حقہ پانی یہاں بند تھا۔

اُس پار کھیتوں کے ایک لمبے سلسلے کے بعد جو محلّہ تھا وہاں دوسرے مسلک اور عقیدے والے لوگ رہتے تھے۔ ادھر کا آدمی اُدھر اور اُدھر کا آدمی ادھر آ کر مسجد میں نماز تک پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے محلے کے بعض گھروں کی لڑکیاں زندگی بھر کنواری رہیں اور بوڑھی ہو گئیں، صرف اس وجہ سے کہ اپنے عقیدے کے لوگوں میں انھیں اپنے معیار کے مطابق رشتہ نہ مل سکا اور بدعقیدوں میں شادی ہو جانے سے بہتر اُن کا زندگی بھر کنوارا رہنا ہی تھا۔

ہمارا گھر بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ نور جہاں خالہ، ثروت پھوپھی، شاہین باجی اور نہ جانے

کون کون تمام عمر کنواری رہیں۔ اور اُن سب کا بڑھاپا یقیناً بہت خراب گزرا ہوگا اگرچہ اس بارے میں مجھے بہت زیادہ علم نہیں ہے۔

گھر میں ہر وقت شور سا مچا رہتا۔ گرمیوں کی دوپہر اور رات کے وقفے کو چھوڑ کر بس آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ زنانہ، مردانہ، جوان اور بوڑھی آوازوں کا ایک سیلاب تھا جس سے گھر کی دیواریں چٹخنی جاتی تھیں۔ ہاں وہاں بچّوں کی آوازیں نہ تھیں۔ بچّہ تو صرف میں تھا۔ اکیلا بچّہ مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اُس وقت تک تو میری آواز بھی بچّے کی نہ رہی ہوگی۔ یوں بھی میں نے اپنے آپ کو کبھی بچّہ نہ سمجھا۔ باورچی خانے اور انجم باجی کی گود نے مجھے اپنے اندر ایک کینہ پرور اور خطرناک مرد کے وجود سے شاید ہوش سنبھالتے ہی روشناس کر دیا تھا۔

ہر جمعرات کو گھر میں عصر اور مغرب کے درمیان فاتحہ ہوتی اور لازمی طور پر گوشت کا سالن پکایا جاتا۔ زیادہ تر بڑے ماموں ہی بیٹھ کر سر پر تولیہ ڈال کر فاتحہ دیتے۔ کبھی انجم باجی، کبھی نور جہاں خالہ اور کبھی ثروت پھوپھی جمعرات کا کھانا پکاتیں۔ یوں تو بہت سی عورتیں جن میں ممانیاں، خالائیں اور اُن کی لڑکیاں اور کچھ خادمائیں بھی باورچی خانے میں کچھ نہ کچھ کام کرتی نظر آتیں، مگر چند خاص کھانے جو ہر جمعرات کو اہتمام کے ساتھ پکائے جاتے، ان کا ذمہ انجم باجی، نور جہاں خالہ اور ثروت پھوپھی کے ہی سر تھا۔

بڑے ماموں کا کہنا تھا کہ جمعرات کی شام کو، مغرب سے پہلے گھر کے آباؤ اجداد کی روحیں اپنی اپنی قبر کے باہر بیٹھ کر فاتحہ کے کھانے کا انتظار کرتی ہیں۔ اور جن کے پیارے اُنھیں بھول چکے ہیں اور فاتحہ نہیں دلاتے اُن روحوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بڑے ماموں یہ بھی بتاتے تھے کہ رات میں کسی نہ کسی وقت گھر کے مکینوں کی روحیں گھر میں گشت کرنے کے لیے ضرور آتی ہیں۔

میں فاتحہ کے وقت بڑے ماموں کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اگربتّی کے دھوئیں میں پیالوں میں رکھا سالن صاف صاف نظر نہیں آتا تھا۔ اُس وقت کچھ بھی صاف صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں وقت مل رہے ہوتے۔ سارے ماحول پر ایک ناقابلِ فہم دھندسی پھیل جاتی اور جب مغرب کی اذان ہونے لگتی تو میں شدت سے اُداس ہو جاتا۔ اُس وقت چاروں اطراف میں اُداسی پھیل جاتی اور میں قبروں

کے باہر، اپنے اپنے کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے مُردوں کے بارے میں سوچنے لگتا۔ وہاں کون کون ہوگا؟ کیا میرے ماں باپ بھی؟

مگر کچھ ہی دیر بعد یہ منظر ایک حیرت انگیز خاموشی کے ساتھ وہاں سے سرک کر نہ جانے کہاں چلا جاتا، دالان میں لالٹین روشن ہو جاتی۔ گھر میں رونق ہی رونق پھیل جاتی اور باورچی خانہ چوڑیوں کی جھنکار سے گونجنے لگتا۔

مجھے صرف انجم باجی کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا پسند تھا۔

ہاتھ؟

دراصل ہاتھوں کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا ہے، ہاتھ تو انسان کے دماغ سے بھی پہلے قوت نمو حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہاتھوں کی ایک ایک انگلی کی اپنی ایک الگ داستان ہے۔ انسان کے ہاتھوں کا لگاتار ارتقا ہو رہا ہے مگر ممکن ہے کہ ہاتھوں کا یہ ارتقا ایک معکوس ارتقا ثابت ہو اور انسانی ہاتھ انجام کار ایک روز آکٹوپس کے ہاتھ پاؤں میں تبدیل ہو جائیں۔

غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ ہاتھوں سے زیادہ گنجان ہڈیوں کے گچھے جسم میں اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ ہاتھ انسان سے الگ ہیں، کبھی کبھی تو اُس کے ذہن و دماغ اور جسم کے لیے یکسر اجنبی اور بیگانے۔

یہی سبب تھا کہ وہاں الگ الگ ہاتھوں کے الگ الگ کھانے تھے، اُن کے ذائقے الگ، ان کی خوشبوئیں الگ اور اُن کی شکلیں الگ۔ باورچی خانہ ان ہاتھوں کی حرکات و سکنات کا ایک عجائب گھر تھا۔

مجھے یاد ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ہمارے یہاں ایک باورچی بھی رکھا گیا تھا۔ جو پیروں سے بیسن چھیلتا تھا اور سب اُسے انگشت بدنداں دیکھتے تھے، مگر ایک بار جب اُس نے پیروں سے کھانا پکانے کی خواہش ظاہر کی تو ہر شخص نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کھانا ایک پاک صاف شئے ہے۔ اس کا احترام کرنا چاہیے۔ چاہے حلق سے اُترتے ہی وہ ناپاک کیوں نہ ہو جائے اور بڑی آنت میں جا کر فضلے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے۔ اس لیے باورچی خانے کے سرکس میں کوئی بھی اُس غریب کا

یہ کرتب دیکھنے پر آمادہ نہ ہوا۔ باورچی کو بے عزتی ہونے کا احساس ہوا۔ اپنے سے زیادہ اپنے آرٹ کی۔ وہ نوکری چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا مگر جاتے وقت اُس نے یہ ضرور کہا تھا کہ افسوس وہ لوگ نہیں جانتے کہ کبھی کبھی کچھ انسانوں کے ہاتھ اُن کے پاؤں میں اُتر آتے ہیں۔ یہ ایک مرض بھی ہو سکتا ہے جس طرح آدمی کی آنت اُتر جاتی ہے۔ اس لیے میں بار بار یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہاتھوں کی اپنی ایک الگ ہی پُراسرار دنیا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کہیں بھی جا سکتے ہیں، وہ کسی کا سر سہلا سکتے ہیں، کسی کے آنسو پونچھ سکتے ہیں اور گال پر تھپڑ بھی رسید کر سکتے ہیں۔ ہاتھ قتل تک کر سکتے ہیں۔

باورچی خانے میں الگ الگ ہاتھوں سے ایک ہی قسم کی اشیا ایک ہی جگہ پر الگ الگ انداز سے رکھی جاتی تھیں، وہی نمک کا ڈبہ تھا، وہی سوکھے دھنیے کا۔ پسی ہوئی مرچوں کا اور ہلدی کا مگر ہر ہاتھ اُنھیں ایک نئے ڈھب کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ اُنھیں کھولتا، بند کرتا اور رکھتا تھا۔ کھرنجے کے فرش پر کسی کے ہاتھ سے جھاڑو دینے پر کوڑا بچا رہتا تھا اور کوئی دوسرا ہاتھ جھاڑو دیتا تو فرش آئینے کی طرح چمکنے لگتا، اپنی بوسیدگی کے باوجود ہر ہاتھ کا اپنا تماشہ تھا، اور ہر تماشے کو اپنے اداکاروں پر ناز تھا، اداکار جو صرف ہاتھ تھے۔

باورچی خانہ ایک متوازی دنیا تھا جس پر حکومت کرنے کے لیے عورتیں آپس میں جھگڑا کرتی تھیں، چلاّتی تھیں، ایک دوسرے پر مارنے کے لیے برتن اُٹھا لیتی تھیں، پھر ٹسوے بہاتی تھیں اور چولہے کی گرم بھوبل کو اپنے سر میں بھر لینے کی دھمکیاں دیتی تھیں اور وہ ہاتھ جن میں کبھی چوڑیاں کھنکتی تھیں اور کبھی وہ گھونسے کی شکل میں فضا میں تنتے۔ وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔

باورچی خانے کی اس چھوٹی سی دنیا میں ایک گھمسان مگر زنانہ رن برپا تھا۔

گھر کے مرد اس جنگ سے بالکل متاثر نہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جہاں چار برتن ہوتے ہیں تو آپس میں ٹکراتے ہی ہیں، اس گھر کے افراد کو اپنی پرانی (چھین لی گئی زمینداری) زمینداری، اعلیٰ حسب و نسب اور مدتوں سے چلی آ رہی مشترکہ خاندان کی روایت پر بے حد غرور اور گھمنڈ تھا۔ انھیں باورچی خانے کی پُراسرار دنیا کا کوئی علم ہی نہیں تھا۔ باورچی خانے کے دھوئیں سے، وقت سے پہلے

جالے بھرتی ہوئی اور اندھی ہوتی آنکھوں، جلتے ہوئے ہاتھوں اور سُن ہوتے ہوئے گھٹنوں سے وہ انجان تھے۔

بس ایک میں تھا، ایک اکیلا۔ بڑا ہوتا ہوا ایک بچہ۔ جو باورچی خانے کے تماشے کا ایک عینی شاہد تھا۔ یا اُس عدالت کا جو روز وہاں لگتی تھی اور جس کے کٹہرے میں ایک دن مجھے بھی مجرم بن کر کھڑا ہو جانا تھا۔

انسان اپنے مقدر سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ مقدر تو خود چل کر اُس کے پاس آتا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے راستوں اور بھول بھلیّوں سے نکل کر اچانک کسی آسیب کی صورت آپ اپنے مقدر کو اپنے سامنے کھڑا دانت نکالے ہوئے دیکھتے ہیں۔ آپ کے پیر پتھر کے ہو جاتے ہیں۔

بارہ تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مجھے اُردو کے جاسوسی ناولوں کا چسکہ لگ گیا۔ یہ چسکہ بھی مجھے بڑے ماموں نے ہی لگایا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کا زمانہ اُردو کے مقبول عام ادب کا زمانہ تھا۔ میں بری طرح اس ادب کا شکار ہو گیا۔ جاسوسی ناولوں کے ساتھ ساتھ میں نے ہر قسم کے رومانی ناول بھی چاٹ ڈالے۔ فلموں کا بھی شائق ہو گیا۔ اگرچہ فلمیں دیکھنے کو کم ملتی تھیں، مگر فلمی رسائل گھر میں پابندی کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ اور پھر ریڈیو تھا، اُس پر فلمی گانے آتے رہتے تھے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ میری شخصیت کی تشکیل میں جاسوسی ناول، گھٹیا قسم کے رومانی ناول اور چونّی والی فلموں اور اُن کے گانوں کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔

گھر سے نکل کر بائیں طرف دس بارہ قدم چلنے کے بعد ٹوٹی پھوٹی تین چار قبریں پڑتی ہیں، اُن قبروں کے پار انجم آپا کا مکان تھا۔ انجم آپا ہماری دور کی رشتہ دار تھیں اور عمر میں مجھ سے آٹھ نو برس بڑی تھیں۔ ان کا خاندان ہمارے مقابلے معاشی اعتبار سے کمتر تھا اور اُن کا باورچی خانہ بھی بہت چھوٹا سا تھا۔ جس میں سامان رکھنے کے لیے کوئی اندھیری کوٹھری نہیں تھی برتن بھی بہت کم تھے۔ اُن کے یہاں چولہے میں زیادہ تر اُپلے ہی استعمال کیے جاتے تھے یا پھر ایک زنگ آلود بھدا سا مٹّی کے تیل کا اسٹوو تھا۔ مٹّی کے تیل کی انجم باجی کے یہاں بہتات تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے والد کی سرکاری راشن کی دوکان تھی۔ جہاں گیہوں، چاول، شکر، سستے کپڑے کے ساتھ ساتھ مٹّی کا تیل بھی رعایتی داموں پر

فروخت ہوتا تھا۔ وہ آج کی طرح بازاری معیشت کا دور نہیں تھا اور اس چھوٹے سے شہر میں ایسی دوکانوں کی بہتات تھی۔ انجم آپا کو بھی فلموں سے اور جاسوسی ناولوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ محلے کی لائبریری اور کتابوں کی دوکانوں سے دو آنہ کرایہ پر لے کر ناول اور رسائل پڑھا کرتی تھیں۔ میں اُن کو محبوب ناول ہاؤس سے کرایہ پر لا لا کر ناول دینے لگا اور مشترکہ شوق کے باعث دوپہر میں میرا زیادہ تر وقت اُن کے ساتھ باورچی خانے میں گزرنے لگا۔ جہاں وہ اکثر مجھے گھر میں پلی ہوئی بکری کے دودھ کی چائے بنا کر پلاتی تھیں۔ اُپلوں پر بنی ہوئی چائے، فطرت کے زیادہ قریب مگر مقدر —؟ ہاں مقدر آہستہ آہستہ وقت کی لکیروں کے ساتھ رینگتا ہوا میرے پاس آرہا تھا۔ پتہ نہیں جاسوسی ناولوں کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے۔ میں نے اپنے اندر ایک چھٹی حس کو آہستہ آہستہ پروان چڑھتا پایا۔ مجھے اپنے اندر ایک خطرناک صلاحیت ہونے کے وجود کا خوفناک انکشاف ہوا۔

اس خطرناک صلاحیت یا خوفناک علم کی خبر سب سے پہلے مجھے میری آنتوں نے دی تھی۔ آنتوں کی وہ چکنائی جو میرے منھ سے نکلی۔ یہ اُسی کا دیا ہوا ایک وردان تھا یا کہ شاپ، ایک دُعا یا بددُعا؟ یہ تو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا مگر تمام عمر اس دُعا یا بددُعا کو سود کے ساتھ ادا کرتا رہا ہوں، بچپن سے اب تک۔ اس عمر تک پہنچ جانے کے باوجود۔

میں ریاضی میں کتنا کمزور تھا، نہ عدد سمجھ میں آتے تھے، نہ ہندسے اور نہ اُن کے آپسی رشتے اور اُلجھاوے۔ مگر یہ ایک دوسری ریاضی تھی۔ ایک دوسرا حساب جس میں سوال کو حل کرنے کے لیے کھانے کے مختلف اقسام ہندسوں میں بدل گئے تھے اور باورچی خانہ ہی وہ منحوس جگہ تھی جہاں سے اس علم میں علت و معلول کے بظاہر مضحکہ خیز اور ناقابل تشریح سراغ ملنا شروع ہو جاتے تھے۔

یہ سب اچانک شروع ہوا تھا، ایک واقعہ کے بعد جو انجم آپا کے باورچی خانے میں پیش آیا تھا۔ اس پُراسرار صلاحیت کی ابتدا انجم آپا کے باورچی خانے میں فرش پر رکھی ایک بنا ڈھکی بدقلعی دیگچی سے ہوئی تھی۔
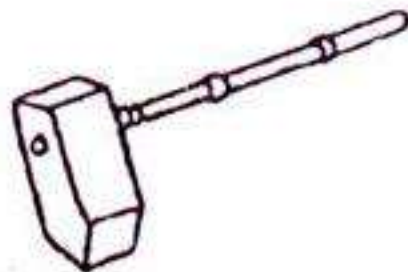
میں انجم آپا کے پاس بیٹھا بازار میں آئے ہوئے ایک نئے جاسوسی ناول کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ انجم آپا، چولہے پر بیٹھی چائے بنا رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ سُلگتے ہوئے اُپلوں سے نکلتے دھوئیں میں باورچی خانے کی کوئی شئے صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ باہر دسمبر کی شام نے اپنے ازلی رفیق کہرے کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ باورچی خاے میں صرف چھپکلیوں کے سائے صاف نظر آ رہے تھے۔ اتنی سخت سردی میں بھی دیواروں پر اتنی چھپکلیاں تھیں۔ سردی سے تقریباً مُردہ مگر ممکن ہے کہ وہ چولہے کی گرمی کی وجہ سے وہاں آ جاتی ہوں۔ تھی مگر یہ حیرت انگیز بات۔

چولہے کے اونلے پر ایک چھوٹی ایلمیونیم کی بوسیدہ سی دیگچی رکھی تھی، جس میں کوئی ڈھکّن نہ تھا۔ دیگچی میں دودھ تھا۔ انجم آپا نے چائے میں ڈالنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر دیگچی اُٹھائی اور تھوڑا سا دودھ چائے کے برتن میں اُنڈیل دیا۔

''آج کل روز، پتہ نہیں دودھ میں کچھ نیلاہٹ کیوں ہوتی ہے؟ بہت ہی پتلا دودھ لا رہا ہے یہ دودھ والا، کل اس کی خبر لوں گی۔'' کہتے ہوئے جیسے ہی انجم آپا نے دودھ کی دیگچی فرش پر رکھی، میرے منھ سے زور کی چیخ نکل گئی۔

دودھ میں ایک کالی اور موٹی سی چھپکلی تیر رہی تھی۔

انجم آپا کے بھی حلق سے چیخ نکلی۔

باورچی خانے میں گھر کے دوسرے افراد بھاگے چلے آئے۔

''یہاں اتنی چھپکلیاں ہیں، اندھی تجھے سوجھتا نہیں، سارے برتن بنا ڈھکے پڑے رہتے ہیں۔''

کسی عورت کی آواز تھی مگر مجھے محسوس ہوا جیسے دیگچی میں تیرتی چھپکلی نے ہی یہ کہا ہو۔

مجھے یاد آیا کہ کل بھی میں نے یہاں چائے پی تھی، بلکہ دو بار پی تھی اور انجم آپا نے کل بھی دودھ کی نیلاہٹ کا ذکر کیا تھا۔

میں کانپتا ہوا سا اپنے گھر واپس آیا۔ سخت سردی میں بھی مجھے پسینہ آرہا تھا۔ میرا جی بری طرح متلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں مجھے چکر آنے شروع ہو گئے۔

اس کے بعد اگر مجھے کچھ یاد رہ گیا ہے تو وہ اُلٹیاں ہیں جو پتہ نہیں کتنے دنوں تک میرے حلق سے باہر آتی رہیں۔ اپنے بستر پر لیٹا لیٹا میں تھک کر پلنگ سے جھک کر فرش پر ہی قے کرتا رہا اور اُن میں اپنا چہرہ دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ نہ جانے کب تک میں نے کھانا نہیں کھایا۔ صرف کڑوی کسیلی دوائیں میرے گلے سے نیچے اُتاری جاتی رہیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میری آنتیں اُچھل کر حلق سے باہر فرش پر بکھر جائیں گی۔ آنتوں میں ایک زبردست غصہ تھا۔ وہ غصّے میں دیوانی ہو گئی تھیں۔ میں نے اُنھیں غصّے میں بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ آنتیں اپنی چکنائی کو میرے منھ پر مار مار کر باہر پھینک رہی تھیں۔ لگاتار بڑبڑا، بڑبڑا کر مجھے شاید بددُعا دیے جارہی تھیں۔

آہستہ آہستہ میں وقت اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ میری پسلیوں کا درد ایک بے ہوشی میں بدل گیا۔ اب نہ دن رہا نہ رات، نہ صبح نہ شام۔ میں موت کے پالنے میں جھولا جھول رہا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو لوگوں کے کہنے کے مطابق یہ میرا دوسرا جنم تھا یا نئی زندگی۔ میں ایک ایسا بچہ تھا جس نے موت کی دیوار کو چھو کر واپس بھاگتے ہوئے آنے کا خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ میں آئینے میں اپنے آپ کو پہچان نہ سکا۔ میں بے ہنگم، مکروہ اور نکیلی ہڈیوں کا ایک چلتا پھرتا ڈھیر تھا۔ میرے جسم کی ساری کھال پیلی ہو کر جگہ جگہ سے جھڑ رہی تھی۔ مجھے اپنا قد پہلے سے چھوٹا محسوس ہوا۔ میں ایک بھیانک خشکی کی یلغار میں آ گیا تھا۔

کچھ عرصے تک میری یادداشت جاڑوں کی ہواؤں کے جھکّڑوں میں اِدھر اُدھر لاوارث اُڑتی پھری، ایک سوکھے پتّے کی مانند، میں کس زمانے میں ہوں؟ قواعد کی کتاب میں، میں نے زمانے کے تینوں صیغوں میں خود کو تلاش کیا اور ہر مقام پر خود کو غیر حاضر پایا۔

لیکن ایک دن جب مغرب کی اذان سے کچھ پہلے میں، باورچی خانے کی سیڑھی کے پاس کھڑا دسمبر کے کہرے کو بے خیالی سے دیکھے جارہا تھا، تو اچانک میری آنتوں نے جیسے میرے کانوں میں کچھ آہستہ سے کہا، کوئی علم، کوئی ریاضی کا فارمولہ، قواعد کا کوئی اصول۔

مگر آنتوں کی یہ آواز میرے کانوں میں جاکر رک نہیں گئی، میں نے اُسے ایک سفید روشنی کی طرح کانوں سے باہر آتے دیکھا۔ پُراسرار آواز، سفید روشنی کا ایک دھبّہ بن کر گھر کی منڈیر پر چھائے ہوئے کہرے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جم گئی۔

پل بھر کو مجھے اپنا وزن بہت کم محسوس ہوا۔ میں ہوا یا روشنی کی طرح ہلکا سا ہوگیا۔ میں نے اپنے اندر ایک واضح تبدیلی محسوس کی۔ جیسے دیوار پر ٹنگی کسی پرانی، دھول زدہ گھڑی کی ٹک ٹک اچانک بہت بلند ہوگئی ہو۔

یقیناً میرے اندر، میرے جسم اور دماغ میں کچھ تبدیل ہوا تھا۔ اُلٹیوں اور قے کے ذریعے نہ جانے کیا کیا میرے جسم سے باہر اُنڈیل دیا گیا تھا، مگر ساتھ ہی جسم سے باہر موجود ہواؤں نے کوئی پُراسرار یا آسیبی شے میرے وجود کی گہرائیوں میں پیوست بھی کردی تھی۔

میرے اندر کوئی طاقت آئی تھی۔ آخر کمزوری اور نقاہت، ایک نئی قوت اور طاقت کا پیش خیمہ بھی تو تھے۔

مگر میں اپنی چھٹی حس سے پہچان گیا کہ یہ طاقت منحوس اور خطرناک ہے۔ مجھے احساس تھا کہ جو بھی ہے وہ جلد ہی میرے لیے ایک عذاب کی پیشین گوئی ثابت ہوگا— ہاں! یقیناً ایک عذاب!

میں واپس اپنے زمانے میں آگیا۔ میں نے اپنے روٹھے ہوئے حافظے کو دوبارہ ایک ٹھوس شے کی طرح اپنے سامنے پایا اور میں نے اُسے اپنے دماغ کے خلیوں میں گویا ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر اندر محفوظ کرلیا۔ اُس وقت پنجرے میں طوطے نے تین بار زور زور سے کہا، ''گڈو میاں آگئے، گڈو میاں آگئے۔''

سردیاں رخصت ہوگئیں۔ مارچ کا مہینہ آپہنچا۔ گھر بھر میں سوکھے پیلے اور مُردہ پتّوں کا ایک ڈھیر لگ کر رہ گیا۔ مارچ کی خشک ہواؤں کے اُداس جھکّڑوں میں یہ پتّے باورچی خانے میں بھی اکٹھا ہوجاتے کیونکہ باورچی خانہ گھر کے مشرقی حصّے میں تھا اور یہ ہوائیں شاید اُدھر سے آتیں تھیں جدھر مغرب تھا۔

میں ایک دوپہر زینے کی چوتھی سیڑھی پر بیٹھا باورچی خانے میں جھانک رہا تھا۔ زینہ ان خزاں رسیدہ پتّوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ میرے پیروں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔

اچانک میرے پیچھے کی سیڑھیوں پر پتّوں میں کھڑ بڑ ہوئی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔

وہ ایک چھوٹا سا خرگوش تھا، سفید رنگ کا جس کے دو سیاہ کانوں میں سے ایک، آدھا کٹا ہوا تھا۔ خرگوش کی لال لال آنکھوں میں میرے لیے کوئی خوف یا دہشت نہ تھی، ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے ہمیشہ سے جانتا تھا۔

دراصل ہمارے گھر کے پچھواڑے جو مکان تھا، اُس کے مکین گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ اُنھیں لوگوں نے خرگوشوں کا ایک جوڑا پالا تھا۔ انجم باجی اکثر چھت پر مجھے گود میں لے کر اُن کے آنگن میں دوڑتے بھاگتے یہ خرگوش دکھایا بھی کرتی تھیں۔ اب وہ لوگ خرگوشوں کے جوڑے کو تو اپنے ساتھ لے گئے تھے، مگر اُس کے بچّے کو اسی خالی گھر میں لاوارث چھوڑ گئے تھے۔ کچھ ہی دنوں پہلے مجھے نور جہاں خالہ نے بتایا تھا کہ گھر کی موری سے یہ خرگوش کا بچّہ باہر آگیا اور سڑک کے ایک آوارہ کتّے

نے اُس پر حملہ کردیا، کسی طرح اُس کی جان تو بچ گئی مگر کتا اُس کا ایک کان آدھا کاٹ کر لے گیا۔

یہ وہی خرگوش تھا جو نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا ہوا، گندی موریوں اور نالیوں سے گزرتا اور بچتا بچاتا یہاں میرے پاس سوکھے مردہ پتوں سے ڈھکی لکھیا اینٹوں سے بنے زینے کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے اُسے گود میں لے لیا۔ اس کے کان پر زخم تھا جس پر خون جما ہوا تھا۔ زخم اندر سے پک رہا تھا۔

میں نے خرگوش کا سر نرمی سے سہلایا۔ اس نے بے حد مانوسیت کے ساتھ میری گود کو اپنی تھوتھنی سے رگڑا۔

میں باورچی خانے کا منظر جالی میں سے دیکھ رہا تھا۔

ثروت ممانی چولہے پر کچھ پکا رہی تھیں، اُن کے ہاتھ میں ''رشیدہ کا دسترخوان'' تھا۔

ان دنوں ہمارے گھر میں ہر عورت کے ہاتھ میں یا تو رشیدہ کا دسترخوان ہوتا یا ''رشیدہ کی کشیدہ کاری۔''

اُڑتے اُڑتے میں نے انجم آپا سے یہ بھی سنا تھا کہ انجم باجی کی بارات ہونے والی ہے، ممکن ہے اسی لیے طرح طرح کے کھانوں پر مشق آرائیاں کی جارہی ہوں۔

ثروت ممانی نے رشیدہ کے دسترخوان کا ایک ورق پلٹا، پھر دوسرا، پھر ناک پر مضبوطی سے عینک جما کر کچھ پڑھنے لگیں۔ ان کی ناک پر وہ ڈھیلی ڈھالی اور بڑے بڑے شیشوں والی عینک پھر پھسلی۔

مجھے تجسس ہوا کہ وہ کون سے کھانے کی ترکیب پڑھ رہی ہیں۔ میں زینے سے اُتر کر باورچی خانے میں آ گیا۔ خرگوش میرے پیچھے پیچھے تھا۔

ثروت ممانی کھانا بہت اچھا پکاتی تھیں۔ مگر اُن کے پکائے ہوئے چاول ہمیشہ سخت رہتے۔ چاہے وہ خشکہ پکاتیں یا بریانی، ہمیشہ دم پر آنے سے کچھ پہلے ہی وہ دیگچی چولہے پر سے اُتار لیتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے ہاتھوں کے پکائے چاول دیکھنے میں تو بہت خوبصورت اور سفید سفید موتی جیسے بکھرے ہوئے ہوتے مگر کھانے میں ہمیشہ تکلیف کا سبب بنتے۔ مگر چوں کہ ثروت ممانی خاصی

بد دماغ واقع ہوئی تھیں اس لیے کوئی اُن سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر پاتا۔

وہ بھی ایک عجیب منظر ہوتا۔ جس دن بھی چاولوں میں کسر رہ جاتی، پورا گھر کھانا کھانے کے بعد ناریل کی جُگالی کرتا پھرتا کیونکہ حکیموں کا کہنا ہے کہ سخت یا کرّے چاولوں کا توڑ ناریل ہے۔

اچھن دادی دنیا میں اگر کھانے پینے کی کسی شے سے خوف کھاتی تھیں تو وہ سخت اور کم گلے ہوئے چاول ہی ہوتے تھے، ورنہ وہ تو پائے، گردے، کلیجی، پھیپھڑے اور بٹ اور سری سب ہضم کر جاتیں اور ڈکار تک نہ لیتیں۔ اُن کا قول تھا کہ ''کلاّ چلے ستر بلا ٹلے۔''

مگر یہی اچھن دادی سخت چاول کھا کر، ناریل چباتی جاتیں اور بڑبڑاتی جاتیں کہ:

''چاول کی کنی، نیزی کی انی۔''

اب سوچتا ہوں کہ کتنا مضحکہ خیز محسوس ہوتا ہے کہ بکھرے بکھرے، سخت چاول کھا کر گھر کے سارے افراد ناریل چباتے جاتے ہیں اور آنگن میں ٹہلتے جاتے ہیں۔ ''چاول کی انی، نیزے کی انی۔''

مگر اصل میں نیزے کی انی کیا ہوتی ہے۔ یہ میں ہی جانتا تھا اور آج بھی جانتا ہوں، میں تو اُس نیزے کے لوہے اور اُسے بنانے والے لوہار تک کو جانتا ہوں۔

''آپ کیا پکا رہی ہیں؟''

ثروت ممانی ایک بد دماغ عورت تھیں۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے پھر پوچھا، ''آپ کیا پکا رہی ہیں؟''

''قیمہ بھرے کریلے۔'' اُنھوں نے بے نیازی سے کہا اور کتاب کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔

''چولہے پر رکھی ہانڈی میں تیل پک رہا تھا جس میں دو چار لہسن کے جوے جل کر کالے ہو چکے تھے۔ تیل میں سے جھاگ اُٹھ رہے تھے۔ سفید سفید جھاگ جنھیں دیکھ کر جی گھبرانے لگا۔

ثروت ممانی زور زور سے پڑھنے لگیں، جیسے سبق رٹ رہی ہوں۔

کریلے	10 عدد
قیمہ باریک	½ سیر
پیلی سرسوں کا تیل	½ سیر
ناگ پوری پیاز	2 سیر
گرم مصالحہ	1½ تولہ
کاجو	20 عدد
کشمش	2 تولہ
خربوزے کی مینگ	1½ تولہ
چرونجی	2½ تولہ
سرخ مرچ	1 تولہ
ہلدی	2 تولہ
دھنیہ	1½ تولہ
لہسن پسا ہوا	5 تولہ
ادرک پسی ہوئی	5 تولہ
نمک	حسب منشا

سب سے پہلے کریلوں کو گہرا گہرا چھیل لیں اور کچھ دیر پانی میں بھگو کر رکھیں۔ قیمے میں اگر چکنائی ہو تو اُسے بین بین کر الگ کر دیں۔ قیمہ خوب باریک ہونا چاہیے... ثروت ممانی جلدی جلدی دہرا رہی تھیں۔ مگر اُس سے آگے میں نہ سن سکا۔ مجھے کچھ ہونے والا تھا۔ میری طبیعت عجیب انداز سے بگڑ رہی تھی۔ مجھ سے باورچی خانے میں ٹھہرا نہ گیا۔

آنگن میں آم کا درخت بری طرح ہل رہا تھا۔ میں اُس کے سائے میں جا کر کھڑا ہوا تو میرے سر پر اُس کی شاخوں سے بہت سے پتے گرے۔

خود میرا دل بھی ایک سوکھے پتے کی طرح ہی لرز رہا تھا۔

یہ بات کچھ دیر بعد مجھے سمجھ میں آئی کہ میرا دل جو پتے کی طرح لرز رہا تھا وہ دراصل مجھے اپنی زبان میں کچھ بتا رہا تھا۔ وہ مجھے خبردار کر رہا تھا، میں نے اپنے دل کی اس عجیب وغریب زبان کو سمجھ لیا تھا۔

''آج نہیں— آج قیمے بھرے کریلے نہیں پکنا چاہئیں یہ اچھا شگون نہیں ہے، آج یہ کھانا ایک مخدوش کھانا ہے۔ پتہ نہیں کیا نتیجہ نکلے؟''

آہستہ آہستہ میں اس یقین کے وہم میں پوری طرح مبتلا ہو گیا کہ آج کے دن اُس وقت یہ کھانا پکنا کچھ منحوس باتوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

کھانا پکا اور مزے لے لے کر کھایا گیا۔ خود میں نے بھی کھایا مگر میرا دل لگا تار گھبراتا رہا۔ اور میری آنتوں سے نکل کر ایک چکنی روشنی لگاتار ایک روشن دھبے کی صورت میری آنکھوں کے سامنے گردش کرتی رہی۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے ہوں گے جب سامنے والے گھر سے ایک شور سا بلند ہوا اور بہّو کی ہذیانی چیخوں سے محلّہ ہل کر رہ گیا۔ یوں تو بہّو رات دن ہی چیختا رہتا تھا۔ اس کے گھر والے اور محلّے کے تمام لوگ اُس کی ان وحشی چیخوں کے عادی ہو گئے تھے۔ بہّو کی بھی ایک عجیب کہانی تھی۔

بچپن میں وہ بہت ضدّی اور شیطان قسم کا بچّہ تھا۔ ایک دن اپنے باورچی خانے میں اُودھم مچا رہا تھا۔ وہاں بُرادے کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ ایک پل کو اس کی ماں کی نظر بچی تو بہّو کے جی میں کیا آئی کہ انگیٹھی پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک نچلے طبقے کا بچّہ تھا، اور چھ سات سال کا ہو جانے کے باوجود نیکر نہیں پہنتا تھا۔

اس کے منھ سے دردناک چیخیں نکلیں، وہ رو بھی نہ سکا۔ اس کا رونا صرف چیخ بن کر رہ گیا۔ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی چیخ۔ اس کے ننھے معصوم پوشیدہ اعضا جل کر رہ گئے۔ نچلا دھڑ بری طرح جھلس گیا۔

مگر وہ مرا نہیں، وہ بچ گیا۔ لوگ کبھی کبھی بچ جاتے ہیں۔

وہ ایک بڑی موت کو گلے لگانے کے لیے کمینی اور گھٹیا قسم کی موت کو حقارت سے ٹھوکر مار دیتے ہیں۔

بتو اب چالیس سال کا تھا۔ اُس کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ چھ سات سال کی عمر میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں ننگا گھوما کرتا اور رات دن چیخیں مارا کرتا، بالکل اُسی طرح جیسے وہ آج بھی جلتی ہوئی انگیٹھی پر بیٹھا ہوا ہو۔

اس کی ماں نہ جانے کب کی مر چکی تھی۔ اور اُس کا باپ جو ایک بڑھئی تھا، وہ اُس کی اور خود اپنی زندگی سے عاجز آ چکا تھا۔

محلے والوں کے لیے بتو ایک تفریح کا موضوع تھا۔ محلے کے لونڈے، دروازے میں سے جھانکتے اور ''بتو انگیٹھی، بتو انگیٹھی'' کہہ کر اُسے چڑا چڑا کر بھاگ جاتے۔ بتو کی وحشی چیخیں بڑھ جاتیں اور اُس کا باپ ہاتھ میں آری یا برما لیے، گالیاں بکتا ہوا بچوں کے پیچھے دوڑتا۔ بچے اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی قبروں کے پیچھے کہیں چھپ جاتے۔ محلے کی عورتیں بھی بتو کے جنسی اعضا جل جانے کا ذکر چٹخارے لے لے کر اور ہنستے ہوئے کرتیں۔

آج بتو کی ہذیانی چیخیں اچانک بہت بلند ہو گئیں۔ غیر معمولی طور پر بلند۔ محلے میں شور ہو رہا تھا، لوگ اُس کے گھر پر جمع تھے۔ پھر وہ چیخیں اچانک تھم گئیں، جیسے ایک زبردست طوفان اچانک رُک گیا ہو۔

میں بھاگ کر چھت پر جا کر کھڑا ہو گیا، جہاں سے بتو کا گھر صاف نظر آتا تھا۔ لوگ زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ آخر کئی لوگوں نے مل کر خستہ حال دروازہ توڑ ڈالا۔ عورتوں اور مردوں کی ایک بھیڑ گھر میں گھستی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ بتو انگیٹھی کے باپ نے تنگ آ کر پہلے تو بتو کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس کے بعد اُس آری سے، جس سے وہ لکڑی کاٹا کرتا تھا، اپنی گردن ریت ڈالی۔ مجھے یاد ہے کہ اُس وقت اس کے گھر کی موری سے کچھ کتھئی رنگ کا سیال بہہ کر نالی میں گر رہا تھا۔ تب تو نہیں، لیکن اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کٹی ہوئی گردن سے بہتا ہوا خون ہو گا۔

کچھ ہی دیر بعد ساری گلی پولیس والوں کی خاکی وردی سے بھر گئی۔ میں چھت سے اُتر آیا۔ سارے گھر میں اِسی واقعہ کو لے کر چہ میگوئیاں چل رہی تھیں۔ میں بتو انگیٹھی کو دیکھنے جانا چاہتا تھا۔ مگر

گھر میں کسی نے اس کی اجازت نہیں دی، مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میں کبھی قریب سے ہو انگیٹھی کو دیکھ نہیں سکا۔ اپنی زندگی میں صرف ایک بار میں نے اُسے دیکھا تھا، جب وہ نہ جانے کیسے گھر سے باہر نکل کر گلی میں آ گیا تھا۔ اور لونڈے اُسے چڑا رہے تھے۔ یا اُس پر مٹی کے ڈھیلے پھینک رہے تھے۔ اُس وقت وہ چیخیں نہیں مار رہا تھا، اُس کے تن پر صرف میل سے چیکٹ، پھٹی ہوئی ایک بنیان تھی۔ میں نے غور سے اُس کے نچلے دھڑ کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں ایک خاموش مُردہ سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔

اُس رات مجھے نیند نہ آئی۔ ایک نا قابل فہم دہشت مجھ پر چھائی رہی۔ گھر اور دہشت تو محلے پر بھی چھائی رہی۔ میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا، بلکہ میرا علم مکمل طور پر صحیح ثابت ہوا۔ مجھے پکا یقین ہو گیا کہ اس بھیانک حادثے کا سبب آج دوپہر میں میرے باورچی خانے میں پکنے والے قیمے بھرے کریلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

مجھے اپنی اس خطرناک صلاحیت سے اتنا خوف محسوس ہوا کہ مجھ پر کپکپی سی چڑھنے لگی۔

اب اُس خطرناک قوت کا بھید مجھ پر کھل گیا جو لگاتار اور بے تعداد مقدار میں اُلٹیاں کرتے رہنے کے بعد مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔ کھانا اور اُس کے مختلف اقسام اب میرے لیے الجبرے کے اُن الجھے اور مشکل سوالات کی طرح تھے۔ جنھیں میں دیکھے بغیر ہی حل کر سکتا تھا اور جن کے آخر میں کسی ہندسے کے آگے پیچھے + کی یا - کی علامت لگا کر اُسے صحیح صحیح حل کر کے ثابت کر دینا میرے لیے ایک خوفناک مگر گویا چٹکیوں کا کھیل تھا۔

اُس زمانے میں مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کرہ ارض ایک معمولی سے نقطے سے شروع ہوا تھا۔اب مجھے یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ واقعی یہ دنیا سفید کاغذ پر سرمئی پنسل سے اگایا گیا ایک نقطہ ہی تھا۔

پھر جو اس نقطے نے پھیلنا شروع کیا اور شیطانی آنت کی طرح جو روپ اور حجم اختیار کیا اُس کے بارے میں یہاں کچھ بھی لکھنا محض ایک تضیع اوقات ہے۔

حالانکہ دنیا میرے لیے کوئی بہت بڑا معمّہ نہیں ہے۔ (دنیا میں رہنے والے انسان معمّہ ہیں اور خود میں معمّہ ہوں)

ایک بے تکے نقطے کا بے تکے انداز میں پھیلتے رہنے سے مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک مرض کی مانند ہے۔ ایک کینسر کی طرح۔ مگر اس نقطے کے اندر جو ایک لامحدود حجم والا بھورے رنگ کا لفافہ بن چکا ہے، اُس میں عورت مرد رہتے ہیں۔ جانور رہتے ہیں، کیڑے مکوڑے رہتے ہیں اور بچے رہتے ہیں۔ جی ہاں بچے بھی۔ اور اسی دنیا میں جہاں پہاڑ، سمندر، آتش فشاں، جنگل، ندیاں اور ریگستان ہیں۔ وہیں ایک باورچی خانہ بھی تو اسی نقطے میں ہے۔ باورچی خانہ جیسا کہ میں بار بار کہتا ہوں (کیونکہ تکرار مجھے پسند ہے، مجھے بھی اور اس دنیا کو بھی) کہ وہ ایک انتہائی بھیانک اور ناخوشگوار مگر انسانی آنتوں کے لیے شہوت سے بھری ایک جگہ کا نام ہے۔ انسانی آنتوں کی شہوت اپنی ماہیت میں اُس کے پوشیدہ اعضاء کی شہوت سے زیادہ خوفناک ہے۔ اور کیا عجب اس نقطے (کرۂ ارض) کو

بڑھانے اور پھیلانے میں شاید سب سے زیادہ مدد اسی شیطانی مقام نے کی ہو اور مجھے تو اب مستقبل کی تمام بدشگونیوں کی علامتیں باورچی خانے سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔

اس لیے دنیا کے بڑھتے، پھیلتے رہنے یا فنا ہونے وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میں اس نقطے پر ایک پسّو کی مانند جاکر چپک جانا چاہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میری منحزاتی یادداشت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ دنیا نام کے کاغذ پر اگا گئے گئے اُسی نقطے تک پہنچ جائے۔ میں اپنے جسم سے بھٹک گئے ایک خلیے کی مانند، ہوا میں اُڑتے ہوئے یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا نے انسانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ یا یہ کہ انسانوں نے دنیا کے ساتھ کیا کمینہ پن کیا، مگر افسوس کہ میرا حافظہ زیادہ سے زیادہ میرے بچپن تک ہی جاکر رُک جاتا ہے اور پھر ایک ایسی ذہنی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس کا انجام میرے سر میں بھیانک درد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

میرا بچپن؟

میں اپنے بچپن کو دوبارہ اس لیے نہیں حاصل کرنا چاہتا، کہ اُسے ایک بار پھر سے جینے لگوں۔ میں اب اُس تک اس لیے رسائی حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ اُسے سمجھ سکوں۔ جس طرح ذرا بڑے ہو جانے پر بچے اپنی پرانی گیند کو توڑ کر اُس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پرانے کھلونوں کو توڑ کر اُس کے انجر پنجر ایک کر کے رکھ دیتے ہیں تاکہ سمجھ سکیں کہ چابی والا بندر دودھ کی شیشی منھ میں کس طرح لے کر پیتا تھا۔

میرا بچپن؟ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے؟

میں نے اپنی عمر رسیدہ بدرنگ کھال کو بار بار ساٹھ کی دہائی کے محمد رفیع کے فلمی گانوں کی نوکوں سے ادھیڑا اور چھیلا۔ ابن صفی کے ناولوں کی دھاردار قینچی سے باطن کے یہ موٹے موٹے بے رحم دھاگے اور سلیاں کاٹ ڈالے۔ پرانے دوستوں کے ساتھ پرانی باتیں کرتا رہا اور میرے حافظے کو ان سب کی کمک ملتے رہنے کے باوجود، بچپن اس طرح نہ ملا جس طرح میں چاہتا ہوں۔ حالانکہ وہ میرے اندر ہی کہیں ہے۔ کھال کے نیچے، ہڈیوں کے گودے میں، کہیں چپکا ہوا، گھر کے کسی تاریک

گوشے میں پڑے پلاسٹک کی گیند کے ایک ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کی طرح، اپنے بچپن کے ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پر جب توجہ مرکوز کرتے ہوئے غور وفکر کرتا ہوں تو ایک بات سامنے ضرور آتی ہے اور وہ یہ کہ آہستہ آہستہ میرے اندر ایک قسم کی کینہ پروری پیدا ہوتی جارہی تھی۔ ایک خطرناک قسم کا کینہ، جس کے اندر ایک گھٹیا قسم کا تشدد پوشیدہ تھا۔ دوسروں کو ایذا پہنچانے کی ایک ناقابلِ فہم خواہش اکثر میرے اندر پیدا ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً بار بار میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے پاس بیٹھے افراد کے جسم میں کوئی باریک سی سوئی چبھو دوں، یا کھانا پکاتے ہوئے کسی شخص کے کھانے میں چپکے سے تھوک دوں، اور بھی اسی قسم کی گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکتیں کرتا پھروں۔

میں مثال کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر کروں گا، کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ ثروت ممانی اور فیروز خالو آپس میں بہت بے تکلف ہوتے جارہے ہیں اور ماموں اور ممانی کے آپسی جھگڑے ضرورت سے زیادہ بڑھتے جارہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک رات ماموں نے ممانی کو چپلوں سے مارا پیٹا بھی۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ ثروت ممانی بے حد بددماغ قسم کی عورت تھیں اُن کے کوئی اولاد نہ تھی مگر میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ مجھ سے چڑتی تھیں۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ جس کا مجھے علم نہیں۔ انسان کو وجہوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہیں پڑنا چاہیے۔ بس تیل دیکھنا چاہیے، اور تیل کی دھار۔ اگرچہ اس کارآمد اُصول پر میں خود بھی قائم نہ رہ سکا۔

اُس شام باورچی خانے سے اُس مسالے کی بُو آرہی تھی جس کے ساتھ مچھلی بھونی جاتی ہے۔ مجھے مسالے والی مچھلی بہت پسند ہے مگر میری چھٹی حس نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ آج یہ اچھا شگون نہیں ہے۔ کوئی بھی بڑا واقعہ کسی کے بھی ساتھ پیش آسکتا ہے۔ مگر میں نے اُس رات مچھلی خوب مزے لے لے کر کھائی۔ مچھلی ثروت ممانی نے پکائی، اگر انجم باجی پکاتیں تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ رات کا کھانا ساتھ خیریت کے کھالیا گیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ یا حادثہ پیش نہیں آیا۔ میری چھٹی حس بھی سوگئی۔

وہ شاید اپریل کے شروع کے دن تھے۔ باہر والے دالان سے ملحق ایک آڑ میں چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کی چھت لکڑی کی کڑیوں اور شہتیروں کی تھی۔ ان اطراف میں ان دنوں شہد کی مکھیاں جگہ جگہ اپنے چھتے بناتی پھرتی تھیں۔ برآمدے میں ایک شہتیر پر شہد کی مکھیوں نے بہت بڑا سا چھتہ بنا

رکھا تھا۔ تیز بینگنی رنگ کا بے حد نفاست اور ناپ تول کر بنایا گیا چھتہ جو کبھی کبھی چھت پر فانوس کی طرح لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔ گھر میں کسی کی ہمت نہ تھی کہ اُسے چھیڑے۔

برآمدے کے سامنے باورچی خانے کا عقبی روشندان کھلتا تھا۔ جس سے یہ چھتہ صاف نظر آتا تھا۔ رات کے تقریباً دو بج رہے تھے اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ بے چینی سی تھی۔ گھر کے تمام افراد اِدھر اُدھر دُبکے ہوئے سو رہے تھے۔ مجھے کچھ میٹھا کھانے کی خواہش ہوئی۔ رات میں اکثر میں چھپ کر میٹھا کھاتا تھا جس کے لیے مجھے باورچی خانے میں جانا پڑتا تھا۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی شکر ہی پھانک لوں۔ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے میں بستر سے اُٹھتا ہوں اور بلّی کی چال چلتے ہوئے باورچی خانے تک پہنچتا ہوں۔ بہت آہستگی اور کمال احتیاط سے کام لیتا ہوا میں باورچی خانے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ اندر داخل ہوتا ہوں۔ اندھیرے باورچی خانے میں مچھلی کی بساندھ بھری ہوئی ہے۔ بغیر بتی جلائے، اندازے سے میں شکر کے ڈبے تک پہنچتا ہوں۔ روشندان میں سے پام کا ایک بڑا سا پتہ اندر کو چلا آیا ہے جو اپریل کی رات میں چلنے والی خوشگوار ہوا میں آہستہ آہستہ لرز رہا ہے۔

میں شکر کا ڈبہ کھولتا ہوں، شکر کو مٹھی میں دبائے ہوئے اُسے منھ میں ڈالنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ایک عجیب سی آہٹ سنائی دیتی ہے۔

میرا کن کٹا خرگوش؟

لوسی یا جیک؟

کوئی بلّی؟

یا وہ سیاہ ناگ؟

میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ میری بند مٹھی کھل جاتی ہے۔ ساری شکر اندھیرے میں فرش پر گر جاتی ہے۔

مگر نہیں یہ انسانی سانسیں ہیں اور انسانی سرگوشیاں۔

کوئی برآمدے میں ہے۔

میں ہمت سے کام لیتا ہوں اور ایک بڑے سے پتیلے پر پیر رکھ کر روشندان سے جھانکتا ہوں۔ پام

کا پتہ میری آنکھوں اور ناک پر چبھنے لگتا ہے۔ میرے پورے چہرے پر سخت قسم کی کھجلی ہونے لگتی ہے۔ جس کو برداشت کرتے ہوئے اُچک کر میں دیکھتا ہوں۔

مدھم سی چاندنی میں دو سائے آپس میں اس طرح گتھے ہوئے نظر آئے جیسے کشتی لڑ رہے ہوں۔ ایک پل کو اُن کے چہروں پر خاص زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔ میں اُنھیں پہچان لیتا ہوں۔

وہ ثروت ممانی اور فیروز خالو ہیں۔

میرے اندر ایک زبردست قسم کی نفرت کا بھنور پیدا ہو گیا۔ میرے اندر کینہ اور بغض اپنی حدوں کو پار کرنے لگے۔ میں سراپا تشدد بن گیا، مگر کچھ نہ کر پانے کی سکت کے احساس نے میرے پورے جسم پر کپکپی طاری کر دی۔

ٹھیک اُسی وقت چاندنی رات میں مجھے وہ نظر آیا۔ وہ چھتہ جو ٹھیک اُن دونوں کے سروں پر ہی لٹک رہا تھا۔

میں کانپتے ہوئے پیروں سے پتیلے سے نیچے اُترا۔ تاریک باورچی خانے میں انگل سے مٹی کی اُس ہانڈی تک پہنچا جس میں نمک کے ڈلے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے نمک کا ایک بڑا سا ڈلہ ہاتھ میں دبایا اور دوبارہ اُس پتیلے پر چڑھ گیا۔ اس بار میں کانپ نہیں رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر میں خود کو بہت طاقتور محسوس کر رہا تھا۔

دو تاریک سائے دو جانوروں کی مانند ایک دوسرے سے گتھے ہوئے اور لپٹے ہوئے ہیں۔ میں پام کے پتے کو ایک ہاتھ سے تھوڑا سا ہٹاتا ہوں۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے پر اپنا نشانہ سادھتا ہوں۔ سانس روک کر اپنے داہنے ہاتھ میں اپنے جسم اور روح کی تمام طاقت کو منتقل کرتا ہوں اور پھر نمک کا ڈلہ چھتے پر زور سے پھینک کر مار دیتا ہوں۔ ہلکی سی آواز آتی ہے۔ جس کے بعد ایک عجیب اور پُراسرار سی بھنبھناہٹ گونجتی ہے۔ جیسے موت غصّے میں بھری سرگوشیاں کر رہی ہو۔

اُن دونوں کی ہذیانی چیخوں سے سارا گھر جاگ جاتا ہے۔ مکھیاں دونوں پر بری طرح چمٹ گئی تھیں۔ چاندنی رات میں مکھیوں کے سائے بھیانک تاریک دھبوں کی طرح اُڑتے اور گردش کرتے پھر رہے تھے۔

غیض وغضب سے بھری شہد کی مکھیاں اُن کے کپڑوں میں گھس گئی تھیں۔ فیروز خالو کو میں نے بھاگتے ہوئے زینے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ چھت پر دوڑ رہے تھے، شاید منڈیر سے برابر والے گھر یا گلی میں چھلانگ لگانے کے لیے۔ ان کی قمیض اور پتلون اُن کے کاندھوں پر تھی۔ وہ بار بار اپنے نچلے حصّے پر اِدھراُدھر ہاتھ مار رہے تھے شاید اُن کے پوشیدہ اعضا کو مکھیوں نے ڈنک مارے تھے۔

ثروت ممانی بری طرح چیخیں مار رہی تھیں اور دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹیں لگا رہی تھیں۔ کبھی وہ اُٹھ کر کھڑی ہوتیں اور بگولے کی طرح چکرانے لگتیں۔ اُن کے بال کھل کر اُن کے گھٹنوں تک جا رہے تھے۔ پھر زمین پر گر کر لوٹیں لگانے لگتیں۔ میں نے اُنھیں اپنا جمپر اُتارتے ہوئے دیکھا، ان کی غیر معمولی طور پر بڑی اور بھاری بھاری لٹکی ہوئی چھاتیوں کی پرچھائیں کبھی زمین پر پڑتی، کبھی دیوار پر۔ اُن کے بال کھل گئے تھے۔ ان کا چہرہ اُن میں چھپ گیا۔ ان کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کوئی خوفناک تانڈو ناچ ناچ رہی ہوں۔ ایک چڑیل، ایک آسیب کی مانند۔ ان کی چیخیں کبھی بھاری اور طویل ہو جاتیں اور کبھی پتلی، باریک اور مختصر — وہ کسی غیر انسانی شے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بالکل خاموش ہو کر وہ زمین پر ایک وزنی درخت کی مانند آ گریں۔ مجھے لگا کہ وہ مر گئیں۔

گھر کے تمام افراد خوف زدہ سے اِدھر اُدھر کھڑے یا چھپے ہوئے تھے۔

آہستہ آہستہ وہ خوفناک بھنبھناہٹ مدھم پڑتی گئی۔ مکھیوں کے سائے سمٹنے لگے۔ اپریل کی ہوا پھر چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ثروت ممانی اب تقریباً بالکل ننگی فرش پر شاید بے ہوش پڑی تھیں۔ گھر کے دوسرے لوگ اِدھر کو آنے لگے۔ میرا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں یہیں، اسی جگہ، اسی باورچی خانے میں مر جاؤں گا۔

مگر نہیں، اچانک پھر ایک مکّار ہمت اور چالاکی نے مجھے نہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر سہارا دیا۔ میں تیزی سے باورچی خانے سے نکل کر برآمدے اور آنگن میں اکٹھا دوسرے افراد میں جا کر گھل مل گیا۔ اس افراتفری میں کسی نے بھی مجھے وہاں سے نکلتے نہیں دیکھا۔

یہ تو خیر ہوئی کہ چھتہ ٹوٹ کر نیچے نہیں گرا تھا۔ نمک کے ڈھیلے سے وہ شاید صرف ہل کر رہ گیا ہوگا۔ اسی لیے مکھیاں اپنا بدلہ لینے کے بعد دوبارہ چھتے پر جا کر چپک گئیں تھیں۔ نور جہاں خالہ نے

ثروت ممانی کے ننگے بدن پر اپنا سوتی دوپٹہ ڈال دیا تھا۔ مگر دوپٹہ ڈالنے سے پہلے میں نے اُن کے سینے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں اب چھاتیاں نہ تھیں۔ وہ سوج کر ایک بہت بڑے سے تھیلے میں بدل چکی تھیں۔ مجھے آٹالانے والا تھیلا یاد آ گیا۔ تب اُنھیں اُٹھا کر اندر لایا گیا۔ ان کا پورا چہرہ سوج کر کپّا ہو گیا تھا۔ آنکھیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ ان کے ہونٹ کسی درندے کی تھوتھنی کی طرح نیچے لٹک رہے تھے۔ چہرہ اس قدر لال تھا جیسے کوئی بڑا سا انگارہ، مجھے یہ ہرگز علم نہ تھا کہ شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے اس حد تک معاملہ بگڑ جائے گا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اگر فوراً اسپتال نہ لے جایا گیا تو وہ مر بھی سکتی تھیں۔

''مر جانے دو، مر جانے دو اس کتیا کو۔'' ماموں چیخے۔ سب نے جھپٹ کر ماموں کا منھ بند کر دیا، مگر وہ دوبارہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگے۔

''پوچھو۔ پوچھو اِس چھنال سے، یہ کس کے ساتھ منھ کالا کر رہی تھی۔ کون چھت پر بھاگا تھا۔

انجم باجی نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

''چلو گڈو میاں، تم جا کر سو جاؤ۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔'' انجم باجی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر والے دالان میں لے آئیں۔ انھوں نے پیار سے مجھے سو جانے کے لیے کہا۔ میں نے اُن کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت اُداس تھیں۔ اتنی اُداس کہ ان کے چہرے کی پاکیزگی تک اس افسردہ رنگ کی چھوٹ میں کہیں گم ہو گئی تھی۔

اور میں سو گیا۔ میں واقعتاً سو گیا۔ اتنا بڑا شیطانی کارنامہ انجام دینے کے بعد میں بے خبر سو گیا۔

دوسرے دن کی صبح غیر معمولی طور پر سونی اور خاموش تھی۔ پتہ چلا کہ ثروت ممانی بچ تو گئی تھیں مگر اب وہ اس گھر میں نہیں تھیں۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ وہ علاج کے لیے بنگلہ دیش اپنے مائیکے کے کچھ رشتہ داروں کے یہاں چلی گئی تھیں۔

اس کے بعد ثروت ممانی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ چند دنوں پہلے کہیں سے یہ اُڑتی اُڑتی خبر آئی تھی کہ پاکستان میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہ شاید بنگلہ دیش سے پاکستان منتقل ہو گئی تھیں۔

فیروز خالو جو محلے میں ہی رہتے تھے۔ اور ہمارے نسبتاً دور کے رشتہ دار تھے، اُن کا بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ وہ تو اس طرح غائب ہوئے جیسے اُنھیں زمین کھا گئی ہو۔ ان کی بیوی کا اس واقعے سے پہلے ہی

انتقال ہو چکا تھا۔ اور بچے اپنی ننہیال میں رہتے تھے۔

جہاں تک ماموں کا سوال ہے وہ ایک عرصے تک گم سم رہے۔ پھر انھوں نے اپنے آپ کو مقدموں اور کچہری کی دنیا میں پوری طرح غرق کر دیا۔

یہ سب میں نے بڑی مشکل سے یاد کر کے لکھا ہے۔ اور اب مجھے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ سب جتنا بھیانک تھا اتنا ہی مضحکہ خیز بھی۔ یعنی یہ کہ دو نفس جب جنسی عمل میں مشغول ہوں تو اُن پر شہد کی مکھیوں کے ڈنگارے کا حملہ...! اور فیروز خالو کے پوشیدہ اعضا پر ٹھیک اُس وقت ایسی مصیبت جب وہ اعضا بذاتِ خود دوسرے جہانوں کی سیر کر رہے ہوں۔ بہر حال مضحکہ خیزی اور بھیانک پن ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں۔ ایک کے ساتھ دوسری کی موجودگی ناگزیر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ بھوت کو ہی لے لیجیے۔ وہ ڈراؤنا اور مسخرہ ایک ساتھ ہے۔ بس بات یہ ہے کہ آپ کس پہلو پر زور دیتے ہیں۔ میرے اندر اُس زمانے میں دوسرے کو ایذا پہنچانے کا خبط اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ کسی بھی قسم کے احساسِ جرم وغیرہ سے میرا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور ضمیر کس چڑیا کو کہتے ہیں، اس کا کوئی علم کم از کم اُس زمانے میں ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں اگر یہ حرکت نہ کرتا تب بھی کچھ نہ کچھ ہو کر رہتا۔ ایک غلط وقت اور غلط دن مسالے دار مچھلی کا پکنا گُل کھلا کر ہی رہتا۔ یہ میرا ایمان اور ایقان ہے۔

یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے اندر مجرمانہ جراثیم بہت بچپن سے ہی پل رہے تھے۔ مگر ایک ایسا مجرم جس کی سزا جس عدالت میں طے ہونا تھی وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا ایک عرصے تک بلکہ شاید تا زندگی میں اسی طرح چھٹے بیل کی طرح گھومتا رہوں گا۔ اور اپنے اوپر اسرار کے اتنے دبیز اور سیاہ پردے ڈالے رکھوں گا کہ میرا باطنی وجود اپنے آپ میں ایک اسرار، ایک بھید، ایک خفیہ ریاضی میں بدل جائے گا۔

اور یہ سب ہونے میں بہت دیر نہیں ہے۔ اگر میں ناول لکھنے کے قابل ہوتا تو میرے کھونٹے فطری طور پر آہستہ آہستہ سرک کر نیچے گرتے جاتے مگر مقدموں کی اپیلیں، عرض داشتیں اور عدالتوں میں ہونے والی بحثیں، یہ سب تو اپنے آپ میں خود سیاہ نقابیں ہیں۔ ہر وکیل، ہر گواہ اور ہر منصف ایک

نقاب پوش ہے۔

میں جو یہ سب لکھ رہا ہوں (لکھ بھی رہا ہوں یا بڑبڑا رہا ہوں؟) تو یہ بھی ایک اپیل، ایک عرض داشت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کو کس عدالت میں داخل کرنا ہے یہ ابھی مجھے نہیں معلوم۔ بس میں اسے ہاتھ میں پکڑے پکڑے بھٹک رہا ہوں۔ اپنی عدالت کی تلاش میں، جب بھی مجھے مل جائے گی میں وہاں اسے داخل کر کے خاموشی کے ساتھ اپنے سارے مکھوٹے گرادوں گا۔ میں وہاں عدالت کے سامنے ننگا ہو جاؤں گا۔ میں یہ جسم تک اُتار کر پھینک دوں گا۔

مئی کا تپتا ہوا اور لُو کے جھکڑوں سے ہلتا اور کانپتا ہوا مہینہ آ پہنچا۔ یہ بڑا شاندار اور پُر وقار گرمی کا زمانہ تھا۔ ہر شے تپ رہی تھی۔ گرمی ہر شے کو آگ کی مانند جلا کر راکھ کر دینے کے درپے تھی۔ ہر شے کو پوتر کرنے کے لیے تیار۔ یہی کام تو آگ کرتی ہے۔

انجم باجی کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ شادی، برسات کا موسم گزر جانے کے بعد ہونا طے پائی تھی مگر یہ شادی آفتاب بھائی کے ساتھ نہیں ہو رہی تھی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ شادی کہیں اور ہو رہی تھی اور اُن کا ہونے والا شوہر سعودی عرب میں ملازمت کرتا تھا۔ میں نے یہ واضح طور پر محسوس کیا کہ انجم باجی زیادہ تر روتی رہتی ہیں اور اپنے بیاہ کے کاموں میں رتی برابر بھی دلچسپی نہیں لیتیں۔ مجھے نہ جانے کیوں اس سے بڑی طمانیت سی محسوس ہوتی۔

ایک دن میں نے اُن سے پوچھا تھا:

''آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گی؟''

وہ پہلے تو کچھ نہیں بولیں، پھر میری گود میں بیٹھے کن کٹے خرگوش کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں لینے لگیں۔

''آپ میری وجہ سے روتی ہیں نا!''

انجم باجی نے خرگوش زمین پر اُتار دیا اور مجھے خالی خالی بیگانی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

جون کا مہینہ آتے آتے میں کچھ اور بڑا ہو گیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی دن بلکہ کسی بھی لمحے اچانک بڑے ہو جاتے ہیں، تبدیل ہو جاتے ہیں اور آپ کو اپنے بڑے ہو جانے یا بدل جانے کا

احساس تک نہیں ہوتا۔ تبدیلی کا عمل اتنا ہی پُراسرار ہے جتنا کہ زمین کا گردش کرنا، جس کا انسان کو پتہ تک نہیں چلتا۔

میں کچھ اور بڑا ہو گیا یا میرے جسم میں ایک آدھ انچ عمر اور بڑھ گئی۔ ان دنوں مجھے جانوروں سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ سنبل طوطا اور کن کٹا خرگوش تو تھے ہی۔ ہمارے گھر میں کہیں سے گلہری کے دو بچے آ گئے تھے۔ میں نے ضد کر کے انھیں تقریباً پال ہی لیا۔ میں ان کو جوتے کے ڈبے میں روئی بھر کر رکھتا تھا جس سے کہ وہ اُن کا گھونسلہ بن جائے۔ چھوٹی سی تام چینی کی کٹوری میں دودھ دیتا تھا اور جو کچھ بھی، دانہ دُنکا وہ کھاتے تھے۔ نور جہاں خالہ نے اُن کے نام بھی رکھ دیے تھے۔ لوسی اور جیک۔ مگر جب وہ بڑے ہوئے تو انسانوں سے خاصا ہل جانے کے باوجود انھوں نے آم کے درخت کے ایک کھوکے میں اپنا باقاعدہ گھونسلہ بنا لیا۔ رات میں وہ وہاں سوتے تھے اور دن میں سارے گھر بلکہ بستروں تک پر گھوما کرتے تھے۔

جون کے اواخر میں جب ہلکی ہلکی بارش شروع ہوئی تو دونوں کو ایک عجیب مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ بارش کی بوندیں جیسے ہی ٹین پر گرتیں وہ دالے پرسے اُچھل کر اپنی خوبصورت دُمیں سر پر رکھ کر بھاگتے ہوئے درخت کے کھوکے میں گھس جاتے اور پھر وہاں سے اپنا منھ باہر نکال کر بارش دیکھا کرتے۔

ویسے ابھی مانسون نہیں آیا تھا اور اُمس کا یہ عالم تھا کہ سارا بدن گیلا اور چکنا ہو گیا تھا۔ اب کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسانی ارتقا کے ابتدائی پڑاؤ کا تجربہ تھا۔ مجھے اپنی کھال مچھلی کی کھال کی طرح لگتی تھی۔ پسینہ سوکھتا ہی نہ تھا۔ جو شخص بھی قریب سے گزرتا، تو پسینے کی بدبو سے ناک سڑا کر رکھ دیتا۔ زیادہ تر افراد دالانوں سے نکل کر رات میں آنگن میں ہی سویا کرتے۔

ایسی ہی اُمس بھری ایک شام کا ذکر ہے۔ میں چھت سے پتنگ اُڑا کر نیچے آیا۔ باورچی خانے میں ایک کھٹی میٹھی سی خوشبو جو مجھے بدبو محسوس ہوئی، آ رہی تھی۔ میں اندر گیا۔

نور جہاں خالہ چولہے کے سامنے بیٹھی تھیں اور ایک ہانڈی میں بار بار کفگیر چلا رہی تھیں۔

''کیا پک رہا ہے؟''

''آم رس۔'' نور جہاں خالہ نے اسی طرح کفگیر چلاتے چلاتے جواب دیا۔ اُن کے کپڑوں سے

پسینے اور آم کی ملی جلی بو نے میرا جی متلا کر رکھ دیا۔ مجھے نہ آم پسند ہے اور نہ اُس سے بنی کوئی دوسری شے۔

میں جیسے ہی واپس جانے کے لیے مڑا مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ دونوں وقت مل رہے تھے، آسمان پر ایک پیلا سا غبار تھا، جیسے آندھی آتے آتے رہ گئی ہو۔ ''نہیں ٹھیک نہیں ہے۔ آم رس آج نہیں پکتا تو اچھا تھا۔'' میں دھیرے سے بڑبڑایا۔ میری وہ منحوس چھٹی حس شاید جاگنے والی تھی۔ مگر پھر میں نے خود ہی اپنی توجہ زبردستی کہیں اور مرکوز کر دی۔ میں نے لوسی اور جیک کو چمکار کر زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

دونوں اپنی دُمیں سر پر اُٹھائے دوڑے چلے آئے۔ میں تھوڑی دیر تک اُن سے کھیلتا رہا۔ پھر جیک کچھ سونگھتا ہوا باورچی خانے میں چلا گیا اور لوسی چھوٹے چچا کے پلنگ کے پائے پر چڑھنے اُترنے لگی۔

رات ہوگئی، لالٹین جل گئی۔ مجھے بھوک لگنے لگی۔ کھانا تو پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ بس آم رس کا انتظار تھا۔ وہ بھی اب پک گیا تھا۔

میں باورچی خانے میں دیکھ رہا تھا کہ نور جہاں خالہ نے آم رس کی ہانڈی کو چولھے سے اُتار لیا ہے۔

جیک اُن کے پاس ہی اپنے اگلے دو پنجوں میں کچھ دبائے کُتر رہا تھا۔ نور جہاں خالہ نے چولھے میں سے سلگتی ہوئی لکڑی نکالی اور وہیں بیٹھے بیٹھے لوٹے سے پانی ڈال کر اُسے بجھا دیا۔

جلتی سلگتی لکڑی پر جیسے ہی پانی گرا۔ سن سن کی ایک تیز آواز باورچی خانے میں گونجی۔ انسان اس آواز سے صدیوں سے مانوس ہیں مگر بے زبان جانور نہیں۔ جیک اس (بھیانک آواز؟) آواز سے بری طرح خوف زدہ ہو کر حواس باختہ ہوتے ہوئے زور سے اُچھلا اور چولھے میں جا گرا۔ چولھے میں تازہ تازہ بھوبھل تھی جس کی تہہ میں انگارے دہک رہے تھے۔

وہ ''چیں چیں'' کی بڑی دردناک آوازیں تھیں۔ سب چولھے کی طرف دوڑے، میں زور زور سے رونے لگا۔

چھوٹے چچا نے اُسے کسی طرح چولھے سے باہر نکالا۔ جیک چیں چیں کرتا ہوا، لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا

ہوا، فرش پر ادھر اُدھر چکر لگا رہا تھا۔ اس کے ننھے ننھے پیر پوری طرح جل گئے تھے اور قصائی کی دوکان پر رکھے چھیچھڑوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ اس کی جلد پر سے سفید دھاریاں غائب تھیں۔ اس کی دُم جل کر ٹوٹ گئی تھی۔ اور وہ ایک گلہری نہ ہوکر ایک بدنما، خارش زدہ اور گندا، دُم کٹا چوہا نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح اچھلتا کودتا رہا، پھر خاموش اور نڈھال ہوکر فرش پر پڑ گیا۔ چھوٹے چچا نے اُسے ہاتھ سے چھوا، میں نے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں غائب تھیں۔ سر کی جلی ہوئی کھال آگے کو لٹک رہی تھی۔

''دودھ لاؤ، دودھ۔'' انجم باجی نے کسی سے کہا، مگر نہیں سب بیکار تھا۔ جیک نے اس سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔

باورچی خانے میں سناٹا ہوگیا۔ اُس رات کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ میں تمام رات پلنگ پر لیٹے لیٹے روتا رہا۔ لوسی پتہ نہیں کہاں تھی؟

کوئی میرے پاس آنے کی یا دلاسہ دینے کی ہمت نہ کرسکا۔ مگر شاید آدھی رات رہی ہوگی جب میرا خرگوش آکر میرے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی میرے پاؤں سے رگڑ رہا تھا۔ پتہ نہیں کب مجھے نیند آگئی۔

صبح میں دیر سے اُٹھا۔ چھوٹے چچا نے مجھے بتایا کہ لوسی بھی مرگئی۔

فجر کی نماز کے بعد جب چھوٹے چچا مسجد سے لوٹ رہے تھے تو اُن کی نظر بے خیالی میں بجلی کے کھمبے کی طرف اُٹھ گئی۔ انھوں نے دیکھا اوپر بجلی کے کھمبے سے ہوکر جہاں بہت سے تار جاتے ہیں، وہاں اُن بجلی کے تاروں میں وہ جھول رہی تھی، مردہ اور اکڑی ہوئی۔

اس بار میں رویا نہیں، بس خاموشی سے زینے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر چلا گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ جانور خودکشی کرتے ہیں یا نہیں۔ مگر آج اس بات پر مجھے پورا یقین ہے کہ لوسی نے خودکشی کی تھی۔

اس واقعے کے بعد میں اپنی اس خطرناک صلاحیت سے بے حد خوف زدہ اور سراسیمہ رہنے لگا۔ میں خدا سے دُعا مانگتا کہ وہ مجھ سے یہ صلاحیت، یہ پُراسرار حس چھین لے۔ میں نے کافی عرصے تک باورچی خانے کی جانب رُخ بھی نہ کیا۔ میں اس کے قریب سے بھی گزرتا تو ناک بند کرکے کہ کہیں

کوئی خوشبو نہ آجائے اور پھر کوئی حادثہ، کوئی برا واقعہ نہ رونما ہو جائے۔ مگر اب مجھے یہ اپنا بچپنا اور حماقت ہی نظر آتے ہیں۔ اب تو یہ میرے لیے بہت عام سی اور فطری بات ہو چکی ہے۔ جیسے کوئی پیدائشی بہرا، گونگا یا اندھا ہو، بالکل اس طرح یہ زائد اور خوفناک چھٹی حس میرے وجود کا وہ پیدائشی عیب یا محرومی بن چکی ہے جو اب میری عادت میں شمار ہے اور جس کے ساتھ، بغیر کسی پریشانی یا مشکل کے، اطمینان کے ساتھ میں نے جینا سیکھ لیا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس منحوس اور کالی صلاحیت نے میرے اندر کی کمینگی اور کینہ پروری کو بھی سہارا دے کر اسے اور زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔

اور پھر بارش آگئی۔ وہ تو اُمس اور حبس کے ریشوں میں پہلے ہی سے پوشیدہ تھی۔ ایک رات جب میں نے اپنی کلائیوں اور چہرے کو انگلیوں سے چھوا تب ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ آ پہنچی ہے۔

رات کے تقریباً تین بجے ہوں گے۔ جب بادلوں کی زبردست گرج اور چمک کے ساتھ پانی برسنے لگا۔ ساتھ میں بارش کی ازلی رفیق ہوا بھی آئی۔ اُمس کی دیوار ٹوٹ کر گر گئی اور میں باہری دالان میں ٹین سے لگے داسے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ برابر میں سنبل کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے میں داسے میں لگی ہوئی لالٹین بھک سے بجھ گئی۔ سارا گھر تاریک ہو گیا۔ ایک بار بہت زور سے بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ طوطے نے اپنے پروں میں منھ چھپا لیا ہے۔

اندھیرے میں، بارش کے بھیانک شور میں مجھے بھی ڈر لگنے لگا۔ چھتوں کے پرنالوں سے زبردست آواز پیدا کرتا ہوا پانی بہہ رہا تھا۔

بارش کے شور میں اچانک میں نے ایک مختلف اور پُراسرار آواز سنی۔ ایک عجیب سی سرسراہٹ اور پھنکار زینے کے قریب بنے مرغیوں کے ڈربے کی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر باورچی خانے کے دروازے پر، پھر آم کے درخت کے قریب اور پھر معدوم ہو گئی۔ یہ بارش کی آواز ہرگز نہ تھی۔ بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے سردی اور خوف دونوں محسوس ہوئے۔ میں جلدی سے اندر جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا اور چادر میں منھ ڈھانپتے ہی مجھے گہری نیند آ گئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو بارش ہو رہی تھی۔ گھر میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ڈربے

میں بند ساری مرغیاں مرگئی ہیں۔

اچھن دادی نے بتایا کہ رات ناگ کا گزر ادھر سے ہوا تھا۔ وہ اتنا زہریلا ہے کہ اس کی پھنکار سے ہی مرغیاں اور کبوتر مردہ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ سانپ اس گھر کا بہت پرانا مکین ہے، جب یہ گھر بن رہا تھا تب ہی سے، یہ اس کی بنیادوں میں رینگتا اور سرسراتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ اس کے اثر سے جانور تو کئی بار مر چکے ہیں مگر کسی انسان کو اس ناگ نے کبھی نہیں ڈسا۔

اچھن دادی یوں تو غپ مارنے میں مشہور تھیں مگر اُن کی اس بات کی تائید گھر کے دوسرے افراد نے بھی کی۔ اگر رات کا وقت ہوتا تو مجھے بہت ڈر لگتا مگر اُس وقت تو مجھے اُس ناگ کو دیکھنے کا تجسس پیدا ہو گیا۔ رات اور دن کا یہی تو فرق ہے۔ انسان روز ایک دوہری زندگی جیتا ہے۔ دن میں کچھ اور رات میں کچھ بلکہ ایک دوسری زندگی۔ زمین کی گردش کوئی معمولی واقعہ نہیں، اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ اس امر کو فراموش کرنا ہمیشہ خطرناک نتائج کا موجب ہوا کرتا ہے۔

آپ نے ناگ کو دیکھا ہے؟ میں نے اچھن دادی سے پوچھا تھا۔ ''ہاں، کئی بار۔ جب میں تیرہ سال کی تھی اور اُس کے بعد بھی کئی بار۔ اس کے اوپر یہ بڑے بڑے بال ہیں۔ وہ بہت پرانا ہے اور بالکل کالا۔ ایسا کالا کہ اُس کے آگے چراغ نہیں جل سکتا۔'' اچھن دادی نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ اکثر باورچی خانے کی کوٹھری میں بھی دکھائی دیا ہے۔'' نورجہاں خالہ نے کہا تھا۔ مگر اُس پُراسرار سانپ کو دیکھنے کی آرزو میرے دل میں ہی رہ گئی۔ میں جب تک اپنے گھر میں رہا، مجھے وہ کبھی نظر نہ آسکا۔ مگر اب مجھے اُسے نہ دیکھ پانے کا کوئی ملال یا افسوس نہیں ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میرے دل میں بھی ایک اتنا ہی زہریلا، اتنا ہی کالا اور اتنا ہی عمر رسیدہ ایک ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ میں یہ جو اپنی یادداشتیں لکھ رہا ہوں یا سنا رہا ہوں، یہ اپنے دل کے اس سیاہ ناگ کو پٹاری میں بٹھا کر اُس کے سامنے بین بجا کر تماشہ دکھانے کے ہی مترادف ہے۔ یہ ہمت اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ میں تو خیر اپنی عدالت کو ڈھونڈھ رہا ہوں یا عدالت مجھے شکاری کتے کی طرح سونگھتی پھر رہی ہے، مگر تم سب کیا کر رہے ہو؟

میں نے تو اپنا کوبرا دکھا دیا۔ یہ رہا میرا ناگ، مگر تم بھی تو اپنے اپنے ناگ، اپنے اپنے کوبرے دکھاؤ۔ اے نیک دل اور شریف انسانو!

اس وقت میری یادداشت کو بہت زیادہ محنت کرنا یا بھٹکنا نہیں پڑ رہا ہے۔ بارش کی یاد، میرے حافظے کو اِس طرح اپنے ساتھ لیے لیے چل رہی ہے جیسے بادل پانی کو لے کر چلتا ہے۔ بارش کتنی بھی اندھیری ہو، وہ یادداشت کے لیے ایک کبھی نہ مٹنے والے اُجالے کی مانند ہوتی ہے۔ اب کچھ دیر تک میں جو بھی لکھوں گا وہ تحریر قلم کی سیاہی کے ذریعے نہیں بلکہ ٹین پر ٹپ ٹپ گرتی ہوئی بارش کے ذریعے خود بخود وجود میں آ جائے گی۔ بارش کی دھند اور اُس کی بوندیں، اس کی بوچھار اور جھاوٹ اور سیاہ بادلوں سے منڈھا ہوا آسمان یہ سب میرے کاغذ قلم ہیں۔ بارش ہی وہ لفظ ہے جس کے سہارے میں بغیر لکنت کے، اپنی فراٹے دار زبان میں اُس سیلن زدہ اور بھیگے ہوئے زمانے کو حفظ کر سکتا ہوں۔

پھر وہ رُکی نہیں۔ وہ ہوتی ہی رہی۔ کسی بھی دن کا آسمان بادلوں سے خالی نہ رہا۔ کبھی موسلا دھار بارش ہوتی اور کبھی کبھی ہلکی پڑ جاتی۔ مگر پھوار برابر پڑتی رہی۔ دس دن گزر گئے۔ ندیاں خطرے کے نشان کے اوپر بہنے لگیں۔ باندھ کھول دیے گئے اور پانی نے آس پاس کے علاقوں کو ڈبو کر رکھ دیا۔

باڑھ آگئی، اس باڑھ میں انسانوں کے ساتھ اُن کے مویشی بھی بہہ گئے۔ شہر کی سڑکوں پر گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ محلّے کے کئی گھروں کی چھتیں اور دیواریں گر گئیں۔ لوگ ان گرتی ہوئی چھتوں اور دیواروں کے نیچے دب دب کر مر گئے۔ مگر بارش نہ رُکی۔

ہمارا گھر کافی پختہ اور مضبوط تھا، مگر اس کی دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئیں اور دالانوں اور کوٹھریوں کی چھتیں بری طرح ٹپکنے لگیں۔ پلنگ، بستر، صندوق، میز، کرسیاں سب پانی سے تر بتر ہو گئے۔ باورچی خانے کا تو سب سے برا حال تھا۔ اس کی چھت سے تو پانی تقریباً اسی طرح نیچے آ رہا تھا جیسے آنگن میں۔ چولہا ٹھنڈا پڑ گیا۔ کھانا دالان میں انگیٹھی رکھ کر پکایا جانے لگا۔

باورچی خانے کے برتن، تیل، گھی، اناج اور مسالے سب پانی میں ڈوبے پڑے تھے۔

ایک دن گھر کے کچے آنگن میں بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر گیا۔ سڑکوں کی نالیاں بند تھیں۔ اور پانی کی نکاسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ باورچی خانہ کیونکہ آنگن کی سطح سے بالکل ملا ہوا تھا اس لیے وہاں بھی پانی آ گیا۔ باورچی خانے کے برتن اسی پانی میں بہہ بہہ کر آنگن میں تیرنے لگے۔ دیگچیاں، پتیلے، تسلے، چمچے، کفگیر، پتیلیاں اور توے سب آنگن میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ وہ گھر کی نالی سے باہر نکل

جانا چاہتے تھے۔

پورا گھر بارش رُکنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ آنگن میں چلنا دشوار ہوگیا۔ لوگ پھسل پھسل کر گرنے لگے۔ پاخانے اور دروازے تک جانے کے لیے چند اینٹیں رکھ دی گئیں تھیں جو اب پانی میں پوری طرح ڈوب چکی تھیں اور نظر نہ آرہی تھیں۔ نارنگی کے ایک چھوٹے سے درخت میں اچھن دادی نے ایک سفید پرزے پر ''ق ق ق'' لکھ کر لٹکا دیا۔ آنگن میں پانی اور کائی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب وہ یہ سفید پرزہ درخت میں لٹکا کر جلدی جلدی دالان کی جانب واپس آرہی تھیں، تب ہی کائی میں اُن کا پیر پھسل گیا۔ وہ چاروں خانے چت گریں۔ وہ کائی اور کیچڑ میں لت پت تھیں۔ اُن کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ (اس کے بعد وہ جب تک جئیں، صاحب فراش ہی رہیں اور مجھے ہمیشہ کائی میں لتھڑی ہوئی محسوس ہوئیں) گھر میں نالیوں سے بہہ بہہ کر حشرات الارض چلے آئے۔ مینڈک اور کچھوے، کنکھجورے اور کان سلائیاں۔ کینچوے اور سانپ کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی۔ حد تو یہ تھی کہ ایک دن چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی۔ پورا گھر کائی کی بساندھ سے بھر گیا اور اُس کی ہر دیوار ہری اور کالی نظر آنے لگی۔ اندر کی دیواروں پر سیلن اور پانی نے آکر ساری قلعی نیست و نابود کردی۔ گارا اور چونا جگہ جگہ سے پھول کر نیچے گرنے لگا۔ وہاں طرح طرح کے دھبے اور شکلیں سی بنتی نظر آنے لگیں۔ بھیانک اور بولتی ہوئی صورتیں، خودرو گھاس اور پودوں نے دیواروں کی منڈیروں پر پھیلنا شروع کر دیا۔ آسمان پھٹ گیا تھا اور شاید زمین بھی جلد ہی پیروں کے نیچے سے پھسل کر غائب ہوجانے والی تھی۔ طوفانی بارش میں، میں اپنے کن کٹے خرگوش کے ساتھ دالان، کبھی کوٹھری اور کبھی دالسے کے قریب دُبکا رہتا اور بارش دیکھتا رہتا۔ جب کبھی بجلی زور سے کڑکتی تو نور جہاں خالہ کے منھ سے بے اختیار نکلتا ''یا اللہ خیر۔''

رات میں اس بارش کی آواز مہیب اور پُر اسرار ہوجاتی۔ ٹین پر گرتی ہوئی بارش اب مجھے اس ماتمی باجے کی یاد دلاتی جو محرم کے دنوں میں تختوں کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔

بارش کی یہ آواز آہستہ آہستہ سنّاٹے میں بدلتی جاتی تھی۔ جیسے کوئی اُداس اور ماتمی موسیقی آخر میں خاموشی یا ایک گہری چُپ میں جا کر کھو جاتی ہے۔ اب میرے کان اس بارش کی آواز کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لیے میرے لیے اب رات کے سنّاٹے اور بارش میں کوئی فرق نہیں رہا۔ مجھے نیند آنے لگی،

ان راتوں میں، مجھ پر جلد ہی نیند کا غلبہ ہو جاتا اور میں گہری نیند سونے لگا۔ نہ صرف سونے لگا بلکہ خواب بھی دیکھنے لگا۔ ایسے خواب جنھیں میں آج تک نہیں بھولا۔

کچھ بیماریاں، عادتیں، اضطراری عمل یا ردِّعمل وغیرہ ورثے میں مل جاتے ہیں۔ ہمارے گھر کے تقریباً تمام افراد کی اکثر سوتے میں اپنے ہی دانتوں سے زبان کٹ جاتی تھی۔ جیسے وہ ایک لذت آگیں یا وحشت انگیز خواب دیکھتے تھے۔ وہ صبح کو آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھتے اور اُن کے منھ سے ٹھوڑی کی طرف بہتی ہوئی ایک خون کی لکیر ہوتی۔

اب تک میں بچا ہوا تھا۔ سوتے میں، میری زبان دانتوں کے درمیان کبھی نہیں آئی تھی مگر اس دفعہ بارش اور سیلاب کی اُن پُراسرار راتوں میں، جب میں بہت گہری نیند سونے لگا اور خواب دیکھنے لگا تو صبح کو جاگنے پر میرے منھ سے بھی خون کی پتلی سی لکیر ٹھوڑی پر بہتی نظر آنے لگی۔ میں اُسے اکثر شہادت کی انگلی سے پونچھ دیا کرتا۔

ان خوابوں میں ہمیشہ ایک لڑکی ہوتی یا یہ کہ لڑکی نہ ہو کر وہ بارش تھی جس نے خواب کا چولا پہن لیا تھا۔ ہر بار کے خواب میں اس کی صورت مختلف ہوتی مگر میرے اندر، زیریں سطح پر یہ احساس ہمیشہ موجود رہتا کہ وہ ایک ہی لڑکی ہے۔ وہی ایک وجود جو ہر خواب میں آتا ہے۔ میں لاکھ کوشش کرلوں مگر اُس کا حلیہ لفظوں میں نہیں بیان کرسکتا۔ کبھی لگتا کہ وہ چہرہ دنیا کے ہر انسان سے ملتا جلتا ہے۔ اور کبھی یہ محسوس ہوتا کہ وہ چہرہ کسی سے بھی مشابہت نہیں رکھتا۔ کچھ شکلیں، کچھ صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو آنکھوں کی گرفت میں نہیں آتیں۔ وہ آنکھوں سے ہو کر نکل جاتی ہیں۔ اور پھر خوشبو بن کر روح میں اُتر جاتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہر خوشبو آپ کو محض مسرت ہی نہیں فراہم کرتی، وہ کبھی کبھی بلکہ اکثر بے حد افسردہ بھی کر دیتی ہے۔

''لو—'' وہ اپنی ہتھیلی آگے بڑھاتی ہے۔ کلائیوں تک اُس کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔

میں غور سے دیکھتا ہوں، گوری، اُجلی صاف، نازک سی ہتھیلی پر ایک سوکھا شامی کباب رکھا ہوا ہے۔

''لو کھالو۔''

میں احتیاط کے ساتھ شامی کباب اُٹھاتا ہوں۔ شامی کباب برف کی طرح ٹھنڈا اور اُداس ہے۔

میں شامی کباب کا ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹتا ہوں۔

من وسلویٰ شرما کر ایک کونے میں چھپ جاتا ہے۔لڑکی بھی اچانک گم ہو جاتی ہے۔

میری آنکھ کھل جاتی ہے۔بارش ہوئے جارہی ہے۔

''گڈو میاں! تمھیں کھانے میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟''لڑکی پوچھتی ہے۔اس بار اُس کی کلائیوں میں سبز چوڑیاں ہیں۔چوڑیاں اُس کی کھنک دار آواز سے خود بھی کھنکنے لگتیں ہیں۔

''قورمہ۔''میں جواب دیتا ہوں۔

''اور؟''

''پلاؤ۔''

''اور؟''

''ارہر کی دال۔''

''اور؟''

''اور...اور...میں ذہن پر زور دیتا ہوں۔پھر جوش بھرے لہجے میں کہتا ہوں۔''اور سب سے زیادہ تو گردہ کلیجی۔''

''گردہ کلیجی؟''

''ہاں! وہ مجھے بہت بہت پسند ہے۔''

''تمھیں گردے کلیجی اتنے پسند ہیں؟''لڑکی کی آواز رندھ جاتی ہے۔

''ہاں!''مگر ہمارے یہاں بہت کم پکتے ہیں۔صرف بقرعید میں۔''

میں افسردگی کے ساتھ کہتا ہوں۔

''تمھیں گردے کلیجی اتنے پسند ہیں تو میرے نکال کر کھالو۔''

میں اُسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا ہوں۔

''ہاں نکال لو، میرے دونوں گردے اور میری کلیجی۔''وہ پرخلوص لہجے میں کہتی ہے۔

میں باورچی خانے میں جانور ذبح کرنے والی چھری لینے کے لیے چلا جاتا ہوں۔

میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہوگئی ہے۔ بارش جاری ہے۔ منہ سے ٹھوڑی تک خون لگا ہوا ہے۔ میری زبان میں بہت تکلیف ہورہی ہے۔ زبان دانتوں کے درمیان آکر بری طرح کٹ گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے دانت نکیلے بھی تو بہت ہوتے جارہے ہیں۔

خوابوں کا یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا جب تک بارش ہوتی رہی۔ پھر ایک دن پانی برسنا بند ہوگیا۔ آخر کار بارش رُک گئی۔ ہر بارش کو بہرحال ایک نہ ایک دن رُکنا ہی ہوتا ہے۔ اُس طویل ترین بھیانک بارش کو بھی تھک کر رُکنا ہی پڑا تھا۔ جو لاکھوں برس تک اس کرۂ ارض پر ہوتی رہی تھی۔

دھوپ نکل آئی۔ سورج نے بادلوں کی سیاہ نقاب، اپنے چہرے سے نوچ کر پھینک دی۔ ہر شے اب سوکھنے لگی۔ گھر، دیواریں، چھت، کپڑے، سب گرم ہونے لگے۔ مگر یہ ایک سیلن زدہ تمازت تھی۔ بارش کے بعد سارے شہر میں بخار کی وبا پھیل گئی۔ کھانے سڑنے لگے۔ کھانا، باورچی خانہ ہو، یا کوئی اور جگہ، ہر جگہ سڑ رہا تھا۔ اور سڑے ہوئے کھانے کی بو ہر جگہ سے آرہی تھی۔ یہ بخار آنتوں اور پیٹ میں خطرناک جراثیم پیدا ہونے سے آتا تھا۔ ہمارے گھر میں بھی ہر کسی کا پیٹ خراب تھا۔ سب اُلٹیاں کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو، چڑچڑاتے ہوئے، تقریباً کھا جانے کے لیے دوڑتے تھے۔ سب کی آنتوں میں مروڑ تھی۔ انجم باجی تک کی آنتوں میں (مجھے اس بار اُن کے پیٹ میں آنتیں ہونے کے احساس سے اتنا صدمہ نہیں پہنچا)۔ ان دنوں گھر میں صرف مونگ کی دال کی کھچڑی پکتی تھی اور سارا گھر اُسے دہی کے ساتھ دونوں وقت کھاتا تھا۔ میں نے اتنے بڑے دیگچے میں اتنی زیادہ کھچڑی پکتی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میں بھی کھچڑی ہی کھاتا رہتا، مگر میرا پیٹ خراب نہیں ہوا۔ نہ تو میری آنتوں میں مروڑ ہوئی اور نہ ہی مجھے کوئی اُلٹی ہوئی۔

دراصل ہیضہ پھیل گیا تھا۔ برسات کے بعد، اُن دنوں یہ بیماری عام تھی، لیکن اس بار اس نے وبا کی صورت اختیار کرلی۔ لوگ قے اور دستوں سے مرنے لگے۔ ہمارے محلے میں ہی کئی موتیں ہوئیں۔ گھر کے پاس ہی ڈاکٹر اقبال کا مطب تھا۔ ڈاکٹر اقبال ایک نیم حکیم تھا اور اُس کے پاس باقاعدہ کوئی

میڈیکل ڈگری نہیں تھی۔ مگر اُس کے مطب پر مریضوں کا میلہ لگ گیا۔ مطب ایک پتلی سی گلی میں تھا۔ یہ پوری گلی ہیضے کے مریضوں سے اور پیشاب پاخانے کی ناگوار بدبوؤں سے بھری رہتی تھی۔ مریض ایک کے اوپر ایک لدے سے رہتے اور اکثر اپنی الٹیاں اور قے برداشت نہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی پیٹھ پر ہی کر دیتے اور پھر آپس میں مار پیٹ کی نوبت آجاتی۔ اگرچہ مار پیٹ ہونہ پاتی کیونکہ وہ سب لگاتار دستوں، اُلٹیوں، بخار اور کچھ نہ کھانے پینے کی وجہ سے انتہائی لاغر اور کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی کھال، گوشت اور ہڈیوں میں پانی کی بوند تک نہ بچی تھی۔ کئی مریضوں نے ڈاکٹر اقبال کے مطب کے سامنے، اسی گلی میں نالیوں میں گر کر دم توڑ دیا۔

یہ تھا انسان کی آنتوں کا تماشہ جسے سب نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ تھی منھ چلائے جانے کی سزا۔ انسان کا جرم اور اُس کی سزا دونوں ہی اس کی تعمیر میں مضمر ہیں۔

اس لیے میں نے کہیں کہا تھا کہ انسان اپنی آنتوں میں رہتا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ وبا بھی کم ہونے لگی۔ کیونکہ زمین نے گردش کرنا تو چھوڑا نہیں تھا۔ ستمبر کے آخری دن آپہنچے اور وہ ہوائیں چلنے لگیں جن سے تیز دھوپ بھی ہار جاتی ہے وہ ڈھلی دھلائی اور پاکیزہ دھوپ تھی۔ نیلا آسمان پہلے سے زیادہ نیلا نظر آنے لگا اور دوپہر میں تیز ہوا کے جھکّو جیسے دھوپ اور آسمان دونوں کو اپنے ساتھ اُڑائے لے جاتے تھے، موسم نے کروٹ لی تھی۔ ہیضے کے جراثیم کمزور پڑنے لگے۔

یہ ہوائیں بارش کے رخصت ہو جانے کا ایک جشن منا رہی تھیں یا نوحہ، یہ تو میری سمجھ میں آج تک نہ آسکا، حالانکہ میں ہر سال بارش کے بعد چلنے والی ان ہواؤں سے دوچار ہوتا ہوں مگر اب یہ بھی ہے کہ جشن اور نوحہ کون سی دو مختلف باتیں ہیں، جس طرح زندگی اور موت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔

وہ خوفناک بارش تو چلی گئی تھی مگر میں پہلے سے کچھ زیادہ بڑا اور شاید زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ میرے گالوں اور ٹھوڑی پر ہلکا ہلکا سا رُوواں سا اُگ آیا تھا۔ مجھے اب اُس مہربان لڑکی والے خواب بالکل نہیں آتے تھے، نہ ہی دانتوں کے درمیان آکر زبان کٹتی تھی۔ میرے امتحان قریب آرہے تھے۔

مجھے راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھنا تھا۔ اس لیے میں نے ان خوابوں کو بائیں طرف، اپنے دل کے قریب، اپنی قمیص کی اوپری جیب میں رکھ لیا ہے جسے جب چاہے نکال کر دیکھا جاسکتا ہے۔ میں اپنے خوابوں کو دیکھنے کے لیے نیند کا محتاج نہیں تھا۔

میں دیر رات تک جاگ جاگ کر پڑھتا۔ زیادہ تر ریاضی کے سوال حل کرتا کیونکہ ہائی اسکول میں، اس مضمون سے سب سے زیادہ مجھے ڈر لگتا تھا۔ بہت سے سوالوں کو میں حل نہیں کر پاتا تھا۔ تب اُن کے جواب، کتاب کے آخر میں دیکھ کر میں اُلٹے سیدھے، اوٹ پٹانگ طریقے سے فارمولے کا غلط استعمال کرتے ہوئے نیچے لکھ دیا کرتا تھا۔ ظاہر تھا کہ میری ریاضی چوپٹ ہوئی جا رہی تھی۔ اور سب سے زیادہ تو الجبرا اور جیومٹری جہاں سب کچھ پہلے سے ہی فرض کر لیا جاتا تھا۔ یہاں سب کچھ ایک ٹک بندی تھی۔ ایک اندھا راستہ، کچھ مان کر چلو اور ایک اوٹ پٹانگ، مگر اپنے ہی بنائے ہوئے راستے پر چل کر اُسے ثابت کردو۔ (دنیا کے وجود کو بھی ایسے ہی ثابت کیا گیا اور ایسے ہی سراب مان کر اس کا نہ ہونا بھی ثابت کر دیا گیا) عقل و دانش اور منطق کی یہ خود غرض مکاریاں اب تو میرے سامنے پوری طرح عیاں ہو چکی ہیں۔ مگر اُن دنوں حساب کا مضمون مجھے بری طرح تھکا کر رکھ دیتا تھا اور میں تنگ آ کر سوال کو حل کیے بغیر اُس کا جواب دیکھ کر وہیں لکھ دیا کرتا تھا اور یہ بات بھی آج تک میرے لیے ناقابل فہم بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ اگر کسی سوال یا مسئلے کا جواب کہیں لکھا ہوا ہے یا کسی نے اُسے حل کر رکھا ہے اور اُس پر اُسے یقین بھی ہے تو پھر دوسروں کو الجھانے اور پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟

مگر اس ریاضی سے الگ ایک دوسری ریاضی بھی تھی۔ ایک مہلک اور پُراسرار ریاضی جس کا علم میرے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔ صرف میرے پاس ہی اُس کے خطرناک فارمولے تھے۔ اس کی کوئی کتاب نہ تھی جس کے آخری اوراق پلٹ کر میں سوالوں کے حل ڈھونڈ لیتا، مگر میں حل سے لاعلم رہتے ہوئے بھی 'حل' کی نوعیت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کتنے اعداد کے درمیان کہیں ہوگا۔ کم نحس سے زیادہ نحس کے درمیان۔

یقیناً اب یہ ایک گھٹیا ہتھیار تھا۔ جو میرے ہاتھ لگ گیا تھا اور میں اس پر کبھی کبھی فخر بھی کرتا۔ گھٹیا باتوں پر فخر کرنے والوں میں، دنیا میں اکیلا میں ہی تو نہیں ہوں۔ کتنے عامل، تانترک، جیوتشی، قسمت کا

حال بتانے والے اور چھچھورے، سیاست داں اور کاروباری لوگ آخر گھٹیا باتوں پر ہی تو فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس خطرناک مضمون کا ایک سوال میں نے جلد ہی پھر حل کیا۔

میرے سہ ماہی امتحان ختم گئے تھے۔ میں نے پھر سے جاسوسی ناول پڑھنا شروع کر دیے اور زیادہ سے زیادہ وقت انجم آپا کے گھر گزارنے لگا۔ انجم آپا ایک سانولے بلکہ پکّے رنگ کی لڑکی تھیں۔ مگر اُن کا منھ ہاتھ پیروں کی بہ نسبت کافی صاف رنگت لیے ہوئے تھا جو ایک عجیب بات تھی۔ ان کا قد ٹھگنا تھا اور چہرہ بالکل گول تھا۔ کسی چپاتی کی طرح جس پر چیچک کے جابجا نشانات تھے۔ بالکل چپاتی پر لگی ہوئی چتّیوں کی مانند۔ اس چہرے کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ بھوک لگنے لگتی تھی اور میری آنتیں کڑکڑانے لگتی تھیں۔ وہ چہرہ مجھے ہمیشہ اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ جیسے اپنے گھر میں کھانا کھاتے وقت، روٹی کی ڈلیہ میں رکھی چپاتی اپنی اپنی سی لگتی ہے۔ انجم آپا مجھ سے بہت خلوص سے پیش آتیں، کبھی کبھی تو مجھے لگتا جیسے وہ مجھے انجم باجی سے بھی زیادہ چاہتی ہیں۔

برسات کے بعد اُن کا باورچی خانہ بہت خستہ حال ہو گیا تھا۔ وہ لکھیا اینٹوں کا بنا تھا اور دیواروں پر ہر طرف جنگلی گھاس اُگ آئی تھی۔ اکتوبر کا مہینہ تھا جس میں دھوپ بہت تیز اور چمکدار ہوتی ہے اور شام کو کچھ دھندسی پھیلنے لگتی ہے۔

میں انجم آپا سے ایک جاسوسی ناول کے مجرم کے بارے میں باتیں کر رہا تھا کہ مجھے اُن کے باورچی خانے سے کچھ تلے جانے کی خوشبو آئی۔ میرے نتھنے مہک کر رہ گئے۔ دوپہر تھی اور مجھے زوروں کی بھوک پہلے سے ہی لگ رہی تھی۔ میں نے ناک کے نتھنے پھلا کر خوشبو کو سونگھا۔

انجم آپا ہنسنے لگیں۔

''امّاں دال بھرے پراٹھے تل رہی ہیں۔ایک پراٹھا کھا کر جانا۔''

''پراٹھے — دال بھرے پراٹھے۔'' میں نے دہرایا۔

''ہاں!''

ٹھیک اُسی وقت میرے دل پر جیسے ایک سوئی سی چبھی، ایک گیلی گیلی، پانی سے تر سوئی جس کی ٹھنڈی چبھن اب میرے بائیں کاندھے تک رینگ آئی۔ میں خوف زدہ سا ہو گیا۔ اُس خطرناک اور پوشیدہ ریاضی کا ایک سوال میرے سامنے تھا۔ اور میں اس کے حل کی حدود کا تعین کرنے کے لیے ایک مختلف شخصیت میں تبدیل ہو چکا تھا۔

''نہیں، اب میں جاؤں گا۔'' میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیوں؟ کیا غریبوں کے گھر کھانا نہیں کھا سکتے؟''

''یہ بات نہیں انجم آپا، مگر مجھے بازار سے سودا لانا ہے۔''

میں نے بہانہ کیا اور کل پھر آنے کا وعدہ کرتے ہوئے ان کے گھر سے باہر آ گیا۔ میری بھوک جیسے بالکل مر گئی تھی۔ ''دال بھرے پراٹھے۔ دال بھرے پراٹھے۔'' میرا ذہن لگاتار یہی گردان کیے جا رہا تھا۔

میں ابھی بس اُن قبروں تک ہی پہنچا ہوں گا کہ میں نے اپنے پیچھے ایک زور کی دھمک سنی۔ ایک ایسی دھمک جس کے ساتھ ساتھ ایک پُراسرار سنسناہٹ بھی شامل تھی۔ میں واپس مڑا۔ ادھر شور بلند ہو رہا تھا۔

''دیوار گر گئی، دیوار گر گئی۔'' کوئی چیخ رہا تھا۔

''کس کی دیوار گر گئی؟''

مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کس کی دیوار گری ہے۔

میں بھاگتا ہوا انجم آپا کے مکان پر پہنچا۔ وہاں بھیڑ لگ گئی تھی۔

انجم آپا کے خستہ اور بوسیدہ حال باورچی خانے کی دیوار گر گئی تھی۔ اور اُن کی ماں اُس سے دب کر مر گئی تھیں۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

گری ہوئی دیوار کے ملبے اور برسوں پرانی کلیا اینٹوں اور خودرو جنگلی گھاس کے نیچے وہ ساکت وجامد پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سارے جسم کو ملبے نے ڈھک لیا تھا۔ صرف اُن کا منھ باہر تھا۔ ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

دیوار کے ملبے کے نیچے ہی شاید اینٹوں کا چولہا بھی دبا پڑا تھا جس کی آگ بجھ کر مٹی، گارے اور خودرو گھاس پودوں میں دفن ہوگئی تھی۔

''ان دنوں ہی تو مکان گرتے ہیں۔ برسات کے بعد کی دھوپ میں ہی دیواریں اپنی جگہ چھوڑتی ہیں۔'' کوئی کہہ رہا تھا۔

مگر مجھے اچھی طرح علم تھا کہ دیوار کیوں گری ہے۔ دودھ میں پڑی ایک زہریلی چھپکلی نے مجھے تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیا تھا۔ انجم آپا غش کھا کر گر پڑی تھیں۔ باورچی خانے کی اُسی دیوار کی طرح۔ گھر میں بھیڑ بڑھتی چلی گئی۔ سارا محلّہ اکٹھا ہوگیا۔

باورچی خانے میں دال بھرے پراٹھے مجھے نظر نہیں آئے۔ مگر اُن کی خوشبو اب دور دور تک پھیل رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں بھی ہوا کے زور پر دال بھرے پراٹھوں کی خوشبو ادھر اُدھر رینگتی محسوس ہوئی۔

میں پریشان، سراسیمہ اور ایک بے وجہ کے احساسِ جرم سے مغلوب ہوکر طوطے کے پنجرے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ میرا کن کٹا خرگوش آ کر میری پتلون کے پائینچے پر منھ رگڑنے لگا۔

''کاش میں وہاں آج اس وقت نہ جاتا۔'' میں نے پشیمان ہوکر سوچا۔

''گڈو میاں آگئے.... گڈو میاں آگئے....'' طوطا زہر خند لہجے میں بولا۔
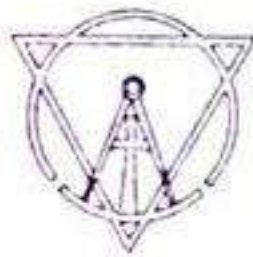
اُنھیں دنوں نور جہاں خالہ کی رشتے کی ایک بھتیجی جو ایک قریبی تحصیل میں رہتی تھی، شہر میں علاج کرانے کے لیے آئی۔ وہ ہمارے گھر ہی ٹھہری، اُس کا نام ''انجم بانو'' تھا۔

وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی جو قصبے سے رساول کی ہانڈی بھی ساتھ لایا تھا۔ مٹی کی ہانڈی جس پر لال کاغذ منڈھا ہوا تھا۔ ان دنوں یہ روایت تھی کہ ہمارے گھر سے جب کوئی کسی رشتے دار کے یہاں دور گاؤں یا قصبے جاتا تو رساول کی ہانڈی لے کر ضرور جاتا اور جو رشتے دار ہمارے یہاں آتے وہ بھی رساول کی ہانڈی لے کر آتے۔ یہ ہانڈی اپنی بناوٹ اور ہیئت کے اعتبار سے ہمیشہ مجھے پُر اسرار ہی نظر آئی۔ اگر چہ رساول میں بھی بہت شوق سے کھاتا تھا۔

انجم بانو عمر میں میرے برابر تھی۔ اس کے جسم میں خون کی کمی تھی۔ وہ زرد رنگ کی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی رنگت پہلے گوری رہی ہو مگر اب اُس کی تمام کھال زرد تھی۔ اس کی پیلی رنگت کا موازنہ انجم باجی کی رنگت سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو کہ اُنھیں فطرت کی طرف سے دیا گیا ایک خوبصورت اور پاکیزہ تحفہ تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خالی خالی سی تھیں۔ جس کی پتلیوں میں صرف پیلا رنگ اگا ہوا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو اُس کی پتلیوں کا یہ پیلا رنگ ہلکی سی سرخی میں تبدیل ہوتا نظر آتا مگر فوراً ہی معدوم ہو جاتا۔

دوپٹے میں اُس کے سینے کا اُبھار بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی محسوس ہوتا ورنہ وہ صرف ایک سپاٹ سینہ تھا۔ میری عمر اب اتنی ہو گئی تھی کہ میں عورت کے تئیں خاص جنسی دلچسپی بھی لے سکتا تھا۔ اور یقیناً مجھے انجم بانو سے ایک خالص جنسی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ممکن تھا کہ آگے چل کر اس میں محبت کا عنصر بھی

شامل ہو جاتا کیونکہ محبت اور جنس ایک دوسرے کے اس طرح پیچھے لگے رہتے ہیں جیسے اُمس کے پہلے بارش یا حبس کے پیچھے پیلی آندھی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا، اس کی وجوہات تب تو نہیں مگر اب میں تھوڑا تھوڑا سمجھ سکتا ہوں۔

انجم بانو کی آنکھوں میں بھی ایک پیاس تھی۔ ایک سخت جنسی پیاس جو کسی بھی جوان لڑکی، جو بیمار رہتی ہو، میں غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہے۔ صرف ایک ہفتے کے اندر اندر ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنتوں... معاف کیجیے گا، آنکھوں کو مکمل طور پر پڑھ لیا۔

ایک سنسان سی دوپہر میں، میں چپکے سے اُٹھ کر باورچی خانے میں آ گیا۔ وہ باہری دالان میں بیٹھی مسور کی دال بین رہی تھی۔

باورچی خانے میں آ کر میں نے اُسے اشارہ کیا۔ وہ پہلے تو خاموشی سے دال بینتی رہی پھر ایک چونکی بلی کی طرح اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اور دال کی سینی لیے لیے، دبے پاؤں، بلّی کی چال چلتی ہوئی باورچی خانے میں آ گئی۔

میں اُسے اندر کوٹھری میں لے گیا جہاں روشندان سے چھن چھن کر دوپہر کے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مجھے کوئی پہل نہیں کرنی پڑی، وہ تو آتے ہی مجھ سے بری طرح لپٹ گئی اور مجھے دیوانہ وار چومنے لگی۔ اس کی سانسوں سے آم کے اچار کی بو آ رہی تھی۔ میں نے اُس کے پستانوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا یا اگر تھا تو میری انگلیوں کو محسوس نہ ہو سکا۔

مگر وہ بالکل ہی ہوش کھو بیٹھی۔ اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر زور سے چپکا لیا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی عورت کے پستان باہر کو اُبھرے ہوئے یا بڑے بڑے ہیں یا نہیں۔ شاید جس طرح کچھ انسانوں کے ایک آدھ دانت مسوڑھوں کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اور زندگی بھر باہر نہیں نکلتے۔ اسی طرح کچھ عورتوں کے پستان سینے کی نامعلوم، پُر اسرار گہرائیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ اور مرد کے ہاتھ لگنے سے باہر آنے کے لیے تڑپ اُٹھتے ہیں۔

وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کی سانسیں بہت تیز ہو گئیں۔ اس کی دھونکنی سی چلنے لگی۔ لگا کہ جیسے اس کے پھیپھڑے پھٹنے والے ہیں۔ آم کے اچار کی بُو بڑھتی گئی۔ مجھے آم کی بو یا خوشبو سے نفرت

تھی جو آج تک قائم ہے۔ میں بدمزہ ہونے لگا۔ اور پھر دھیرے دھیرے خوف زدہ بھی۔

اُس کے پیلے چہرے پر روشندان سے آتی ہوئی دھوپ کی کرن پڑ رہی تھی۔ مجھے اچانک اُس کا پیلا چہرہ اور پیلا جسم بہت پاکیزہ نظر آیا۔

یہ جسم بیمار تھا، اس جسم میں خون نہیں بنتا تھا۔ آدمی کے جسم میں زیادہ خون ہونا ہوس کی نشانی ہے اور بھدا بھی۔

مگر انجم بانو کی ہوس اُس کی روح میں پوشیدہ تھی اور اُس بھیانک ہوس اور شہوت کا ساتھ دینے میں اُس کا بیمار، خون کی کمی کا مارا ہوا، یرقان زدہ جسم ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے وہ جسم ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے اور کانپنے لگا۔ انجم بانو کی روح کی پیاس نہ جانے کتنی صدیوں کی پیاس تھی اور یہ پیاس اس لیے بے قابو تھی کہ انجم بانو کا جسم بہت بیمار تھا۔ روح جسم پر اپنی شہوت، اپنی خواہش اور اپنی ہوس کے وار پہ وار لگاتی جا رہی تھی۔ وہ اس کمزور، بیمار مگر پاکیزہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ہلاک کر دینے کے درپے تھی۔

میں انجم بانو سے دور ہٹ گیا۔ وہ میری طرف بڑھی۔ میں نے اُسے جھٹک دیا۔ اس کی بڑی بڑی خالی آنکھوں میں انڈے کی سی زردی آکر بیٹھ گئی۔ ایسا لگا جیسے اُسے مرگی کا دورہ پڑنے والا ہو۔ وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے دانت بھنچنے لگے اور پورا جسم اکڑنے لگا۔ اس کا پیلا جسم اچانک ناقابل یقین طور پر سیاہ پڑنے لگا۔ انجم بانو پیلی سے کالی ہوگئی۔ میرے سامنے، ہاں بالکل میری آنکھوں کے سامنے۔

مگر میں واضح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک مقدس سیاہی تھی۔ ہوس زدہ روح نے پاکیزہ جسم سے بدلہ لیا تھا۔ مگر جسم نے بھی روح کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ میں تھوڑی دیر تک، ڈرا ڈرا اُسے یوں ہی دیکھتا رہا پھر جلدی سے باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔

انجم بانو تین دن اور ہمارے گھر میں رہی مگر نہ میں نے اُس کی جانب دیکھا اور نہ اس نے میری طرف نظر اُٹھائی۔ تین دن بعد اُس کا بھائی آکر اُسے واپس لے گیا۔ مگر اس بار بھی وہ لال کاغذ منڈھی رساول کی ہانڈی لانا نہیں بھولا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُس کا مرض لاعلاج بتایا تھا۔ اسے ایک بہت

خطرناک بیماری تھی۔ اس کا جسم خون بنا تا ہی نہیں تھا، سوائے اس کے کہ اُسے خون چڑھایا جاتا رہے۔ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

کیا کسی نے بھی اس پر غور کیا کہ محض روح کی پاکیزگی کے ڈنکے پیٹتے رہنے سے ہی کچھ نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ تو جسم کا ہے، جسم کی پاکیزگی ہی اصل شئے ہے۔ انسان کو چاہیے کہ شعور بالذات کی بات تو بہت ہو چکی، اب ذرا بدنام زمانہ مادّے کی بات بھی ہو جائے۔ مادّے کو بھی اُس کا جائز حق دیا جائے۔ آخر کب تک روح اپنے اعمال کی سزا جسم کو دیتی رہے گی۔

روح نے کیا سوچا ہے کہ اگر کبھی جسم اس کے احکام کی تعمیل کرنے اور اُس کی غلامی کرنے سے انکار کردے تو؟ تو پھر شاید دنیا کی تاریخ دوسری طرح سے لکھی جائے گی۔

ایک عرصے بعد میں نے سنا کہ انجم بانو کا انتقال ہو گیا۔ وہ جب تک زندہ رہی اُس کے جسم میں لگاتار خون چڑھایا جاتا رہا۔ مگر پھر اُس کے جسم نے دوسروں کا خون بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب بھی اُسے خون کی بوتل چڑھائی جاتی۔ تو اُس کے بعد اس کی ناک، کانوں اور منہ سے خون باہر آنے لگتا۔ مرنے سے ایک ماہ پہلے انجم بانو نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنتیں بالکل صاف اور پاک تھیں اور پرائی آلودگی، بدنیتی، چٹورے پن اور بھوک کے ہر نشان سے عاری تھیں۔

آخر انجم بانو کے جسم کی پاکیزگی نے سب کو ہرا کر رکھ دیا۔

افسردہ کر دینے کے لیے انسان کے پاس کتنی باتیں، کتنی یادیں ہوتی ہیں اور خوش ہونے کے لیے بہت کم۔ ماضی کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ ماضی کی مسرتوں اور خوشیوں کو بھی اگر یاد کریں تو وہ بھی ایک اُداسی اور افسردگی میں ہی بدل جاتی ہیں۔ گزرا ہوا وقت ہو بہو سامنے نہیں آتا — وہ ایک پریت کی خوفناک شکل میں سامنے آتا ہے۔ مردہ بندر کے پنجے یا ہڈی کی طرح۔

اکتوبر کا مہینہ بھی گزر گیا اور نومبر کا مہینہ آپہنچا۔ نومبر کا مہینہ دراصل کوئی مہینہ ہی نہیں۔ اس کا اپنا کوئی موسم ہی نہیں۔ یہ ایک زوال پذیر مہینہ ہے۔ اندھیری ڈھلان پر بے جان چٹانوں کی طرح

لڑھکتے ہوئے، نومبر کے یہ دن، راتوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہوئے۔ آنے والے سرد، گاڑھے، ہواؤں کے شور سے لدے پھندے، دسمبر کے اندھیروں کے انتظار میں پہلے سے ہی صفیں باندھیں، سیلوٹ کرتے ہوئے، نومبر کے یہ دن جو سال کے بارہ مہینوں میں کہیں اپنی کوئی انفرادی یا باوقار چھاپ نہیں چھوڑتے۔ موسم کے اعتبار سے، یہ معمولی، حقیر دن، گرتے ہوئے، جلدی سے غائب ہوتے ہوئے۔ ان کی چھاپ صرف اُن بدنصیبوں پر ہی پڑتی ہے جن کے سینے پر نومبر کا کوئی لڑھکتا ہوا پتھر آکر ٹھہر گیا ہو۔

روح کے پاگل پن کی سزا جسم کو جھیلنا پڑتی ہے۔

انھیں دنوں ایک پاگل بندریا نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ وہ بندریا ہر وقت حیض سے ہوتی رہتی تھی اور جب موقع ملتا، کسی نہ کسی کو کاٹ کھاتی۔ اُس زمانے میں مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ بندریوں کو بھی حیض ہوتا ہے، مگر جب میں نے اُس بندریا کی دُم پر خون کے دھبے دیکھے تو میں سمجھ گیا۔ آخر سائنس کے مطابق بندر ہی تو انسانوں کے آباؤ اجداد ہیں۔ انھیں حیوانوں کی ساری لعنتیں، انسان بھی بھگت رہے ہیں۔

رات کو سوتے وقت، ہر شخص کو خوف تھا کہ کہیں سوتے میں بندریا نہ آکر کاٹ لے۔ محلّے میں بہت سے لوگوں کو اس نے سوتے میں کاٹ لیا تھا۔

دن میں وہ، چھتوں اور منڈیروں پر ادھر اُدھر کودتی پھاندتی اور بھٹکتی پھرتی اور رات میں پتہ نہیں کہاں دُبک کر بسیرا کرتی۔

میں نے اُسے دیکھا تھا، وہ ایک قوی الجثہ بندریا تھی جس کی آنکھوں میں پاگل پن اور ایک بے قابو اور بے تکا غصہ بھرا رہتا تھا۔ اسے کوئی بیماری تھی۔ وہ شاید ہمیشہ حیض سے ہوتی رہتی تھی۔ یہ کوئی ایسی حیران کن بات نہیں۔ جسم کے اندر ہزار ہا پُر اسرار پہلو ہوتے ہیں۔ اس پاگل بندریا کی وجہ سے جاڑے کے یہ شروعاتی دن بڑی دہشت میں گزر رہے تھے، مگر ایک دن یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ سامنے والے گھر کی تین منزلہ عمارت کی چھت پر کودتے کودتے اچانک ٹپ سے سڑک پر گر پڑی۔ سارا محلّہ

اُسے دیکھنے بھاگا۔ میں بھی گیا۔

وہ سڑک پر مردہ پڑی تھی۔ اس کے منھ میں ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا پھنسا ہوا تھا۔ اس کے جسم کا نچلا حصّہ خون سے سنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں وہی پاگل غصہ لگا تار آسمان کی طرف تاکے جا رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی، مغرب کی اذان ہونے لگی۔ میں نے سوچا کیا بندریا نے بھی خودکشی کی ہے۔ لوسی کی طرح؟ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو یا نہ ہو۔ بڑھتی ہوئی تاریکی نے سڑک پر پڑی بدنصیب بندریا کی لاش کو ڈھک دیا۔
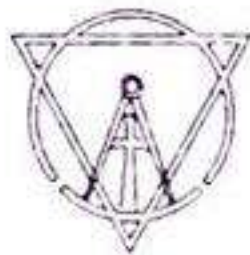
نومبر کے آخری دن تھے یا پھر دسمبر کی شروعات۔ مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے۔ بہرحال زمانہ یہی تھا جب نیازوں اور شادی بیاہوں کا دور آپہنچا۔ ان دنوں میں نے جتنی دعوتیں کھائیں، ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ میں چونکہ اب بھی گھر میں سب سے چھوٹا تھا بلکہ بچہ ہی تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے گھر کا ہر فرد دعوت میں مجھے ضرور ساتھ لے جاتا تھا۔ چاہے وہ محلّے کی کوئی شادی ہو یا پھر رشتہ داروں کے یہاں۔ وہ ایک عجیب منظر ہوتا۔ اس زمانے میں شادی ہال یا ہوٹلوں کا رواج نہ تھا۔ محلّے کا کوئی ایک نسبتاً بڑا مکان لے لیا جاتا۔ اس کے آنگن یا دالان میں لکڑی کی تین چار میزیں ملا کر لگادی جاتیں، ان میزوں پر کالے میل اور سالن اور چکنائی کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوتیں۔ میز پوش اگر ہوتے تو سالن کے پیلے پیلے دھبّوں سے بالکل رنگے ہوئے اور پانی سے تر بھی۔ میزوں کے دونوں جانب قطار سے لوہے کی بدرنگ اور بے حد تکلیف دہ کرسیاں لگائی جاتیں، میزیں اور کرسیاں دونوں اوپر نیچے ہلتی رہتی تھیں۔

لوگ اپنی باری کا انتظار الگ بیٹھ کر کم کرتے، وہ کرسیوں کے پیچھے اس طرح کھڑے رہتے جیسے کرسی غائب نہ ہوجائے۔ وہ کھانے والوں کا ہر ہر نوالہ گنتے اور بے چینی کے ساتھ کبھی ایک پاؤں پر زور دے کر ٹیڑھے ہوجاتے تو کبھی دوسرے پیر پر۔ کھانے والے خود بہت جلدی جلدی کھاتے۔ اکثر بغیر چبائے ہی نوالہ منہ میں رکھ کر نگل جاتے، وہ مربھکّوں کی طرح کھانے پر ٹوٹتے تھے۔

کھانے میں بہت زیادہ اشیاء نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر قورمہ روٹی (جسے وہ لوگ گوشت روٹی

کہتے تھے)ورنہ اگر صاحب حیثیت لوگ ہوتے تھے تو پلاؤ اور زردہ بھی ، ہمارے اطراف میں بریانی کا رواج نہیں تھا، حالانکہ آج کل تو پلاؤ کو بھی بریانی ہی کہا جاتا ہے۔

روٹیاں خمیری اور تندوری ہوا کرتیں۔ان روٹیوں کا حجم بہت بڑا ہوتا،تقریباً ایک تھالی جتنا۔

کھانا لا لا کر رکھنے والے بہت شور مچاتے ، ادھر اُدھر سے ایک دوسرے کو آواز لگاتے اور بے حد حواس باختہ نظر آتے۔ اکثر قورمے کا ڈونگہ کسی کھانے والے کے سر پر بھی چھلک جاتا،ایک ہائے توبہ مچی رہتی۔

ڈونگہ جیسے ہی میز پر رکھا جاتا،لوگ اُس میں سے بہتر بوٹیاں اور تاریعنی روغن نکالنے کے لیے ایک ساتھ جھپٹتے۔کبھی کبھی ڈونگہ میز پر ہی پلٹ جاتا،مگر کھانے والوں کو اس کی مطلق پروانہ ہوتی۔کوئی کسی کو نہیں پوچھتا، سب کو اپنی اپنی آنتوں کی فکر ہوتی۔ یہ ایسی ہی نفسانفسی کا منظر ہوتا جو شاید میدان حشر میں بھی نہ دکھائی دے۔

میزوں کے پاس المونیم کے ٹب رکھے رہتے جس میں جھوٹی رکابیاں پڑی رہتیں۔رکابیاں یا تو المونیم کی ہوتیں یا پھر سفید تام چینی کی۔ انھیں ٹبوں میں بوٹیاں، ہڈیاں اور روٹیوں کے پانی سے تر پھولے ہوئے ٹکڑے بھی بھرے رہتے جن پر مکھیاں ہی مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔

اس قسم کے ایک دوسرے ٹب میں پینے کا پانی بھرا رہتا۔اگر گرمیوں کے دن ہوتے تو ٹب پر لکڑی کا ایک تختہ رکھ کر اُس پر برف کی سلّیاں جمادی جاتیں۔ برف پگھل پگھل کر پانی میں گرتا رہتا اور اُسے ٹھنڈا کرتا رہتا۔اسی ٹب میں المونیم کے جگ ڈال ڈال کر پانی بھر کر میزوں پر رکھ دیا جاتا۔ بمشکل دو تین گلاس (وہ بھی المونیم کے ہی ہوتے) میز پر رکھے ہوتے یا ادھر اُدھر لڑھکتے پھرتے۔

کھانے والے،کھانا خوب برباد کرتے۔ رکابیوں میں ڈھیر سا سالن، ہڈیاں اور چکنی بوٹیاں نکالتے اور ناک تک کھانا ٹھونس لینے کے بعد ایسے ہی چھوڑ کر اُٹھ جاتے۔ وہ اس بے ہنگم انداز سے اُٹھتے کہ کرسیاں اُلٹتے اُلٹتے بچتیں اور میزیں اتنے زور سے ہلتیں کہ پانی سے بھرے جگ اُلٹ جاتے۔

روٹیاں بھی خوب برباد ہوتیں، بلکہ اُن کی تو بے حد بے حرمتی بھی کی جاتی۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ

میں نے کئی باریش حضرات کو اپنی سفید داڑھی پر لگے ہوئے شوربے اور مسالے کو روٹیوں کے ٹکڑے سے صاف کرتے دیکھا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے آج کل لوگ نیپکن کا استعمال کرتے ہیں۔ روٹیاں ہاتھ پونچھنے، منھ، ہونٹ اور ٹھوڑی صاف کرنے اور مرچ کی زیادتی کے سبب ناک سے نکلتے پانی کو صاف کرنے کے لیے اور شوربے میں بھیگی داڑھیاں پونچھنے کے لیے ایک بہترین اور مفت کے رومال کا کام انجام دیتی تھیں۔

اس ہنگامے اور شور پر طرّہ یہ تھا کہ لاؤڈ اسپیکر بھی چھت پر کہیں فٹ ہوتا اور اُس کا رُخ کھانوں کی جانب ہی ہوتا۔ لاؤڈ اسپیکر پر یا تو کسی نئی فلم کے واہیات گانوں کے ریکارڈ کان پھاڑ دینے والی آواز میں بجائے جاتے یا پھر حبیب پینٹر کی قوالیاں۔

(آج کی بوفے دعوتوں میں بھی جہاں سب کھڑے ہو کر اپنا کھانا نکالتے ہیں، اور کھڑے ہو کر کھانا کھاتے ہیں، نوعیت کے اعتبار سے کوئی بڑا فرق نہیں ہے)

کیا یہ میدانِ جنگ نہیں تھا۔

ہاں! ایک ایسا میدانِ جنگ جس میں انسان ایک دوسرے سے، اپنے اپنے دانتوں، اپنے جبڑوں، اپنی زبانوں اور اپنی آنتوں کے ذریعے لڑتے ہیں۔

یہی سب اُن کے ہتھیار ہیں جنھیں چلائے جانے کی لذت میں شرابور ہو کر وہ ایک دوسرے کی انسانی بھوک کا شکار کرتے ہیں۔

کون تھے وہ لوگ جو بھوک برداشت کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے؟

میں نے ایسے لوگ نہیں دیکھے۔ میں نے تو انسانوں کو اپنی اپنی آنتوں میں پتھر باندھ کر ایک دوسرے کی طرف پھانسی کے پھندے کی طرح پھینکتے دیکھا ہے۔ ایک کا گلا دوسرے کی آنتوں میں پھنسا ہوا ہے۔ آنتوں کی لمبائی خاص طور پر چھوٹی آنت کی لمبائی تو خدا کی پناہ!

خود میں بھی اسی بے رحم کھیل میں شامل ہوں۔ جاڑوں کی دوپہر میں، زمیندار گھرانے کی روایت کو سنبھالے ہوئے ہم سب دیسی گھی میں ڈبو ڈبو کر اُرد کی دال کی کالی کھچڑی کھاتے اور پھر سو جاتے۔ باقاعدہ لحاف اوڑھ کر سو جاتے، اور پھر عصر کے وقت جب اُٹھتے تو سب کا منھ سوجا سوجا اور

آنکھیں چھوٹی چھوٹی نظر آتیں۔ چاول اور ماش کی دال کا بادی پن اس حلیے کا ذمہ دار ہوتا۔

خود میرا بھی یہی حلیہ ہوتا۔ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا اور شرمندہ ہو جاتا۔ وہ آئینہ جو دالان کے اُس حصے میں لگا تھا جہاں سے باورچی خانہ بھی آئینے میں صاف نظر آتا تھا۔ خاص طور پر اُس کا چولھا اور ایک طرف رکھا یہ بڑا سا کالا توا۔

یہ سب مجھے شرمندہ کرتا تھا اور کرتا آیا ہے، مگر محض شرمندگی سے کیا ہوتا ہے؟

انسان کب سے شرمندہ ہوتا آیا ہے مگر اُس کی شرمندگی دنیا کا کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے لیے بھی جھاڑو نہ بن سکی۔

احساسِ جرم، شرمندگی، اپنے گناہوں کی فہرست، سب کو لیے لیے میں بھی زندگی جیتا رہا اور جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی ویسے ویسے میری زندگی میں بھیانک واقعات بھی بڑھتے گئے۔ کھانا کھانے سے زیادہ خوفناک گناہ بھی مجھ سے سرزد ہوئے ہیں۔ ایسے بھیانک واقعات جو ایک خفیہ تحریر کی مانند میرے دل میں ہمیشہ کے لیے دفن ہیں، مگر اب جب مجھے اپنے بچپن کے کھلونوں کو توڑ کر اُن کا پوسٹ مارٹم کرنے کی دھن سوار ہوگئی ہے، تو پھر مرے حافظے کو اُس مردہ خانے کی طرف رُخ کرنا ہی پڑے گا۔

ذہن کے مردہ خانوں میں مکڑیوں کے جالوں میں ٹھنڈی باسی سے لپٹی لاشیں اور خون کی بو میری یادداشت کو اُدھر — اس طرح کھینچے لیے جارہی ہے جیسے کوئی قصائی کسی گائے کے گلے میں رسّی ڈال کر اُسے مذبح کی طرف لے جاتا ہے۔

لاؤ تو ذرا دیکھوں، رسّی کا یہ پھندا میرے گلے کے ناپ کا ہے بھی یا نہیں؟
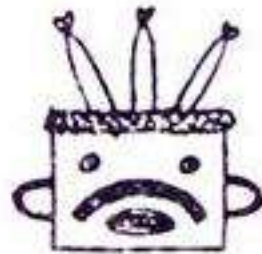
دسمبر کا مہینہ آ پہنچا۔ ایک شاندار مہینہ جس میں کہرے سے لدی راتیں کالی پلٹن کی طرح سڑکوں پر مارچ کرتی ہیں اور سڑکوں کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ یہ ایک باوقار مہینہ ہے۔ اُداسی اسے اور بھی زیادہ وقار اور تمکنت بخشتی ہے۔ رات کو تیز، سرد ہواؤں کے پاگل جھکوں میں انسان کا مقدر اپنی خطرناک تاریخ لکھتا ہے۔ دسمبر میں صبح کی دھوپ ایک ٹھٹھری ہوئی دھوپ ہے۔ دھوپ کو بہت وقت لگتا ہے، بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اپنی گرمی اور تپش کو واپس لانے میں اور جب تک سورج دوبارہ، دسمبر کے قہر سے کمزور ہو کر مغرب کی خندق میں لڑھکنے لگتا ہے۔

گھر کے آنگن تک میں کہرا جیسے اپنے پیروں پر چلنے لگا ہے۔ کہرے کے پیر نکل آئے تھے۔ اندھیرا کہرے سے اپنی بازی ہار گیا۔ وہ روشنی کا اتنا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

کالی سردی کے لوتھڑے چاروں طرف گر رہے ہیں۔ ذرا سی حرارت بھی نہیں اور اگر ہے بھی تو، سردی کی اس کالی راکھ میں، ایک تنہا انگارے کی مانند، دبی چھپی پڑی ہے۔ آسمان کہرے کی دُھند سے غائب ہے۔ اُس کا نیلا رنگ کہیں نہیں ہے۔ یہ ایک ادھورا آسمان ہے، بغیر ہاتھ پیروں کا۔ ایک کٹا پھٹا آسمان، ایک کمزور اور معذور فلک۔

انجم باجی کی شادی اِن خطرناک، مگر شاندار سردیوں میں ہوگی، ایک طرح سے اُن کے شایانِ شان مگر میرے لیے؟

مجھے اُس وقت تک کچھ پتہ نہ تھا کہ دسمبر میری زندگی کو ہمیشہ کے لیے ایک ایسی ریل گاڑی بنا کر

رکھ دے گا جو ایک سنسان، چھوٹے اسٹیشن پر اس لیے رُکی کھڑی رہے گی کہ کہرے میں اُسے کوئی سگنل نہ نظر آتا تھا۔ نہ ہرا، نہ لال۔ ریل گاڑی کی دھواں اُگلتی ہوئی سیٹیاں، اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ جائیں گی۔

انجم باجی کی شادی کا دن اور تاریخ طے ہو گئے۔ گھر میں ہر طرف چہل پہل ہونے لگی۔ دور کے رشتہ دار بھی آ کر ہمارے گھر رہنے لگے۔ مگر اس کے باوجود ایک گہرا سناٹا مجھے ہر وقت محسوس ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ سخت سردیاں اور دن رات چھائے رہنے والا کہرا ہو۔ اس ٹھنڈ میں ہڈیاں گلا کر رکھ دینے والی ہوا میں، رات کے وقت کوئی آنگن میں نہیں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ مگر باورچی خانے میں رات گئے تک رونق رہتی۔ رشتہ دار لڑکیاں، شادی شدہ عورتیں اور بوڑھی خواتین بھی چولہے کی گرم راکھ کے آگے باتوں کی محفل سجائے رکھتیں۔ صرف قہقہے ہی گونجتے رہتے اگرچہ کبھی کبھی مجھے کچھ کانا پھوسیوں کا بھی شبہ ہوا۔ میں ایک بھوت کی طرح باورچی خانے کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔

دن میں نسبتاً سناٹا ہوتا، کیونکہ زیادہ تر لوگ شادی کی تیاری اور لباس اور زیورات خریدنے کے سلسلے میں بازار گئے ہوتے۔ مگر دن میں کبھی کبھی آفتاب بھائی آتے، سگریٹ منہ میں دبائے اور اُن کی بے رحم اور بھوری آنکھیں، کینہ اور بغض سے چمکتی نظر آتیں۔ اُن کا بلڈاگ جیسا دہانہ کچھ اور نیچے کو لٹک جاتا تھا۔ وہ مجھے بہت قابلِ نفرت نظر آنے لگے، پہلے سے بھی زیادہ۔ وہ بہت عجیب دن تھے۔

ایک طرف آفتاب بھائی کی پُراسرار اور خطرناک تانکا جھانکی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی اور دوسری طرف انجم باجی سے بھی مجھے ایک ایسی خاموش مگر بھیانک شکایت پیدا ہو گئی تھی جسے میں آج تک کوئی نام نہیں دے سکا۔ اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ تلاش کر سکا۔ ظاہر ہے کہ وجہ بچکانہ رہی ہوگی، مگر اس بچکانے پن کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟

میں پریشان اور اُلجھا اُلجھا نظر آنے لگا۔ میں نے گھر کے افراد سے بولنا چالنا تقریباً چھوڑ دیا۔ مجھے بار بار پیشاب کی حاجت ہوتی۔ مجھے رُک رُک کر پیشاب آتا اور ہر وقت سانس سی پھولی محسوس ہوتی۔ میں ایک ناقابلِ فہم قسم کی بے چینی سے دوچار رہنے لگا۔ انجم باجی بھی کبھی کبھی اپنی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتیں۔ وہ اُن دنوں بہت اُداس نظر آتیں۔ مجھے اُن کی اُداسی پر غصہ آتا،

اور میں جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو کر اپنے خیالوں میں اُنھیں بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ اگرچہ اس گھناؤنے فعل میں مجھے کبھی کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔

اب میں سوچتا ہوں کہ اگر انجم باجی مجھے اُن دنوں اُداس اور افسردہ نہ نظر آتیں تو میری زندگی کا رُخ کُچھ اور ہی ہوتا۔ اگر انجم باجی، آفتاب بھائی کے لیے مغموم اور غمگین نہ ہو کر اپنے ہونے والے دولہا کے خوابوں میں، مسرت اور آرزو سے بھری ہوئی مگن رہتیں تو پھر یہ کرّہ ارض اپنی گردش کا انداز بدل دیتا۔

آفتاب بھائی میرے لیے نفرت کا ایک آفاقی تصور تھے۔ ایک گھناؤنی اور باسی خراب مچھلیوں سے آتی ہوئی سڑاندھ۔ اِس نفرت کی بُو گھر کے ہر گوشے میں رینگتی پھرتی تھی۔

ایسا کیوں تھا؟

مجھے نہیں پتہ۔ واقعی مجھے نہیں پتہ۔ انسانوں کا سب سے بڑا المیہ تو یہی ہے (اور کم از کم میرا المیہ تو واقعتاً یہی ہے) کہ انھیں جو معلوم ہونا چاہیے وہ آخری سانس تک نہیں معلوم ہو پاتا اور ایک بھید، ایک اسرار ہی بنا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مُردہ آدمی جس سے بڑا اسرار کائنات میں اور کوئی نہیں ہے۔ انسان کی لاعلمی اور اُس کی لاش مترادف ہیں۔ ایک راز دوسرے راز سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ پھر اسی دنیا کی کالی سردی اور کہرے میں گم ہو جاتا ہے۔

مگر وہ — جس کا علم نہیں ہونا چاہیے، وہ انسانوں کی احمق کھوپڑیوں پر لاسے کی طرح لٹکا رہتا ہے اور جس پر دنیا بھر کی سازشیں، محبتیں، نفرتیں اور خواہشیں اسی طرح آکر چپکتی، گرتی اور پھنستی رہتی ہیں جیسے آسمان میں اُڑنے والے کبوتر لاسے پر۔

ایک دن میرا غصہ اپنی حدوں کو پار کر گیا۔ میں نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے اور اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو باورچی خانے کی دیوار پر زور زور سے رگڑا۔ میں نے خاموشی، تنہائی میں اپنے پیروں کو زور زور سے زمین پر مارا، کیونکہ میں نے انجم باجی کو سسکیاں لے کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ بھی ایک کونے میں آفتاب بھائی کے شانے پر سر رکھ کر۔

یہ کتنا گھناؤنا اور کریہہ منظر تھا۔ اس کا کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

ناک سڑا دینے والی نفرت کے کاندھے پر ایک پاکیزہ خوشبو کا قالب۔

میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک پاکیزہ، پیلی سفیدی کو ایسی سفیدی میں مدغم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا جس میں لال رنگ چھپا ہو— لال رنگ۔ جسم میں خون کی زیادتی جسم میں زیادہ خون ہونا، بھدا تھا اور ہوس کی نشانی بھی۔

ہاں ہوس کی نشانی—!
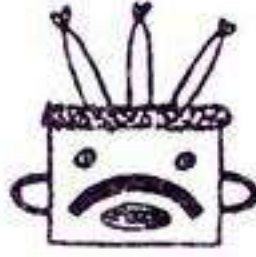
انجم باجی کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ باہر والے دالان کے مشرقی کونے والا برآمدہ جس کے سامنے باورچی خانے کی جالی تھی، وہاں دو تین رنگین چادریں لٹکا کر پردہ کردیا گیا۔ انجم باجی باندوں کے ایک پلنگ پر پیلے کپڑے پہنے بیٹھی تھیں۔ پیلا جمپر، پیلی شلوار اور پیلا دوپٹہ — اُن کے پاس صرف لڑکیاں اور عورتیں ہی بیٹھی رہتی تھیں۔ محرم مرد تو کبھی کبھی اندر جاسکتے تھے۔ مگر نامحرم مرد کا اندر آنا بالکل منع تھا۔ حالانکہ گھر کے وہ مرد بھی جن سے انجم باجی کا پردے کا رشتہ نہیں تھا، اُن کے پاس نہیں آتے تھے۔ تمیزن نام کی ایک بہت موٹی گوری اور تقریباً بڑھیا نائن اُن کو روز صبح وشام اُبٹن ملنے آتی اور انجم باجی کا رنگ واقعی روز بروز نکھرتا جاتا۔ میراثنیں بھی آتیں۔ وہ ڈھولک پر گیت گاتیں اور حرارے بھی دیتیں تاکہ انجم باجی کے اوپر کسی آسیب یا جن کا سایہ نہ پڑ سکے۔

انجم باجی کا مجھ سے پردہ نہ تھا۔ میں تو چودہ پندرہ سال کا ایک نابالغ بچہ تھا۔ میں آزادی اور بے فکری کے ساتھ انجم باجی کے پاس پردوں میں گھسا بیٹھا رہتا تھا۔ میرا رنگ تھوڑا سانولا ہے، اس لیے میں نے بھی اُبٹن لگایا۔ اُس ابٹن کی مہک مجھے آج تک یاد ہے۔ پیلے کپڑوں میں انجم باجی سونے کی بنی ایک دمکتی ہوئی مورتی سے مشابہہ تھیں۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہ کبھی کبھی ہی مسکراتیں ورنہ اپنی ازلی پاکیزگی کی اُداسی میں گم رہتیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا جب وہ اکیلی رہ جاتیں اور صرف میں اُن کے پاس بیٹھا رہ جاتا۔ ایسے لمحات میں، انجم باجی اپنے اُبٹن لگے گورے پیلے ہاتھ میرے سر پر پھیرتیں اور زیادہ تر ایک ہی بات دہراتیں۔

''گڈو میاں! میں چلی جاؤں گی تو تم رونا مت۔ بتاؤ روؤ گے تو نہیں؟'' میں اُن کی آواز میں

بھی پیلا پن محسوس کرتا۔

''نہیں۔''

مگر پھر ہوتا یہ کہ وہ خود ہی آہستہ آہستہ رونے لگتیں۔ ایک بے آواز سا رونا جیسے ایک خاموش بارش درختوں پر گرتی ہے۔ جب درخت ساکت و جامد ہوتے ہیں۔ آس پاس کہیں کسی ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ صرف اُن کے آنسو گرتے۔ ان آنسوؤں کو وہ اتنی جلدی جلدی اپنے پیلے دوپٹے سے پونچھ دیتیں کہ وہ ٹھیک سے نظر ہی نہیں آتے، یا اگر نظر آتے ہوں گے تو دوپٹے کے زرد لہریے، اُن آنسوؤں کو بھی جذب کر کے پیلا کر دیتے تھے۔

اور یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ آخر اُن کے ہاتھ پیلے ہونے والے تھے۔

ایک دن آفتاب بھائی نے مجھے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ ''گڈو میاں۔''

میں نفرت سے بھرا ہوا اُن کے پاس پہنچا۔ اُنھوں نے اپنی جیب سے دو کتھئی رنگ کی گولیاں نکالیں اور کہا، ''گڈو میاں! یہ گولیاں اپنی انجم باجی کو دے آؤ، کہنا کہ گرم دودھ سے کھانی ہیں۔''

''کیا اُن کی طبیعت خراب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! اُن کے سر میں شدید درد رہتا ہے۔ یہ سر درد کی دوا ہے۔ فوراً جا کر دے آؤ۔''

آفتاب بھائی محلّے کے ایک ڈاکٹر کے یہاں کمپاؤنڈری کرنے لگے تھے اور اکثر گھر والوں کو چھوٹی موٹی بیماری میں مفت دوائیاں لا کر دیتے رہتے تھے۔

میں نے اُن دو کتھئی گولیوں کو حقارت اور نفرت کے ساتھ دیکھا۔ مجھے ایک بار پھر انجم باجی پر شدید غصہ آیا۔ اُن کے سر میں درد تھا تو وہ مجھ سے کہتیں۔ میں اُن کا سر دبا دیتا۔ آفتاب کی لائی ہوئیں یہ ذلیل گولیاں بھلا کیا کریں گی؟ مگر طوعاً و کرہاً مجھے وہ گولیاں لے جا کر انجم باجی کو دینی ہی پڑیں۔ اُس وقت وہ واقعی اپنا سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے انجم باجی پہلے سے زیادہ دُبلی بھی نظر آئیں۔

''دودھ لاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ بعد میں کھاؤں گی۔'' انجم باجی نے گولیاں اپنے زرد دوپٹے میں باندھ کر گانٹھ لگالی۔

مگر دودھ کے نام پر مجھے دودھ جلیبیاں یاد آگئیں۔ میں بچپن سے ہی تھوڑا چٹورا بلکہ بدنیت تو تھا ہی۔

''لو دودھ جلیبی۔'' انجم باجی نے ایک کٹوری میری طرف بڑھادی۔

مایوں میں اُنھیں نمک دینا بھی بند کر دیا گیا تھا۔ وہ صرف میٹھا کھا سکتی تھیں۔ زیادہ تر دودھ جلیبی۔ جو بھی عورت اُن سے ملنے آتی، تو کسی برتن میں دودھ جلیبی لے کر ضرور آتی۔ ورنہ انجم باجی کے ہاتھ میں ایک دو روپے دودھ جلیبی کے نام پر تھما کر چلی جاتی۔ یہ ایک رسم تھی جس کا سب سے زیادہ فائدہ میں اُٹھا رہا تھا۔ میں شکم سیر ہو ہو کر دودھ جلیبی کھا رہا تھا۔ دسمبر کی راتوں میں تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ بے حد سرد، ان ہواؤں میں مایوں کے پردے زور زور سے پھڑ پھڑاتے۔ برآمدے میں ہاتھ پیر گلا کر رکھ دینے والی سردی چلی آتی۔ انجم باجی پیلے غلاف اور پیلے استر والی رضائی میں سکڑی بیٹھی یا گھٹنے موڑے لیٹی رہتیں۔ ان کی سہیلیاں بھی اپنی اپنی رضائیوں میں گھسی پتہ نہیں کون کون سی باتیں کرتیں رہتیں۔ ہنسی اور ٹھٹھولے کرتی رہتیں پھر رات جب زیادہ گزر جاتی اور باہر آنگن میں کہرا اتنا شدید پڑنے لگتا کہ دالان میں لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی تک کالی نظر آنے لگتی تو سب اونگھنے لگتے۔

مجھے بھی نیند آنے لگتی اور میں وہاں سے اُٹھ کر اندر والے دالان میں اپنی چارپائی پر آکر لیٹ جاتا اور لحاف اوڑھ لیتا۔ جہاں میرا اکن کٹا خرگوش لحاف میں گھسا پہلے سے ہی میرا انتظار کر رہا ہوتا۔

مگر اُس رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ ایک تو یہ کہ رات کے کھانے میں قورمہ تیار کیا گیا تھا اور یہ پتہ چلتے ہی میرا دل دھڑکا تھا اور میں ایک جاسوس کتے کی مانند چوکنا ہو گیا تھا۔ آج قورمہ پکنا شاید ایک بدشگونی ثابت ہو۔ مگر پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ کسی تقریب میں تو ایسے کھانے پکتے ہی ہیں۔ تو یہ میرا محض وہم بھی ہوسکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ ان دنوں میری چھٹی حس زیادہ متحرک اور فعال نہ تھی۔ میں اپنی تمام تر ذہنی اور جسمانی توانائیوں کے ساتھ محض انجم باجی کی شادی میں ہی مگن تھا۔

انجم باجی کی شادی میں صرف تین دن باقی بچے تھے۔ میں اپنے لحاف میں کبھی ایک طرف کروٹ بدلتا، کبھی دوسری طرف۔ پورے گھر میں سناٹا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ کل رت جگے کی رسم ہونی تھی۔ انجم باجی کی طرف، مایوں میں بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کی سہیلیاں بھی تھک کر سوگئی تھیں۔

باہر دسمبر کی ہواؤں کے سرد اور دہشت ناک جھکڑ چل رہے تھے۔ ان ہواؤں میں، دالے میں لٹکی لالٹین کبھی ادھر ڈولتی کبھی اُدھر۔ جس کے سبب دالان میں دیواروں پر پڑنے والی، اشیا کی پرچھائیاں بار بار اپنا رُخ بدلتیں، اور ہر رُخ مجھے پُراسرار اور ڈراؤنا محسوس ہوتا۔

اچانک مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی اُٹھ کر آنگن میں جا رہا ہو۔ مجھے تھوڑا خوف محسوس ہوا، مگر میں اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ جاسوسی ناول پڑھتے پڑھتے میرے اندر ایک بے تکا، بےمحل اور بچکانہ تجسس بہت پیدا ہو گیا تھا۔

میں دبے پاؤں اُٹھا، کہرے میں ایک سایہ، باورچی خانے کے دروازے پر نظر آیا۔ میں تو انجم باجی کے تاریک سائے کو بھی پہچان سکتا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی برتن تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں میں نے اُس برتن کو بھی پہچان لیا۔ یہ دودھ جلیبی کی ایک چھوٹی سی بالٹی تھی۔ وہ اسے باورچی خانے میں رکھنے جا رہی ہیں۔ میں نے سوچا۔ مگر یہ مایوں کے پردے سے اُٹھ کر باہر کیوں آ رہی ہیں اور وہ بھی باورچی خانے میں؟

مگر نہیں...! میں ٹھٹک گیا۔ باورچی خانے کی دہلیز پر ایک اور سایہ بھی موجود تھا۔

طویل القامت سایہ، جس نے انجم باجی کا ہاتھ پکڑ کر زور سے اندر کھینچا تھا۔ پھر باورچی خانے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

میں جلدی سے زینے کی چوتھی سیڑھی کی طرف پہنچا۔

یہاں بیٹھ کر باورچی خانے کی جالی میں سے اندر کا منظر نظر آ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا— باورچی خانے میں اندھیرا ہے بھی اور نہیں بھی۔ مٹی کے تیل کی ڈبیہ جل رہی ہے جس کی دھندلی روشنی اندھیرے سے بہت مشابہ ہے۔

آفتاب بھائی نے انجم باجی کو بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ وہ اُن پر ایک آدم خور درندے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔

''تم کتے ہو، کتے، ذلیل کتے۔'' انجم باجی کے منھ سے آواز نکلتی ہے۔ آفتاب بھائی نے ایک زوردار تھپڑ اُن کے گال پر رسید کیا۔

''کتے ـــ تو نے مجھے وہ گولیاں کیوں کھلائیں؟'' انجم باجی رونے لگیں۔

''اس لیے ...اس لیے کہ تیرا خصم پہلی رات کا مزہ نہ لوٹ سکے۔''

''مگر مجھے پرواہ نہیں۔ میں اسی حالت میں تجھے ابھی اسی وقت...'' آفتاب بھائی کی آواز ایک شیطانی آواز تھی۔

پھر وہ انجم باجی کو دھکا دے کر فرش پر گرا دیتے ہیں۔ مٹی کے تیل کی ڈبیہ کی روشنی میں، مایوں کے پیلے پاکیزہ لباس میں اُبٹن سے مہکتا ہوا اُن کا جسم، باورچی خانے کے کھر نجے کے فرش پر بے سدھ پڑا ہے۔

آفتاب بھائی اس جسم پر جھکتے ہیں۔ اب منظر صاف نہیں ہے۔ میں زینے کی چوتھی سیڑھی پر اُچک اُچک کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا ـــ مگر نہیں مجھے آواز نظر آتی ہے۔ میں آواز دیکھتا ہوں، آوازنہیں بلکہ آوازیں جیسے کوئی کسی بکری کو ذبح کرتا ہے۔ تیز تیز سانسیں، دبی دبی چیخیں جو دسمبر کی کالی سردی کی وحشت ناک ہواؤں میں کبھی اُبھرتی ہیں، کبھی دب جاتی ہیں۔ آم کا درخت اِن ہواؤں میں لگاتار جھومے جا رہا ہے جیسے پاگل ہو گیا ہو۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے زور کی سردی لگ رہی ہے۔ میرے دانت کٹکٹا رہے ہیں۔ چھت کی ویران منڈیروں پر سے گھومتی، چکراتی ہوئی ہوا زینے کی سیڑھیوں پر ہوک رہی ہے۔ میں اپنی پیٹھ پر اِس ہوا کے بھیانک وار کو محسوس کرتا ہوں، جیسے کوئی میری پیٹھ پر دوہتڑ مار مار کر بین کر رہا ہو۔ سناٹے میں ایک رونے کی آواز... شاید زمانہ گزر گیا ہے۔ جب جا کر باورچی خانے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہاں سے باہر آ کر طویل القامت سایہ تاریک آنگن میں کہیں غائب ہو گیا ہے۔

میں اپنے سُن ہو گئے، برف جیسے پیروں سے لڑکھڑاتا ہوا ٹھوکریں کھاتا ہوا، زینے کی چوتھی سیڑھی سے نیچے اُترتا ہوں۔ میں آ رہا ہوں ـــ بغیر کچھ سوچے سمجھے، بنا کسی ارادے کے، میں باورچی خانے میں آ رہا ہوں اور میرے دانت زور زور سے بج رہے ہیں۔ پیٹ میں اینٹھن ہو رہی ہے۔

میں آ گیا ـــ میں باورچی خانے میں آ گیا۔

مٹی کے تیل کی ڈبیہ کی اُس منحوس کالی روشنی میں، میں دیکھ رہا ہوں۔ انجم باجی چولہے سے پیٹھ

لگائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہیں۔

اُن کے لمبے کالے بال کھل کر فرش کو چھو رہے ہیں۔ ان کی پیلی، مایوں کی شلوار پر قورمے کے دھبے ہیں، کیا قورمے کی دیگچی اُلٹ گئی ہے؟

قورمہ...؟ نہیں، اب مجھے صاف دکھائی دینے لگا ہے۔

یہ قورمہ نہیں ہے... یہ خون ہے، یہ خون کے تازہ دھبے ہیں۔ یہ دھبے اُن کے دوپٹے پر بھی ہیں۔ جو مڑا تڑا، بے چارگی کے ساتھ چولھے پر پڑا ہوا ہے۔ اور... اور جمپر پر بھی ہیں۔ مایوں کے کپڑے خون سے سن گئے۔

فرش پر دودھ جلیبی کی بالٹی کھل کر ایک طرف لڑھک گئی ہے۔ دودھ کی ایک سفید لکیر کھرنجے پر آگے رینگتے رینگتے، اچانک رُک گئی ہے۔ ایک کاکروچ اُس لکیر پر بیٹھا ہے۔ مجھے دھوکہ ہوا ہے، جیسے دودھ جلیبی میں بھی خون مل گیا ہے۔

باورچی خانے میں اُبٹن کی خوشبو ہے، مگر اب اس میں خون کی بو بھی تیزی سے شامل ہوتی جارہی ہے۔

خون... یہ کیسا خون ہے؟ کون سا خون ہے؟

وقت سے پہلے شروع ہوگئی ماہواری کا؟

کنوارے پن کے ضائع ہوجانے کا؟

یا دونوں کا؟

شاید دونوں خون آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے دُکھتی آنکھوں سے نکلنے والے پانی میں آنسو۔

کچھ نہیں معلوم — یہ ایک ایسا بھید ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔

''گڈو میاں...'' انجم باجی گھٹی ہوئی آواز میں چیختی ہیں۔

وہ اُٹھتی ہیں اور مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگتی ہیں۔ اُن کے رونے کی آواز باہر چلنے والی سرد اور دانت کٹکٹا کر رکھ دینے والی ہوا معلوم ہوتی ہے۔

''تم کسی سے کچھ کہو گے نہیں، تمھیں میری قسم ہے۔'' وہ ہچکیاں لیتی ہیں۔

میں چپ رہتا ہوں۔

''اگر تم نے کسی سے کچھ بھی کہا، تو میں مرجاؤں گی۔ سنا تم نے گڈو میاں! تمھاری انجم باجی مرجائے گی۔'' وہ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔

میں رونے لگتا ہوں۔

انجم باجی چولھے پر پڑا اپنا پیلا، خون سے سنا دوپٹہ اُٹھاتی ہیں اور میرے آنسو پونچھنے لگتی ہیں۔ دوپٹے میں خون ملے اُبٹن کی بو آتی ہے جو سیدھی میری آنکھوں میں اُتر جاتی ہے۔ مگر وہ آنکھوں تک ہی نہیں ٹھہرتی، آنکھوں سے آگے بھی ایک دنیا ہے، وہ اُسی دنیا میں پھیل جاتی ہے۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ، میرا ہاتھ پکڑے پکڑے باہر آتی ہیں۔ مجھے لپٹا کر پیار کرتی ہیں۔

''گھبرانا نہیں... مجھے ذرا سی چوٹ آگئی ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یہ خون اُسی چوٹ سے نکلا ہے۔''

انجم باجی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔ اور اُسی طرح کانپتے لرزتے پیروں کے ساتھ غسل خانے کی طرف چلی گئی ہیں۔ جہاں سے تھوڑی دیر بعد باہر آکر وہ واپس چپکے سے مایوں جا کر بیٹھ جائیں گی۔

میں آنگن میں خاموش کھڑا ہوں۔ میرے اوپر کہرا گر رہا ہے۔ میں آسمان کی طرف نظر اُٹھاتا ہوں۔ سوائے سیاہی کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

میں اپنے بالوں کو چھوتا ہوں۔ کہرے نے اُنھیں گیلا کر دیا ہے۔ میرے ہاتھ بھی گیلے ہو جاتے ہیں۔ میں ان ہاتھوں کو سونگھتا ہوں۔ وہاں ایک عجیب بو ہے۔ ایسی بو جس میں اُبٹن، مہندی، پھول، قورمہ، دودھ جلیبی اور خون تک کی بُو شامل ہے۔

باہر اندھیری گلی میں کوئی آوارہ بلی زور سے چیختی ہے۔

مجھے نہیں یاد — اب مجھے یاد نہیں۔ انجم باجی کی شادی کی کوئی اور تفصیل مجھے نہیں یاد سوائے اس کے کہ سرخ جوڑے میں ملبوس ایک بے حد دُبلی پتلی دلہن روتی سسکتی گھر سے رخصت ہوگئی اور میں گھر کی چوکھٹ پر کھڑا، خاموش اس کی پالکی کو جاتا دیکھتا رہا۔

بہت دنوں بعد، شاید تین سال بعد جب انجم باجی اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب سے واپس آئیں تو میں اُنھیں پہچان نہ سکا۔ وہ بہت موٹی اور گول مٹول سی ہوگئی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کا قد ٹھگنا سا محسوس ہوتا تھا۔ ان کا پورا جسم قیمتی زیورات سے لدا ہوا تھا، مگر وہ ایک الگ داستان ہے جسے میں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔

انجم باجی کی شادی کے بعد مجھے اتنا اکیلا پن نہیں محسوس ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس کا سبب شاید میرے اندر پلتے رہنے والا ایک خطرناک اور پُر اسرار غصہ تھا۔ میں نے اپنے وجود کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اس غصّے کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ یہ ایک لال پیلا غصہ نہ ہوکر ایک سیاہ غصہ تھا جس میں مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا اور یہی بات میرے سکون کا باعث تھی۔ غصّے کے اس سیاہ سائے سے میں ہمیشہ بغل گیر رہتا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے ساتھی کو جکڑے رہتا تھا۔ کئی ماہ گزر گئے۔ میں اپنی پڑھائی بھی دل لگا کر کرتا رہا۔ آفتاب بھائی، اُسی ڈاکٹر کے یہاں ایک کمرے میں رہنے لگے، جہاں وہ کمپاؤنڈری کرتے تھے۔ ہفتوں مہینوں میں کبھی گھر آتے اور وہی نفرت انگیز سگریٹ پھونکتے رہتے۔ جس کی بُو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر بھی آئی کہ

اُنھوں نے چھپ کر شادی کرلی ہے۔ پتہ نہیں، میں تو اُن کے پاس جاتا بھی نہیں تھا جبکہ اُنھوں نے مجھے کئی بار بلایا بھی تھا۔ میں آفتاب بھائی سے اس لیے نہیں ملتا تھا کہ ایک دن تو مجھے اُن سے ملنا ہی تھا۔ میں اپنے وجود میں پلنے والے تاریک غصّے کے حکم کی تعمیل کرتا تھا اور آفتاب بھائی سے ملنے کے لیے مجھے اُس کے اشارے کا انتظار تھا۔

انجم آپا کے گھر ہفتے میں دو تین بار ضرور جاتا تھا مگر اب ہم جاسوسی ناولوں کی باتیں نہیں کرتے تھے، خود میری دلچسپی بھی جاسوسی ناولوں میں کم ہوگئی تھی۔ میں غیر ملکی ادب کے تراجم پڑھنے لگا تھا۔ خاص طور پر روسی ادب کے شاہکار ناولوں کے تراجم۔

انجم آپا کو اِن چیزوں سے نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اُن میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ اُنھیں سمجھ سکتیں۔ جہاں تک میرا سوال تھا تو میں چار پانچ ماہ میں ہی بہت بڑا ہوگیا تھا۔ میری شکل وصورت یا قد میں کوئی واضح تبدیلی آئی ہو یا نہیں مگر میرے جسم کے اندر رہنے والی روح کی عمر میری جسمانی عمر سے بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ کبھی کبھی میری روح کے پیر میرے جسم کی چادر سے باہر نکلنے لگتے تھے اور میں گھبرا کر اپنے غصّے کا کالا، بھیانک ہاتھ تھام لیا کرتا تھا۔ ایسے وقتوں میں وہی مجھے سہارا دیتا تھا۔

مگر انجم آپا سے مجھے اُنسیت ہمیشہ سے تھی اور بارہا میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ شاید وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ انجم باجی سے بھی زیادہ۔ لیکن اس کا اظہار وہ کبھی نہ کرسکیں۔ اس کی کچھ وجوہات رہی ہوں گی جن کا علم مجھے تب ہرگز نہ تھا، البتہ اب میں کچھ اندازہ لگا سکتا ہوں۔ بہر حال ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے انجم آپا سے اُنسیت تھی یا اُنسیت کا التباس تھا کیونکہ شاید میں خود اس بات کے لیے تڑپ رہا تھا کہ کوئی مجھے چاہے، کوئی... یعنی کوئی لڑکی۔ اپنی ماں کے فوت ہوجانے کے بعد سے انجم آپا بہت پریشان، بدحال اور افسردہ سی رہنے لگی تھیں۔ اور اُن کے والد جلد ہی اُن کا بیاہ کردینے کے لیے سرگرداں تھے۔

میں اکثر سوچتا کہ انجم آپا کو کچھ لطیفے سنا کر ہنسنے ہنسانے پر مجبور کردوں مگر یہ مجھ سے کبھی ممکن نہ ہو سکا کیونکہ اوّل تو مجھے لطیفے یاد ہی نہیں رہتے تھے اور اگر کوئی لطیفہ یاد کرکے میں سنانا بھی چاہتا تو میرا

ساتھی، اُن دنوں کا وہ کالا، پُراسرار غصہ مجھ سے اپنی بانہیں چھڑانے لگتا۔

نہیں، ہرگز نہیں! میں کسی بھی قیمت پر اپنے غصّے سے جدا نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے لیے گلا پھاڑ کر ہنسنا حرام تھا، اسی لیے میں انجم آپا کو کبھی خوش نہ کر سکا مگر اُن کی خالی اور اُداس آنکھوں میں اپنے لیے پیار کی ایک ایسی چمک ہمیشہ دیکھتا رہا جو جگنو کی چمک سے مماثل تھی۔ جلتی بجھتی — پھر جلتی پھر بجھ جاتی۔

مگر یہ سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ آخر ایک دن بہت خاموشی اور سادگی کے ساتھ انجم آپا کا نکاح پڑھا دیا گیا اور اس طرح وہ گول، چپاتی کی مانند، چیچک زدہ چہرہ جو مجھے بہت اپنا اپنا سا لگتا تھا میری دنیا سے دور ہو گیا۔ وہ چہرہ جس کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے بھوک لگنے لگتی تھی اور میری آنتیں کڑکڑانے لگتی تھیں۔ اُسی منحوس لال گھونگھٹ میں چھپ کر پالکی میں گم ہو گیا جس طرح انجم باجی کا چہرہ ایک دن گم ہو گیا تھا۔

مگر مجھے اُس وقت یہ علم نہیں تھا کہ چہرے واپس آتے ہیں۔ لوگ واپس آتے ہیں، بھلے ہی اُن کے رویے، اُن کے جسم اور اُن کی روحیں بدلی ہوئی ہوں۔

انسانوں کا یہی مقدر ہے۔ ازل سے اور ابد تک یہی رہے گا

نور جہاں خالہ کو نہانے کا مراق ہو گیا۔ چھ چھ گھنٹے نہاتی تھیں۔ غسل خانے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھیں۔ یہاں تک تو خیر برداشت کر لیا گیا مگر کچھ عرصے بعد وہ صابن، تولیہ اور بالٹی میں پانی بھر کر باورچی خانے کے اندر جانے لگیں۔ وہ باورچی خانے میں نہانے کی کوشش کرنے لگیں جہاں سے اُنھیں بڑی مشکل سے کھینچ تان کر باہر نکالا جاتا، مگر دو تین بار وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو چکی تھیں۔ دماغی بیماریوں کے معالج کو دکھایا گیا۔ اس نے اُن کے دماغ کے ایک خاص حصے پر فالج کا اثر بتایا۔ کچھ دوائیں دے کر اُس نے یہ دلاسا دیا کہ کچھ عرصے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

وہ دماغوں پر فالج گرنے کا زمانہ تھا۔ جس کو دیکھو اُس کے دماغ پر فالج گر رہا تھا۔ یہاں تک کہ عصمت چچا ممّا (وہ ایک طرف سے رشتے میں چچا ہوتے تھے اور دوسری طرف سے ماموں اس لیے میں اُنھیں چچا ممّا کہتا تھا) گاؤں سے، جو ہمارے گھر سے دس کوس دور تھا، ہمیشہ کی طرح اس سال بھی جب رساول کی ہانڈی لے کر آئے تو گھر کی چوکھٹ تک پہنچتے پہنچتے اُن کے دماغ پر فالج گر چکا تھا۔ وہ رساول کی ہانڈی لیے بار بار پاخانے کی طرف دوڑتے تھے۔ جب اُن کو پکڑ کر قابو میں کیا گیا تو وہ زور زور سے چیختے... ''میں رکھوں گا، باورچی خانے میں، اپنے ہاتھ سے رساول کی ہانڈی رکھوں گا۔''

گویا ایک وبا پھیلی ہوئی تھی، عجیب و غریب وبا، کہیں نہ کہیں سے کسی کے اس وبا کے شکار ہونے کی خبر آتی ہی رہتی۔

حد تو یہ ہے کہ خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک پاگل چوبارات گئے باورچی خانے

میں گھومتا پھرتا تھا اور کسی طرح بھی چوہے دان میں نہ پھنستا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو لڑھکا رہتا تھا، یقیناً چوہے کے دماغ پر بھی فالج گر گیا تھا اور اُس کی یادداشت ٹھیک سے کام نہیں کر رہی تھی۔ شاید وہ باورچی خانے کو چوہے دان سمجھتا تھا۔ جس سے نکلنے کے لیے وہ رات کے سناٹے میں بے تُکی اُچھل کود کرتا رہتا تھا اور وہیں ایک کونے میں روٹی کے ٹکڑے سمیت لگے ہوئے چوہے دان کو باورچی خانہ سمجھتا تھا جہاں تک پہنچ پانا اُس کی دانست میں ممکن ہی نہ تھا۔

مجھے تو یہ بھی وہم ہے کہ شاید چیونٹیاں بھی اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھیں، کیونکہ اُن دنوں وہ قطار بنا کر چلنے میں ناکام تھیں۔

ریحانہ پھوپھی اس وبا کی ذمہ دار دیوالی کی جادو کی ہانڈی کو سمجھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس بار دیوالی کی ہانڈی نے کئی بار، رات میں مسلمانوں کی بستی کے اوپر گشت لگایا تھا۔ جادو کی ہانڈی میں دیا جلتا ہوا اُنھوں نے صاف دیکھا تھا اور ہانڈی سے نکلتی بھیانک زناٹے دار آواز کو بھی سنا تھا۔ مجھے صحیح علم تو نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ دماغ پر فالج گرنے کی جتنی خبریں ہمارے گھر آئی تھیں، وہ مسلمانوں کی ہی تھیں۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ کچھ موسم کا اثر بھی ہو سکتا تھا۔

فروری کے آخری دن تھے۔ سردی اور گرمی دونوں آپس میں اونچا نیچا یا چور چھپا کے کھیل رہے تھے۔ سردی گرمی جب ایک ساتھ ہوتیں ہیں تو بڑی عجیب اور ناقابلِ فہم بیماریاں پھیلتی ہیں۔

اُدھر باورچی خانے میں کاکروچ بڑھتے جاتے تھے۔ دن میں وہ برتنوں کے پیچھے چھپے رہتے تھے اور رات میں جب کھانا سمیٹ دیا جاتا تھا تو آرام کے ساتھ فرش پر ادھر اُدھر دوڑ لگاتے پھرتے تھے۔ میں تو چونکہ رات میں بھی، ایک آدھ بار باورچی خانے میں شکر پھانکنے کے لیے ضرور جاتا تھا، اس لیے پاگل چوہے اور کاکروچوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔

عجیب زمانہ تھا، ہر طرف دماغی فالج زدہ لوگ بک بک کرتے اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتے نظر آتے۔ ان کی جھک اور بکواس نے چاروں طرف ایک شور مچا رکھا تھا اور میں اس شور میں ہر وقت ہانڈیوں کے ڈھکن اُٹھا اُٹھا کر کھانوں کے رنگ دیکھتا رہتا تھا۔ سرخ رنگ کا کھانا، ہرے رنگ کا کھانا، پیلے اور نارنگی رنگ کا کھانا، بینگنی رنگ یہاں تک کہ سفید اور سیاہی مائل کھانا بھی مگر۔ نیلے رنگ کا کھانا

مجھے آج تک نہیں ملا۔

آخر نیلے رنگ کا کھانا کیوں نہیں؟ میں سوچا کرتا۔ شاید اس لیے کہ نیلے رنگ کا کھانا یا تو آسمان سے اُترتے ہوئے فرشتوں کا ہو سکتا تھا یا پھر شیطانوں کا۔ ایک زہریلا کھانا۔ اس لیے اچھا ہی تھا کہ نیلے رنگ کے کھانے کا وجود نہیں تھا کیونکہ انسان کو آج تک فرشتے اور شیطان میں فرق محسوس کرنے کی تمیز پیدا نہیں ہو سکی۔

پھر ایک دن ریڈیو پر یہ خبر آئی کہ دماغی فالج کی وجہ آنتوں میں پائے جانے والے کچھ جراثیم ہیں۔ پیٹ اور آنت کی بیماریوں کی وجہ سے ہی لوگ دماغی طور پر غیر متوازن ہو رہے ہیں۔ اور ایک خاص قوم، مذہب، نسل اور خطّے کے لوگ پیٹ اور آنتوں کی بیماریوں کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

پتہ نہیں اس میں کتنی سچائی تھا، ممکن ہے کہ یہ ایک جھوٹ اور پروپیگنڈہ ہی ہو۔ مگر لوٹ پھر کر پھر وہی آنتیں، پھر وہی معدہ، پھر وہی بھوک اور بدہضمی، پھر وہی کھانا، پھر وہی آگ اور پھر وہی باورچی خانہ۔

باورچی خانہ — جو گھر کے سب سے مخدوش مقام کا نام ہے۔

بارہ وفات آگئی، گھر گھر میں موم بتیاں جلا جلا کر روشنیاں کی گئیں۔ میں نے گھر کی ہر اندھیری کوٹھری، ہر تاریک گوشے اور ہر طاق میں موم بتی روشن کی۔ بارہ وفات کا جلوس نکلا۔ نیاز و نذر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے گھر میں مٹی کے پیالوں میں فیرنی جمائی گئی۔ جب میں، رات کو آنگن میں بیٹھا فیرنی کھا رہا تھا تو اچانک مجھے انجم باجی کے ہاتھ کی پکائی ہوئی فیرنی کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہ فیرنی پر چاندی کا ورق اتنے سلیقے اور نزاکت کے ساتھ لگاتی تھیں کہ مٹی کا پیالہ جگمگا اُٹھتا تھا۔ جیسے وہاں سے چاند طلوع ہو رہا ہو۔

مگر اس وقت میرے اندر چاند نہیں بلکہ اندھیرا طلوع ہو رہا تھا۔ غصّے کا وہ تاریک سایہ، وہ میرا ساتھی، اچانک طویل القامت ہو گیا۔ وہ میرے قد سے بہت اونچا اور لمبا ہو گیا۔ وہ مجھ سے باہر آنا چاہتا تھا۔ اور میں اپنے ٹھگنے قد کے ساتھ مکمل طور پر اُس کی دسترس میں آتا جا رہا تھا۔ وہ اب میرا ساتھی

نہ ہو کر میرا آقا بنتا جا رہا تھا۔

''آج فیرنی نہیں پکنی چاہیے تھی۔ زردہ ٹھیک رہتا۔'' میرے کان کو میری ہی منحوس، لمبی اور کالی زبان نے چاٹا۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا، لال چمکدار کاغذ سے منڈھا ہوا ہوا کے ساتھ روشن ایک قندیل سست روی کے ساتھ اندھیرے میں اُڑتا چلا جا رہا تھا۔

''میں بھی ایک دن قندیل کی مانند، ہوا کے ساتھ اس تاریک آسمان میں اُڑوں گا۔ میں نے سوچا۔
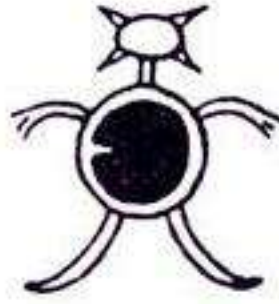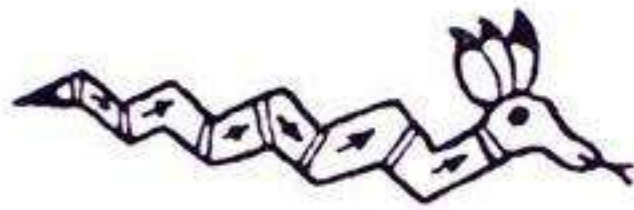
دوسرے دن صبح صبح گھر کی کنڈی بجی۔ صبح صبح گھر کی کنڈی کا بجنا اُس زمانے میں کسی کی موت کی خبر آنا تھا اور وہی ہوا۔ معلوم ہوا کہ گاؤں میں عصمت چچا ممّا ریل سے کٹ کر مر گئے۔ اُنہوں نے خودکشی نہیں کی تھی۔ وہ تو رساول کی ہانڈی لے کر کسی رشتے دار کے گھر جا رہے تھے، مگر جس کو وہ سڑک یا پگڈنڈی سمجھ کر چلتے جا رہے تھے، وہ دراصل گاؤں کے قریب سے نکلنے والی ریل کی پٹری تھی۔

عصمت چچا ممّا کا کمزور اور تقریباً بوڑھا ہو چلا جسم، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا اور رساول کی ہانڈی پرزے پرزے ہو کر واپس مٹی کی جون میں آ گئی۔

یہ خبر سنتے ہی گھر کے تمام افراد پریشانی اور عجلت میں گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ صرف نور جہاں خالہ اور اچھن دادی رہ گئیں۔ اچھن دادی تو کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث بالکل معذور ہو چکی تھیں اور بستر سے اُٹھ کر چلنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

وہ بستر پر ہی حوائج ضروریہ سے فارغ ہوتی تھیں اور اب اُن کے جسم پر جگہ جگہ زخم بھی پڑ گئے تھے، کیونکہ وہ کروٹ بھی نہیں لے پاتی تھیں۔ اُن کے کھانے پینے کی اشیاء اُن کے سرہانے ہی رکھی ہوتیں، جنھیں جب اُن کی طبیعت چاہتی، ہاتھ اُٹھا کر منہ میں ڈال لیتیں۔ باقاعدہ کھانا کھانا تو نہ جانے کب کا چھوٹ گیا تھا، مگر بہرحال اُن کے پیٹ میں ابھی آنتیں زندہ تھیں اور اسی لیے اُن کے بستر کے قریب پہنچتے ہی بدبو کا ایک زبردست بھبکا ناک میں جاتا تھا۔ اِس لیے میں اُن کے پاس جانے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔

نور جہاں خالہ ہمیشہ کی طرح زیادہ تر وقت نہانے یا نہانے کی کوشش میں ہی گزارتی تھیں۔ کبھی کبھی آنگن میں ہی کپڑے اُتار کر نہانا شروع کر دیتیں اور اُنھیں بڑی مشکل سے قابو میں کیا جاتا۔ باورچی خانے کو غسل خانہ سمجھتی تھیں اور غسل خانے کو باورچی خانہ۔ نور جہاں خالہ نے گھر کے سب لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ عصمت چچا ممّا کے کٹ کر مرنے کی خبر سنتے ہی وہ فوراً اپنا جمپر اُتارتے ہوئے باورچی خانے میں نہانے کے لیے بھاگیں۔ اُنھیں آہستہ آہستہ اپنے ننگے ہونے کا احساس بھی ہونا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ آخر گھر والوں کو اُنھیں تقریباً زبردستی گود میں اُٹھا کر غسل خانے لے جانا پڑا، جہاں اُنھوں نے لوٹا بھر بھر کر نہانا شروع کر دیا۔

''گڈو میاں تم گھر رہنا۔ آج اسکول کی چھٹی کر لو۔'' بڑے ماموں نے چلتے چلتے کہا تھا۔

گھر خالی ہو گیا مگر میرا دل نہیں گھبرایا بلکہ مجھے ایک آزادی کا احساس ہوا۔ ایک خطرناک بیکراں آزادی۔ وجود کے اندر پھیلتا ہوا ایک وسیع تر سفید صحرا جس میں کالے سائے اپنی اصل شکل و صورت اور خدوخال کے ساتھ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی، جا کر دروازہ کھولا۔

سامنے آفتاب بھائی کھڑے تھے۔ اپنی بھوری بے رحم رنگت اور آنکھوں کے ساتھ۔ منھ میں وہی گھٹیا اور بدبودار سگریٹ تھا۔

آفتاب بھائی اندر آ گئے۔

''کیا ہوا؟ گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟''

''نہیں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''عصمت چچا ممّا مر گئے۔''

''ہوں ــــ اچھا! دیکھو یار گڈو میاں باورچی خانے میں کچھ کھانے کو ہے؟ میں نے ناشتہ نہیں کیا۔ بڑی بھوک لگی ہے۔''

وہ شاید اپنی بیوی (یا جو بھی ہو) سے لڑ کر آ رہے تھے۔ وہ آنگن سے باورچی خانے کی طرف

بڑھنے لگے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، مگر میرے پاؤں کی ہڈیاں نفرت کے بھیانک بوجھ سے کڑکڑا رہی تھیں۔ اور گھٹنوں کی پیالیوں نے جیسے گھومنا بند کر دیا تھا۔ آفتاب بھائی نے برتن اور ہانڈیاں کھکوڑنا شروع کر دیں۔ میں چپ چاپ باورچی خانے کی چوکھٹ سے لگا کھڑا تھا۔

آخر اُنھیں ایک ہانڈی میں رات کی پکی فیرنی مل ہی گئی۔ وہ فرش پر اُکڑوں بیٹھ گئے اور ایک چمچہ ہانڈی میں ڈال کر جلدی جلدی فیرنی کھانے لگے۔ میری طرف سے اُن کی پیٹھ تھی۔

''کڈو میاں پانی لاؤ۔'' اُنہوں نے بغیر گردن موڑے ہوئے کہا۔

میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ میرے پیروں کے پاس مسالہ پیسنے کی پتھر کی وزنی سل رکھی ہوئی تھی۔ اور میرا کن کٹا خرگوش اُس سل پر اُچھل کود کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پاگل چوہا جس کے دماغ پر فالج گر گیا تھا اور جو صرف رات میں ہی اپنے بل میں سے باہر نکلتا تھا۔ آج دن کی روشنی میں بھی، اپنا سر ایک طرف کو ڈھلکائے ہوئے آٹے کے کنستر کے پیچھے سے چلتا ہوا چولہے کی طرف جا رہا تھا۔

میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ برتنوں کے پیچھے دُبکے ہوئے کاکروچ بھی باہر آ کر فرش پر رینگنے لگے ہیں۔

اچانک میرے اندر پلنے والا وہ تاریک، طویل القامت سایہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ میرے دونوں ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ میرے ہاتھ ایک عفریت کے ہاتھوں میں تبدیل ہو گئے۔

اب ان ہاتھوں کی اپنی الگ دنیا تھی، الگ ذہن اور الگ شخصیت اور الگ اعصابی نظام۔ یہ ہاتھ میرے باقی جسم اور میرے دماغ کے تئیں مکمل اجنبی تھے۔

ہاتھوں نے مجھے جھکنے کے لیے کہا۔ میں جھکا اور میرے ہاتھوں نے پتھر کی اُس وزنی سل کو اس طرح اُٹھا لیا جیسے کوئی زمین پر پڑا ایک سوکھا ہوا زرد پھول اُٹھا لیتا ہے۔ سل پر ہلدی کا رنگ جم گیا تھا۔

آفتاب بھائی اُسی طرح اُکڑوں بیٹھے بیٹھے، ہانڈی میں سے فیرنی کھا رہے تھے۔ میں اُنھیں منھ چلاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اُن کی پیٹھ بار بار ایک فحش انداز میں جنبش کرتی نظر آتی تھی۔ میں نے اس فحش منظر کو شاید پہلے بھی کہیں دیکھا ہو، یا محسوس کیا ہو۔

پتھر کی سل کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اونچا اٹھائے اٹھائے، میں ننگے پیر بہت آہستگی کے ساتھ آفتاب بھائی کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اُن کے سر پر پہنچ گیا۔ اُبٹن اور خون کی ملی جلی بو نے میری ناک کے نتھنوں کو چھولیا۔

اپنی سانس روک کر، تمام طاقت کے ساتھ پتھر کی سل کو تھوڑا اور اونچا اٹھائے ہوئے، میں نے اُسے آفتاب بھائی کے سر پر دے مارا۔ اُن کے منھ سے ایک آواز نکلی جیسے کوئی زور سے ڈکار لیتا ہے۔ مگر یہ چیخ ہرگز نہ تھی۔ انھیں چیخنے کی بھی مہلت نہ ملی۔

اُکڑوں بیٹھے بیٹھے اُن کا سر فرش پر جا کر لڑھک گیا۔ وہ سر جو پوری طرح کچل گیا تھا۔

میرے ہاتھوں سے سل چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ سل پر آفتاب بھائی کے بھیجے کے ریشے اور خون کے چھیچھڑے چپک کر رہ گئے۔

کھیر کی ہانڈی اپنی جگہ ویسی کی ویسی ہی رکھی تھی۔ مگر آفتاب بھائی کے منھ، حلق اور آنتوں تک میں پھنسی ہوئی سفید فیرنی باہر آکر کھرنجے کے فرش پر پھیل گئی۔

وہ پاگل اور مخبوط الحواس چوہا اُسے دیکھ کر مایوس، واپس آٹے کے کنستر کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کی یادداشت کام نہیں کر رہی تھی، وہ فیرنی کو پہچان نہ سکا۔

مگر میں نے صاف صاف اور واضح طور پر دیکھا اس میں مجھے رتّی بھر بھی شبہ نہیں ہے۔ ایک کاکروچ فیرنی کی ہانڈی کے پاس بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ پھر شاید وہ ہنسا بھی تھا۔

میں نہ جانے کب تک وہاں اسی حالت میں کھڑا رہا۔ باورچی خانے کے فرش پر گاڑھے خون کی ایک لکیر آگے بڑھتی جاتی تھی۔

غسل خانے میں سے لگاتار، نور جہاں خالہ کے لوٹے بھر بھر کے جسم پر پانی ڈالنے کی وحشت انگیز آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دنیا مافیہا سے بے خبر نہانے میں گم تھیں۔

تب آفتاب بھائی کی لاش کے قریب کھڑے کھڑے، اچانک جیسے مجھے ہوش آیا، میری سمجھ میں آگیا کہ میں نے آفتاب بھائی کا قتل کر دیا ہے۔ ان کی سفید قمیص اور بھوری پتلون ہی اس قتل کا حلیہ تھی۔

دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ سورج کا رُخ ٹھیک باورچی خانے کی طرف تھا۔ وہاں تیز چمک اور روشنی پھیل گئی۔ اور میرے دماغ میں بھی۔

میں وہاں سے اُلٹے پاؤں بھاگا اور اندر والے دالان میں جا کر جلدی جلدی اسکول کی یونیفارم کی خاکی پتلون پہنی۔ سفید قمیص تو پہلے سے ہی پہن رکھی تھی۔ کرمچ کے سفید پی ٹی جوتے پہنے اور پھر اپنے اسکول کا بستہ اُٹھایا۔ اسے گلے میں ڈالا اور سب کچھ ایسے ہی چھوڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ باورچی خانے میں آفتاب بھائی کی لاش کو چھوڑ کر اور غسل خانے میں نور جہاں خالہ کو نہاتا چھوڑ کر اور وہاں سے گرتے ہوئے پانی کی آوازوں کو چھوڑ کر، میں گھر سے دور، شاہراہ پر آ کر ایک چھوٹی سی پُلیا پر بیٹھ گیا۔ اسی راستے پر تھوڑا آگے چل کر میرا اسکول تھا اور اسکول کی چھٹی ہونے میں ابھی کم از کم دو گھنٹے ضرور تھے۔ پھر پُلیا سے نیچے اُتر کر میں نے پانی میں اپنے ہاتھ دھوئے۔ مجھے دھوکہ ہوا اب کچھ چھوٹی مچھلیاں میرے ہاتھوں کی طرف لپکی تھیں۔ مگر ہاتھوں پر خون کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہاں خون کی کوئی بو نہ تھی۔

میں پُلیا کے نیچے بہتے پانی میں اپنا چہرہ دیکھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ چہرہ پانی میں اُگے ہوئے سیوار میں پھنس گیا تھا۔

تیسرے پہر جب اسکول کی چھٹی ہوئی اور بچے باہر نکلنے لگے، تب میں بھی اُنھیں میں شامل ہو کر گھر کی طرف واپس چلنے لگا۔

مجھے خنکی سی محسوس ہوئی۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ اب اتنی دیر بعد، پہلی بار مجھے اپنے پیروں میں ہلکی سی کپکپاہٹ اور جسم میں جھرجھری کا احساس ہوا۔

جیسے جیسے گھر پاس آتا جا رہا تھا، میرے پیر من من بھر کے ہوتے جاتے تھے۔ میرا سر گھومنے لگا۔ میں گھروں کی دیواروں کا سہارا لے کر چلا۔

میرا بستہ میرے گلے میں اول جلول ڈھنگ سے ادھر اُدھر ڈول رہا تھا، اور میں اسے سنبھال پانے میں ناکام تھا۔

میرے کندھے جھک رہے تھے۔ بستے کا بوجھ اچانک اتنا بڑھ گیا کہ مجھے لگا میری کمر ٹوٹ

جائے گی۔ گلا بہت خشک ہو گیا۔ میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کی مگر تھوک ندارد تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ نا جانے کب سے میں نے پیشاب نہیں کیا ہے۔ شاید میرے گردوں میں پیشاب کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ میرے سارے وجود میں ایک خوفناک خشکی پھیلنے لگی۔
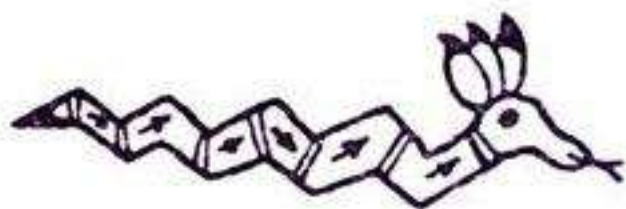
آخر وہ گلی آگئی جس کے بائیں موڑ پر میرا گھر تھا۔

وہاں ایک جم غفیر تھا۔

نیلی بتی والی، پولیس کی ایک گاڑی گلی کے موڑ پر کھڑی تھی۔ میں ہمت سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ اب میرا خوف ہی میرا حوصلہ اور میرا سہارا تھا اور پیروں کی کپکپاہٹ ہی میرے چلنے کی طاقت تھی۔ یہ نہ ہوتی تو شاید میرے پیر پتھر کے ہو جاتے۔

گھر خاکی وردی والوں سے بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی جا چکی تھی۔ پولیس والے ایک ایک کا بیان لے رہے تھے۔ نور جہاں خالہ اور اچھن دادی تک کا بیان لیا گیا، جب میری باری آئی تو میں نے کہہ دیا کہ صبح سے اسکول میں تھا۔ اور ابھی آیا ہوں۔ پولیس کو میرے اوپر کوئی شک نہیں ہوا۔ ورنہ اسکول سے یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ میں آج اسکول نہیں پہنچا تھا، مگر قسمت نے میرا ساتھ دیا۔

بعد میں، پولیس کے چلے جانے کے بعد بڑے ماموں نے مجھ سے یہ باز پرس ضرور کی کہ میں نے اُن کا کہا کیوں نہیں مانا۔ مگر وہ صرف ایک باز پرس نہیں تھی کیونکہ بعد میں انھوں نے گہری سانس لے کر یہ بھی کہا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ میں اسکول گیا ہوا تھا۔ شاید انھیں یہ اندیشہ ہوا ہو کہ اگر میں گھر پر ہوتا تو میری جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

''یہ ضرور کنپٹی مار کا کام ہے۔'' چھوٹی خالہ نے کہا۔

اُن دنوں ایک مجرم جو نفسیاتی مریض تھا، لوگوں کے گھروں میں گھستا پھرتا اور کسی ہتھیار کے ذریعہ کسی بھی تنہا شخص کا قتل کر کے چلتا بنتا۔ پولیس کو ابھی تک اُسے گرفتار کرنے میں کامیابی نہیں ملی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس انسپکٹر کچھ سپاہیوں کے ساتھ دوبارہ آیا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ اس کنپٹی مار کا کام ہو۔ مگر اُس کے قتل کرنے کا طریقہ بالکل الگ ہے۔ وہ اپنے عجیب وغریب ہتھیار سے ہی آدمی کی جان لیتا آیا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ وہ ہتھیار اُس سے کہیں گر گیا ہو یا چھوٹ گیا ہو۔ اس لیے ہم نے تو گھر کی تلاشی لے ہی لی مگر آپ لوگ بھی اپنے طور پر اس امکان کو نظرانداز نہ کریں اور اُس ہتھیار کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔''

پولیس والے چلے گئے تھے مگر ہمارا گھر رشتہ داروں سے اور محلے والوں سے بھر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے بہت زور کی سردی لگنے لگی۔ میرے دانت بجنے لگے۔ میرے اوپر لحاف ڈال دیا گیا۔ میں نے کسی کو کہتے سنا۔ ''بچہ ہے — بری طرح ڈر گیا ہے۔ اسے بخار آرہا ہے۔''

اور یقیناً وہ آرہا تھا۔ میں نے بخار کے قدموں کی دھمک کو اپنے کانوں کے ٹھیک قریب سنا۔ میری کنپٹیاں تپتی ہوئی سلاخوں جیسی ہوگئیں۔ ماتھا اس طرح جل رہا تھا کہ اُس پر چنے بھونے جاسکتے تھے۔ میں جس بستر پر لیٹا تھا اس کی چادر اتنی گرم ہوگئی تھی کہ لگتا تھا تھوڑی دیر میں دھواں دے کر سلگنے لگے گی۔

میں ہوش سا کھونے لگا۔ مجھے لگا کہ میں باہر سڑک پر پڑا ہوا ہوں۔ اور میرے اوپر چیل کوے اُڑ رہے ہیں۔ مری یادداشت بخار کے بھبکوں میں پرزے پرزے ہوکر ہوا میں اُڑ رہی تھی۔

کیا میرے دماغ پر بھی فالج گر گیا ہے۔ کیا یہ فالج کی بارش ہے؟ ایک گرم تپتی جلتی ہوئی بارش؟ میں نے ہوش کھوتے ہوئے سوچا۔ اس کے بعد صرف کچھ آوازیں تھیں جو میں سنتا تھا۔ اور انہیں آوازوں سے مجھے اپنے زندہ ہونے کا گمان گزرتا تھا۔

''ایک سو پانچ اعشاریہ سات۔''

''ایک سو چھ۔''

بار بار کوئی میرے منھ اور بغل میں کوئی لجلجی سی سلائی لگا دیتا تھا۔
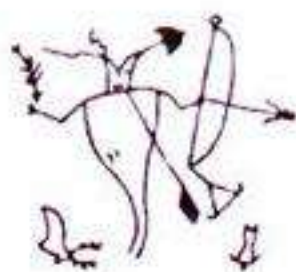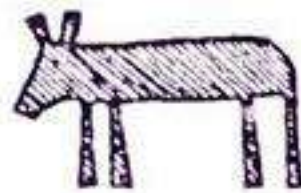
"ماتھے پر برف کے پانی میں بھیگی پٹیاں رکھو۔"

ماتھے پر کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا سا لگتا ہے۔

میرے کورس میں چلنے والی جغرافیہ کی کتاب کا وہ حصہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس میں سرد ممالک کا بیان ہے۔ میں اس صفحے پر ایک اُڑتی ہوئی مکھی کی طرح جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ میں ایک بڑے بڑے بالوں والا کتا ہوں جو برف پر کتا گاڑی کھینچتا چلا جارہا ہوں۔ میں برف کی ڈھلانوں میں پھسل رہا ہوں جہاں قطب شمالی کا سفید بھالو مجھے بھیانک نظروں سے دیکھتا ہے۔

"انجکشن لگا کر دیکھتے ہیں ورنہ اسپتال میں بھرتی کرنا پڑے گا۔" بازو میں ایک گندی سی چبھن ہوتی ہے جو ٹھیک میرے دل تک پہنچتی ہے، سوئی ہے، سوئی دل پر جا کر لگنے والی سوئی۔

میں ثروت ممانی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ وہ بہت غصہ ور آنکھوں سے کشیدہ کاری کر رہی ہیں۔ وہ رومال پر سوئی اس طرح چلا رہی ہیں جیسے قینچی چلا رہی ہوں۔ رومال چیتھڑوں اور دھجیوں میں بدلتا جاتا ہے۔

اب دوائیں کھانے کے بعد میرے جسم سے پسینے کی ٹلّیاں بہنے لگی تھیں۔ سارا جسم ہر وقت پسیجا اور گیلا گیلا محسوس ہوتا تھا۔ مگر چند گھنٹوں بعد مجھے ایک ہلکی سی جھرجھری محسوس ہوتی۔ میرا جی چادر اوڑھنے کو کرتا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ یہ جھرجھری اور یہ سردی، اُس کے آنے کی علامت تھی۔ وہ ابھی دور ہے مگر اُس کے قدموں کی چاپ کو میرا جسم اُسی طرح سن لیتا تھا جیسے دور سے آتی قدموں کی چاپ کو سن کر کتا **بھونکنے لگتا** ہے۔ اور پھر وہ آتا۔ وہ یعنی بخار اور اپنی بھیانک تپش کے بھورے غبار میں میرے

جسم کا سارا پسینہ سوکھ جاتا۔ جس کے چاروں طرف بخار ایک بگولے کی مانند دیر تک چکراتا رہتا۔ جسم کے ریشے ریشے میں آگ پھیل کر ساری نمی، ساری سیلن کو جلائے دیتی تھی۔

نہیں معلوم۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب میں سرسامی کیفیت سے واپس آیا۔ بخار ابھی بھی تھا۔ مگر ایک سو ایک سے زیادہ نہیں بڑھتا تھا۔ مجھے صرف دودھ اور پھل دیے جاتے تھے۔ روٹی کھانے کی مجھے اجازت نہ تھی۔ کمزوری تھی، مگر اتنی بھی نہیں کہ میں چل کر پیشاب پاخانہ کرنے بھی نہ جاسکوں۔

ایک روز صبح صبح مجھے پیٹ میں سخت درد اور جلن کا احساس ہوا۔ میں بیت الخلا گیا مگر مجھے اجابت نہیں ہوئی۔ بجائے اس کے وہاں ڈھیر سا خون آیا۔ خون دیکھتے ہی میں چکرا کر، قدمچے پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف لڑھک گیا اور میرا سر بری طرح دیوار سے ٹکرا گیا۔ چھوٹے چچا اور بڑے ماموں نے کچھ دیر بعد مجھے بیت الخلا سے نکالا ہوگا۔ سب گھبرا کر روہانسے سے ہونے لگے۔ میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی دیر بعد اسپتال کا ڈاکٹر مجھے دیکھنے آیا۔ اُس نے سب سے پہلے میری آنکھیں چیر کر دیکھیں اور کہا۔

''یرقان ہوگیا ہے، یہ خون بھی اسی وجہ سے آیا ہے۔''

تو مجھے یرقان ہوا تھا۔ شام ہوتے ہوتے مجھے گھر اور دنیا کی ہر شے پیلی نظر آنے لگی۔ میرے پیشاب کا رنگ ہلدی کی طرح ہوگیا۔ میرے جسم کی کھال پر جیسے زرد سفوف سا مل دیا گیا تھا جو شاید بستر پر بھی جھڑتا رہتا تھا۔

پیٹ میں ہلکا ہلکا سا درد رہتا تھا۔ پیٹ بُری طرح سوج بھی گیا تھا۔ ڈاکٹری علاج کے علاوہ ایک مولانا صاحب صبح صبح سورج نکلنے سے پہلے یرقان کو ایک کپڑے سے جھاڑنے بھی آنے لگے۔ وہ ساتھ ساتھ کچھ سورتیں بھی پڑھتے جاتے تھے۔

اب دودھ اور چکنی اشیاء مجھے سختی سے منع کردی گئیں۔ مجھے صرف اُبلے ہوئے چاول، آلو اور شکر کا گھول یا پھر گنّے کا رس ہی دیا جاتا رہا۔

چاول اور آلو بغیر مسالے کے اور بالکل سفید رنگ کے تھے مگر مجھے ہمیشہ یہ پیلی ظاہری ہی نظر آئی۔ کچی کھانڈ اور گنّے کا رس بھی مجھے پیلا پیلا نظر آتا تھا۔ میں ایک زرد فتنے یا آندھی کی زد میں تھا۔

میرا جی ہر وقت مالش کرتا تھا مگر اُلٹی یا قے ایک بھی نہ ہوئی۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے کوئی لجلجی شے ہے جو بار بار میرے پیٹ سے گلے تک آکر واپس لوٹ جاتی ہے۔

مگر میری سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے ہر شخص کی شکل، اُس کا جسم اور اُس کے کپڑے زرد نظر آتے تھے۔ جیسے سب مایوں بیٹھے ہوئے ہوں۔ ہر طرف اُبٹن کی ایک افسردہ خوشبو پھیلی ہونے کا دھوکہ بھی مجھے ہوتا تھا۔ میری آنکھوں کی پتلیاں مکمل طور پر پیلی ہو چکی تھیں۔

میں بس بستر پر لیٹا، دن رات ایک زرد دنیا کا تماشہ دیکھ رہا تھا اور اس امر پر کچھ نازاں بھی کہ یہ تماشہ صرف میں دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھیں اُن سب کی آنکھوں سے الگ ہیں۔ میری آنکھیں اس وقت دنیا کو ایک الگ رنگ اور ایک الگ روشنی میں دیکھنے پر بھی قادر تھیں۔

اُنھیں دنوں بستر پر لیٹے لیٹے میں نے سنا کہ آفتاب بھائی کے قتل کے سلسلے میں پولیس نے اُن کی بیوی کے دو بھائیوں کو گرفتار کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بیوی کے بھائیوں کو اُن کی شادی منظور نہ تھی اور اکثر وہ آفتاب بھائی کو مار ڈالنے کی دھمکی دیتے رہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں ایک یرقان زدہ، صرف پولیس، حوالات، ریمانڈ، تھرڈ ڈگری، مقدمہ، عدالت، گواہی، پیشی اور ضمانت کے بارے میں ہی گفتگو اور چہ میگوئیاں سنتا رہتا تھا۔

مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات نکلا۔ کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا، بلکہ جلد ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔

ہوا یوں کہ پولیس نے، ایک رات اُس بدنام زمانہ کنپٹی مار کو گولی مار کر گرا دیا جب وہ کسی کا قتل کر کے فرار ہو رہا تھا۔ گولی اُس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

کنپٹی مار گرفتار ہوا اور اُس نے اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لیا مگر سب سے زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ اُس نے آفتاب بھائی کو قتل کرنے کا بھی اعتراف کر لیا، اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ میرے لیے ایک معمّہ ہے۔

ایک رات میں نے بخار میں جلتے جلتے جب آنکھیں کھولیں تو وہ میرے سامنے کھڑا تھا بالکل

عُریاں۔ وہ بہت ٹھگنے قد کا تھا۔ وہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ جیسے اُسے ہلدی سے رنگ دیا گیا ہو۔ اُس کی کنپٹی پر ایک سیاہ گہرا سوراخ تھا۔ جس میں سے لگاتار پیلا خون نکل کر بہتا ہوا، گردن سے پنڈلی تک آتا ہوا فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا، پھر آگے بڑھا۔ سامنے ہی پھانسی کا پھندا جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر غور سے دیکھا، اس بار وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسا بھی تھا۔ اب اُس نے میری جانب پشت کر لی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کالی رسّی کے پھندے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ چلتا تھا تو اس کے جسم سے ہلدی کا بُرادہ فرش پر گر گر کر بکھرتا جاتا تھا۔

زرد کنپٹی مار، پھانسی کے کالے پھندے میں جھول گیا۔ وہ اس وقت یوں نظر آتا تھا جیسے آسمان میں رکی ہوئی پیلی آندھی پر اکّا دکّا کالے بادلوں کی گھنی اور موٹی لکیریں۔

تقریباً ایک ماہ بعد لوٹ پوٹ کر میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔

اب سارا دھیان میں نے اپنی پڑھائی کی طرف لگانا شروع کر دیا۔ میں گیارہویں جماعت میں آ گیا۔

مزے کی بات یہ تھی کہ یرقان سے صحت یاب ہونے کے بعد میرا وزن بڑھنے لگا۔ میری ہڈیاں چوڑی ہونے لگیں۔ میری بھوک بہت کھل گئی تھی۔ میری آنتیں اب پہلے سے بہت زیادہ خوراک کی طلب گار تھیں۔ اپنے ساتھ گزرے ہوئے بھیانک واقعے کو شاید میرے بخار اور میرے یرقان نے میرے ذہن سے اس طرح پونچھ کر صاف کر دیا تھا جیسے کوئی فرش پر پڑی گندگی کو گیلے کپڑے سے پونچھ دیتا ہے۔

مگر اُس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کچھ نہ کچھ جراثیم، کچھ نہ کچھ باقیات تو رہ ہی جاتے ہیں۔ اُنھیں نہ کوئی کپڑا صاف کر سکتا ہے، نہ کوئی صابن اور نہ کوئی تیزاب۔

وقت اچھا گزر رہا تھا، جب میں نے سنا کہ انجم آپا اپنے گھر واپس آ گئی ہیں۔

مجھے خوشی ہوئی۔ وقت اور اچھا گزرے گا میں نے سوچا۔ پھر اُسی شام انجم آپا کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا۔

اس ارادے کے ساتھ ہی میرا دل شاید خوشی سے بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ میں نے کچھ کتابوں کے نام سوچنے شروع کر دیے جن سے شاید انجم آپا کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔
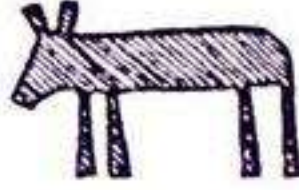
اس بات کی رتّی برابر بھی پروا کیے بغیر کہ جمعرات کی شام، جبکہ دونوں وقت گلے مل رہے تھے، اور مُردے اپنی اپنی قبروں میں فاتحے کے کھانے کا بے چارگی کے ساتھ انتظار کر رہے ہوں گے، میں ایک کے بعد ایک قبریں پھلانگتا ہوا انجم آپا کے گھر کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔

وہ باورچی خانے میں ہی ایک پٹلی پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔ دُبلی اور پہلے سے زیادہ کالی۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اُن کا قد پہلے سے زیادہ ٹھگنا محسوس ہوا۔ وہ ایک ایسی پتھر کی مُورت لگیں جس کے پیر اور پنجے آہستہ آہستہ گھس رہے ہوں۔

انجم آپا کی آنکھیں سونی پڑی تھیں۔ مگر شاید یہ آنسوؤں کے آنے سے پہلے کا سونا پن تھا۔ یا آنسو راستہ بھٹک گئے تھے کیونکہ اُن کی ناک سے لگاتار پانی بہہ رہا تھا۔

''انجم آپا؟''

''گڈو میاں۔''

''انجم آپا، انجم آپا۔'' میں نے دہرایا۔

''گڈو میاں۔'' اُنھوں نے خلا میں ہاتھ بڑھائے۔ شاید وہ ٹٹول رہی تھیں اور تب میں نے غور کیا کہ اُن کی آنکھیں سونی ہونے کے علاوہ ساکت وجامد بھی تھیں۔

میں اُن کے بالکل قریب چلا آیا۔ ان کے کپڑوں سے مسالوں کی خوشبو آ رہی تھی، جو زیادہ تر باورچی خانے میں وقت گزارنے والی ہر گھریلو عورت کے بدن سے آتی ہے۔

انھوں نے میرے بال چھوئے۔ میرا سر سہلایا۔

''سنا ہے تم بہت بیمار ہو گئے تھے۔'' اُن کی آواز کی ترنگوں میں کسی ایک ارتعاش کی کمی تھی۔ ایک بہت جانا پہچانا اور مانوس ارتعاش جو اب غائب تھا۔

''ہاں۔''

''میں تمھیں دیکھنے نہ آ سکی، مجھے معاف کر دو۔''

''ارے چھوڑو انجم آپا۔ پتہ ہے ایک نیا ہیبت ناک ناول آیا ہے، ''آسیبی بلّی''۔ کل تمھارے لیے لے کر آؤں گا۔''

''نہیں۔'' انجم آپا نے سسکی لی۔

''کیوں؟ تمھیں تو بھیانک اور ہیبت ناک ناول بہت پسند تھے۔''

''تو پھر... تمھیں پڑھ کر سنانا ہوگا۔'' انجم آپا کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا مطلب؟''

''کیونکہ میں اندھی ہو چکی ہوں۔''

اور اب پہلی بار مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے بہت پہلے ہی یہ جان لینا چاہیے تھا کہ وہ اندھی ہو چکی ہیں۔

''میں کل آؤں گا۔'' غیر اضطراری طور پر گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے کہا۔

''اچھا۔''

انجم آپا کے گھر سے میں بہت ست قدموں کے ساتھ واپس آیا۔ گھر پر چھوٹے ماموں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انجم آپا کا شوہر انتہائی ظالم اور نا ہنجار آدمی نکلا۔ اُس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ دن رات جُوا کھیلتا رہتا ہے اور شراب کے نشے میں چور رہتا ہے۔ انجم آپا کو مار پیٹ کر وہ انھیں اپنے باپ سے پیسے مانگنے پر مجبور کرتا رہتا۔ ایک دن اُس نے شراب کے نشے میں انجم آپا کی آنکھوں میں جلتے ہوئے سگریٹ کی تمبا کو جھونک دی۔ وہ بے زبان لڑکی اندھی ہو گئی، مگر کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ اُس کی وجہ یہ کہ خود انجم آپا کے باپ اب اِس عمر میں دوسری شادی کرنے جا رہے ہیں۔ پولیس، مقدمہ اور طلاق ولاق کے چکر میں وہ نہیں پڑنا چاہتے۔ اُنھیں تو اَب گھر میں انجم آپا کا رہنا بھی گوارہ نہیں۔

دوسرے یہ بھی کہ انجم آپا کا شوہر شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں سے میل جول رکھتا ہے، اس لیے وہ اُس سے خوف زدہ بھی رہتے ہیں۔ وہ اکثر ان کی راشن کی دکان پر جا کر انھیں گالیاں دیتا رہتا ہے اور وہ خاموش سنتے رہتے ہیں۔

چھوٹے ماموں نے یہ بھی بتایا کہ وہ چھپ چھپ کر انجم آپا کے گھر بھی آتا جاتا رہتا ہے، اور وہاں بھی انھیں زدوکوب کرتا ہے۔

''کوئی کچھ کہتا نہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''کسی کو کیا پڑی ہے، کسی کے معاملے میں دخل دینے کی، جب انجم آپا کے باپ ہی کچھ نہیں کہتے۔'' چھوٹے ماموں بولے۔

مارچ کا مہینہ تھا، ایک اُداس، بڑے صدر دروازے جیسا مہینہ جس میں سے ہو کر ہوائیں آتی اور جاتی رہتی ہیں۔ کم از کم مجھے تو مارچ کا مہینہ کسی کھنڈر کے ایک ویران، گرد آلود اکیلے صدر دروازے کی مانند ہی لگتا ہے۔

میں بہت دیر تک مارچ کے اس سناٹے میں چپ چاپ کھڑا رہا، اس سناٹے میں اگر کوئی آہٹ تھی تو وہ سردیوں کے واپس جاتے ہوئے قدموں کی تھی۔

یوں ہی چپ چاپ کھڑے کھڑے، اچانک میرے اندر اُسی پرانے تاریک دیوہیکل غصّے نے ایک پھنکار ماری۔ وہی کالا غصہ جو ایک زہریلے سانپ کی طرح کنڈلی مار کر، سکڑ کر، میرے وجود کے نادیدہ ریشوں میں کہیں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک بار پھر، میری روح کے خلیوں اور اُس کی جھلّیوں کو توڑتا ہوا باہر آنا چاہتا تھا۔

میں ڈر گیا۔ اپنے اندر کے اُس پُراسرار کالے سانپ سے میں ڈر گیا اور مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ابھی کل ہی شام تو اندر والے دالان کے کونے میں، میں نے سانپ کی اُتاری ہوئی کینچلی پڑی دیکھی تھی۔

آخر رمضان کا مہینہ آ گیا۔ مجھے چھوڑ کر گھر کے تمام افراد پابندی سے روزے رکھتے تھے۔ میں بس دو روزے رکھا کرتا تھا۔ ایک تو منجھلا روزہ اور دوسرا الوداع کا۔ کیونکہ مجھے لگا تار روزے رکھنے کی عادت نہیں تھی۔ اِس لیے روزہ رکھ کر میں بہت چوکنا رہتا تھا کہ کہیں غلطی سے منھ سے حلق میں تھوک نہ نگل جاؤں۔ اس لیے میں تقریباً ہر وقت تھوکتا رہتا تھا۔ یقیناً یہ ایک گھناؤنی عادت تھی۔ تھوک تھوک کر میں زمین پاٹ دیا کرتا تھا۔

ہمارے گھر سحری کے وقت بہت اہتمام کیا جاتا۔ دودھ، ڈبل روٹی، پھینی، کھجلا، پراٹھا، کباب اور تازہ سالن بھی۔ بغیر گوشت کا سالن پکنا، رمضان میں شاید ممنوع تھا۔ سحری کھانے کا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ کر اس طرح ٹھہر جاتا ہے جیسے ایک چلتی ہوئی فلم اچانک رُک جائے۔ اور اندھیرے سنیما ہال میں ایک سین، بس ایک سین، پردے پر مُردہ ہو کر چپک جائے۔ دیوار پر چپکی ہوئی مردہ چھپکلی کی کھانکڑ کی طرح۔

وہ منظر بہت عجیب ہوتا۔

وہ رات کا اندھیرا نہ ہوتا، وہ صبح کا اندھیرا ہوتا جب گھر کے تمام افراد نیند سے اُٹھ کر ادھ مچی اور کیچڑ زدہ آنکھوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باورچی خانے میں داخل ہوتے اور اپنی اپنی پٹلیوں پر بیٹھ جاتے۔

سوتے وقت، دانتوں کے درمیان زبان آ کر کٹ جانے کے باعث اُن سب کے منھ سے خون

نکل رہا ہوتا مگر وہ کلّی نہیں کرتے، کیونکہ اُنھیں سحری کھانے کے بعد ایک طویل کلّی کرنا ہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک سنک ہو مگر سنک تو ہر جاندار، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان سب کا مقدر رہے (میرا وہ کن کٹا خرگوش بھی سنکی تھا) چولہا روشن ہوتا، کھانا گرم کیا جاتا، پھر تام چینوں کی رکابیاں سب کے سامنے سجادی جاتیں۔ وہ سب کھانا شروع کر دیتے، وہ ڈبل روٹی کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹ کر لقمہ بناتے اور وہ لقمہ اُن کے ہونٹ اور تھوڑی سے بہتے ہوئے وحشت ناک خون سے سن کر لال ہو جاتا۔

سحری کھا کر وہ سب باورچی خانے کے سامنے لگے نل پر کلّی کرتے، تھوڑا پانی پیتے، پھر وضو کرتے۔ فجر کی اذان ہوتی۔ مرد نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلے جاتے اور خواتین گھر میں ہی جانماز بچھا کر نماز ادا کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ اُس کے بعد، جب ہلکا ہلکا سا اُجالا پھیل جاتا تو سب خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے بستروں پر چلے جاتے۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ سو جاتے تھے یا یوں ہی لیٹے رہتے تھے مگر اتنا پتہ ہے کہ جب وہ بستروں سے اُٹھ کر اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مشغول ہوتے تو دن کافی چڑھ آتا۔

اُن دنوں ہر گھر کا یہی رواج تھا اور ممکن ہے کہ اب بھی ہو۔

افطار سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں رہی کیونکہ وہ باورچی خانے میں نہیں کیا جاتا تھا۔ باہری دالان میں، فرش پر ایک دری اور چاندنی بچھادی جاتی اور طرح طرح کے لوازمات چُن دیے جاتے مگر اُن میں سب سے نمایاں شے تو پکوڑیاں ہی تھیں اور وہی مجھے یاد رہ گئی ہیں۔ اب سوچتا ہوں تو دل ہی دل میں مسکرا بھی اُٹھتا ہوں کہ افطار کے وقت پکوڑیاں ہونا اتنا ناگزیر تھا کہ جس کے بغیر جیسے افطار ہی شرعاً حرام یا مکروہ ہو جاتا۔ ہندوستان کے پکوڑے، پکوڑیاں، اس معاملے میں اور ان لمحات میں عرب کی کھجوروں کے شانہ بشانہ تھے۔

سحری کے بعد مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ جب صبح ہو جاتی اور خوب اُجالا پھیل جاتا تو میں اکثر انجم آپا کے گھر چلا جایا کرتا۔ انجم آپا کے باپ بھی سحری کھا کر سو جاتے اور دوپہر بارہ بجے کے بعد ہی اُٹھتے۔ مگر انجم آپا، ہر وقت اپنی بے نور آنکھوں کے ساتھ مجھے باورچی خانے میں ہی بیٹھی نظر آتیں۔

اُس روز بھی، جب دن چڑھ آیا اور دھوپ منڈیروں سے اُتر کر آنگن میں چلی آئی تو میں نے

انجم آپا کے گھر کی راہ لی۔

صبح صبح، راستے میں پڑنے والی قبریں بھی اونگھ رہی تھیں۔ اُن پر کوئی بچہ مجھے کھیلتا ہوا نظر نہیں آیا۔ قبرستان اس وقت کچھ زیادہ ہی خاموش اور سنسان تھا۔ میں بھی بہت احتیاط سے کام لیتا ہوا، قبروں سے بچ بچ کر گزرتا رہا۔

جب میں انجم آپا کے گھر پہنچا تو دروازے پر ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اندر کوئی زور زور سے گالیاں بک رہا تھا۔ اس بوسیدہ دروازے کے بالکل سامنے باورچی خانہ تھا، آوازیں باورچی خانے سے ہی آرہی تھیں۔

میں دروازے میں ایک کونے میں چھپ کر اور سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے آدھا باورچی خانہ صاف نظر آتا تھا۔ انجم آپا کے باورچی خانے میں کواڑ نہیں تھے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کی آنکھیں بھوری اور بے رحم تھیں اور دہانہ کسی ہیبت ناک کتے سے ملتا تھا۔ وہ ایک داغ دار اور تشدد آمیز سفید رنگت کا آدمی تھا۔ اس کے ہونٹوں میں ایک نفرت انگیز سگریٹ دبا ہوا تھا۔ میں نے اس آدمی کو، اور ایسی کریہہ، ناگوار بو والی سگریٹ کو پہلے کہاں دیکھا تھا؟؟ میں نے، دماغ پر زور دیا اور پھر مجھے یاد آیا، مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

وہ شراب کے نشے میں لڑکھڑا رہا تھا اور متواتر انجم آپا کو گالیاں دے رہا تھا۔ اور تب مجھے وہ بھی نظر آ گئیں۔

انجم آپا فرش پر اکڑوں بیٹھی تھیں، مجھے اُن کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دیا۔

''رنڈی ــــ چھنال۔ نکال پیسے جو تو نے دبا کر رکھے ہیں۔''

انجم آپا یوں ہی بغیر ہلے جلے اکڑوں بیٹھی رہیں۔

''نکال، ورنہ اس بار تیری ناک کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔ اندھی ہو کر بھی تیری عقل ٹھکانے نہیں آئی؟''

''میرے پاس نہیں ہیں۔''

''تیری ماں کی... تیرے اُس بھڑوے باپ کے پاس تو ہیں۔''

''میں اُن سے نہیں لوں گی۔''

''تو یہ لے۔'' ایک وزنی، ہاتھی جیسا بدہیئت پیر خلا میں اوپر اُٹھتا ہے اور انجم آپا کے ماتھے پر ایک زبردست ٹھوکر مارتا ہے، میں انجم آپا کو فرش پر لڑھکتے ہوئے اور درد سے دوہری ہوتے، چیخیں مارتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

''اس بار لات تیرے پیٹ پر پڑے گی۔ یہ جو بچّہ لیے گھوم رہی ہے نا، ابھی ٹانگوں کے بیچ سے نکل جائے گا، پہلے کی طرح۔''

''نہیں۔'' انجم آپا کی یہ ہذیانی چیخ ہے۔

میں ایک چاقو کڑکڑاہٹ کے ساتھ کھلتا ہوا دیکھتا ہوں۔ چاقو کے پھل کی نخش چمک میں انجم آپا کا چہرہ پہلی بار مجھے صاف نظر آتا ہے۔ خوف اور نفرت کی انتہا کو پہنچا، ایک بالکل سیاہ پڑ گیا چہرہ۔

''لا— میں تیری ناک کاٹوں— ادھر آ۔''

ایک بھیانک، کوڑھ زدہ سفید مٹھی میں انجم آپا کے کالے بالوں کو دبا ہوا دیکھتا ہوں۔ مٹھی اوپر اُٹھتی ہے۔ انجم آپا کا چہرہ سیدھا ہوتا ہے۔ پھر پیچھے دیوار کی جانب جھکنے لگتا ہے۔ یہ وہی دیوار ہے جو بہت پہلے، باڑھ کے زمانے میں ایک بار گر گئی تھی۔ مگر اس بار یہ دیوار نہیں گری، انجم آپا گریں۔ اور ایک تیز دھار والا چاقو اُن کی ناک پر جا کر ٹھہر گیا۔

''ہاہاہا۔'' میں شیطان کو قہقہہ لگاتے ہوئے سنتا ہوں۔ اور مجھے پہلی بار اس امر کا عرفان ہوتا ہے کہ انسانوں کی دنیا خرابے میں تبدیل ہو چکی۔

''ابا'' ایک بے معنی اور بے بس چیخ اُس ٹوٹے پھوٹے ویران مکان میں گونج کر رہ جاتی ہے۔

ایک پل کو میں اُن بدہیئت، ہاتھی جیسے پیروں کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ پیر شراب کی مستی میں چولہے سے ٹکراتے ہیں۔ نخش بے رحم چاقو، ایک نامردی آواز کے ساتھ فرش پر گرتا ہے۔

انجم آپا تیزی سے اُٹھتی ہیں، وہ بھاگتی ہوئی باورچی خانے سے باہر دروازے میں آتی ہیں۔ جہاں ایک کونے میں، دبکا ہوا میں خاموش کھڑا ہوں۔

وہ حواس باختہ، بغیر دوپٹے کے گھر سے باہر بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھتیں، مگر

میں اُن کو دیکھتا ہوں۔ اُن کو بھاگتے، روتے، چیختے دور قبروں کی آڑ میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں اور میں...

میں تو اُن کی ناک اور چہرے پر سے خون ٹپکتا ہوا بھی دیکھ لیتا ہوں۔ انجم آپا کے قبروں کے عقب میں غائب ہو جانے کے بعد بھی، اُن کا چہرہ، ان کی ناک اور خون میری آنکھوں کے سامنے ایک ساکت و جامد منظر کی مانند موجود رہتے ہیں۔ اور مجھے یہ راز معلوم ہے کہ جہاں جہاں لال رنگ ہوتا ہے، وہاں وہاں ایک کالا رنگ بھی ہمیشہ آگے پیچھے موجود ہوتا ہے۔ اور یقیناً وہاں، اُس خون کے ساتھ بھی ایک کالا رنگ رینگ رہا تھا۔
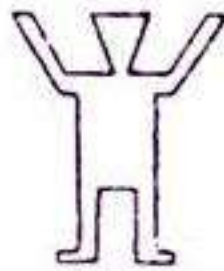
مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وہ کالا رنگ کہاں سے نکل نکل کر باہر آ رہا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ میرا پورا جسم اِس طرح اکڑ گیا جیسے اپنے اندر سے کوئی شے باہر نکال دینے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ شاید میری سانس تک رُک گئی تھی۔

اسی عالم میں، دروازے میں کھڑے کھڑے مجھے صدیاں بیت جانے کا واہمہ ہوا۔

مجھے ہوش اُس وقت آیا جب باورچی خانے سے اسٹوو جلنے کی ایک پُر ہول آواز آئی۔ جیسے ایک دل گھبرا دینے والی بارش ہو رہی ہو۔ اس آواز میں انجم آپا کا گھر ایک نادیدہ بارش میں بھیگنے لگا۔

اور ٹھیک اسی وقت میں نے اپنے اندر سے ایک تاریک طویل القامت سائے کو باورچی خانے کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھا۔

میں نے اپنے سائے کا تعاقب کیا۔

باورچی خانے کی دہلیز پر پہنچ کر میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا اسٹوو پر بے شرمی کے ساتھ چائے بنا رہا تھا۔ اس کی بھی میری طرف سے پیٹھ تھی۔ اسے شاید نہیں معلوم تھا کہ غصّے کے پاگل تاریک سایوں کی طرف سے پیٹھ کر کے بیٹھنا کتنا خطرناک اور مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔

المونیم کی ایک چھوٹی سی، گندی دیگچی میں چائے کا کتھئی رنگ اُبل رہا تھا۔ اور میں نے اُسے بھی پہچان لیا۔

اسے یعنی کاکروچ کو۔ کسی کو یقین ہو یا نہیں مگر یہ بالکل سچ ہے کہ وہی پرانا کاکروچ حیرت انگیز طور پر یہاں بھی چلا آیا تھا۔ وہ اسٹوو کے قریب رکھے تام چینی کے ایک پیالے کے اوپر بیٹھا ہوا مجھے گھور رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شاید وہ کاکروچ پہلے کی طرح مجھ پر ہنسنے والا بھی تھا۔

مجھے لگا جیسے میں ایک پرانی فلم کا چربہ دیکھ رہا ہوں مگر تب ہی میری نظر دیگچی میں اُبلتی ہوئی چائے پر دوبارہ پڑی۔ ابھی اُس میں دودھ نہیں ڈالا گیا تھا۔ چائے اچانک اُبلتے ہوئے خون میں بدل گئی۔ خون جس میں جھاگ اور بلبلے اُٹھ رہے تھے۔

اسٹوو کے ٹھیک اوپر، ایک کارنس پر چند معمولی برتنوں کے ساتھ مٹی کے تیل کی ایک بوتل رکھی تھی۔ شیشے کی بوتل جس کے منہ پر ایک گندا سا کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔

اسٹوو کی وحشت ناک آواز میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے میری کوئی آہٹ نہیں محسوس کی۔ اس کا سر نشے میں آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔

میں اس کی پیٹھ کے بالکل پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میل سے چیکٹ چارخانے کی ایک قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ تہبند باندھے ہوا تھا۔ جو آدھا کھل کر فرش پر اِدھر اُدھر پھڑ پھڑا رہا تھا۔

میں نے اپنی ایڑیاں اچکائیں، دم سادھا اور اس کے ہلتے ڈلتے سر کے اوپر سے، اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا، میرا بایاں ہاتھ، نیکر کی جیب میں پڑے پڑے دائیں ہاتھ کے ارادے کا ساتھ دے رہا تھا۔

کمال خوبی سے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ، میں نے مٹی کے تیل کو کارنس سے نیچے گرا دیا۔

بوتل، جلتے اور شور مچاتے ہوئے اسٹوو کے اوپر گری۔ میں اُلٹے پاؤں تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف واپس بھاگا۔ میں نے بمشکل دروازے کی چوکھٹ پار ہی کی ہو گی کہ اپنے پیچھے ایک دل دہلا دینے والا دھماکہ سنا۔ جس میں اس کی ہذیانی چیخیں بھی شامل تھیں۔

میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں دوڑتا ہوا ایک قبر کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سارا محلّہ انجم آپا کے گھر کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔

کوئی زور زور سے کہہ رہا تھا۔

''اسٹوو پھٹ گیا، آگ لگ گئی۔''

مجھے اپنے پیروں میں ہلکی سی کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ میں اُس قبر کے اوپر ہی پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا جس کی آڑ میں، میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے دور، بوسیدہ گھروں کے پیچھے دھوئیں کا کالا بادل اُٹھتے دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد شاید آگ پر قابو پالیا گیا تھا مگر لوگوں کا شور تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ پھر اسی شور اور مجمع میں، میں نے رکشہ پر لاد کر لے جاتی ہوئی ایک کالی لاش کو دیکھا۔ شاید لاش میں ابھی کوئی شے زندہ تھی ورنہ اُسے اسپتال لے جانے کا کیا مطلب تھا؟ مگر کالا دھواں ہوا کے دوش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ دھوئیں کے اس بادل میں مجھے لوگوں کی شکلیں صاف نہیں نظر آ رہی تھیں۔ رکشہ اور مجمع کے پیچھے پیچھے دھوئیں کا یہ بادل چلتا رہا۔ پھر وہ قبروں پر بھی آ کر منڈلانے لگا۔ آسمان کا ایک ٹکڑا دھوئیں سے کالا ہو گیا۔

مجمع کم ہو گیا، کچھ لوگ ادھر اُدھر کھڑے باتیں کر رہے تھے اور محلے کی عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد، میرے نیکر اور پنڈلیوں پر قبر سے نکل کر چیونٹیاں چڑھنے لگیں تو میں بہت اطمینان کے ساتھ اُٹھ کر اپنی ہی ہوا میں جھومتا ٹہلتا ہوا اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

اس بار مجھے کچھ بھی نہیں ہوا، نہ کوئی گھبراہٹ، نہ کوئی اندیشہ، نہ کوئی خوف اور نہ کوئی احساسِ جرم۔

کیا میں ایک پیشہ ور قاتل میں تبدیل ہو چکا تھا؟؟

''گڈو میاں آگئے.... گڈو میاں آگئے....'' جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، طوطا بولا۔

گھر پہنچ کر، دوپہر میں، میں آرام سے سو گیا۔ ہاں بس اتنا ضرور ایک بار دل میں خیال آیا کہ اگر اس وقت انجم آپا کے باورچی خانے میں چائے نہ بنتی تو صورت حال کچھ اور بھی ہو سکتی تھی۔ اس وقت وہاں چائے کا اُبلنا ایک اچھا شگون نہ تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار، ایک بدشگونی نے پہلے سے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں میری پانچوں حسیں کچھ دیر کے لیے اتنی طاقتور ہو گئی تھیں کہ چھٹی حس کی بیداری اُن کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہو۔

اس بار نہ مجھے یرقان ہوا، نہ سردی لگی، نہ بخار آیا اور نہ ہی اُلٹیاں ہوئیں۔ میں اپنے وجود میں پلتے

رہنے والے اُس تاریک سائے، اس کالے سانپ سے مکمل طور پر مفاہمت کر چکا تھا۔

دوسرے دن ریحانہ پھوپھی نے مجھے بتایا کہ انجم آپا کا میاں اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ آگ اتنی زبردست لگی تھی کہ پورا باورچی خانہ جل کر راکھ ہو گیا۔ اگر وقت پر محلے والے مل کر آگ نہ بجھاتے تو سارا گھر ہی نذرِ آتش ہو گیا ہوتا۔ انجم آپا کے باپ باورچی خانے سے بہت دور، دور والی کوٹھری میں سونے کے باعث بس بال بال بچ گئے تھے۔ جہاں تک انجم آپا کا سوال ہے تو وہ تو بہت دیر پہلے محلے کے ایک گھر میں جا کر بیٹھ گئی تھیں، کیونکہ اُن کے شوہر نے اُنھیں صبح صبح ہی جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اُن کی ناک پر چاقو سے وار کیا تھا۔

''پولیس نہیں آئی۔'' میں نے پوچھا۔

''آئی تھی مگر کیا کرتی، حادثہ تو حادثہ ہے۔ ویسے بھی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔'' ریحانہ پھوپھی پیاز چھیلتے چھیلتے بولیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو یقیناً پیاز چھیلنے کے باعث ہی آئے ہوں گے۔

اس کے بعد میں انجم آپا کے گھر جانے کی ہمت کبھی نہ کر سکا۔ ایک زمانے تک میں نے اُنھیں نہیں دیکھا۔ نہ وہ کبھی ہمارے گھر آئیں۔ بہت بعد میں یہ بھی سننے میں آیا کہ اُن کے باپ نے اُن کا دوسرا نکاح پڑھا دیا ہے۔ کسی بہت شریف اور نیک شخص کے ساتھ جس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اُس کے کئی بچے بھی تھے۔ انجم آپا کا نیا شوہر خاصا مالدار بھی تھا اور اُس کی اعلیٰ نفسی کا ثبوت تو یہی تھا کہ اس نے ایک بیوہ اور اندھی عورت کو سہارا دیا تھا۔

بہرحال میں نے انجم آپا کو نہیں دیکھا اور جب دیکھا تو زمانہ قیامت کی چال چل چکا تھا۔ وہ بھی قیمتی زیورات سے لدی ہوئی تھیں۔ بہت موٹی ہو گئی تھیں بلکہ اُن کی خاصی توند بھی نکل آئی تھی۔ اُن کے آگے پیچھے کئی چھوٹے بڑے بچے شور مچاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ مگر یہ بہت بعد کی، ایک الگ اور لرزہ خیز داستان ہے۔

وقت گزرتا گیا، گزرتا گیا۔ میں بڑا ہو گیا۔ داڑھی مونچھوں سے میرا چہرہ بھر کر رہ گیا۔ میں روزانہ شیو کرنے لگا۔ لوگوں کی نظروں میں، میں اب ایک نوجوان لڑکا تھا مگر خود میں، یہ محسوس کرتا تھا کہ میری

جوانی بیت چکی ہے۔ بچپن یا لڑکپن کی وہ یادیں ایک بھیانک خواب بن کر مجھ سے میری جوانی چھین لے گئی تھیں۔ میں ان بھیانک خوابوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔ وہ یادیں اُس کالے سیلاب کی مانند تھیں جو آگے اور آگے بڑھتا ہی جاتا تھا، جو میرے ماضی کو بہالے جانے کے بعد میرے حال اور میرے مستقبل کو بھی غرق کردینے کے درپے تھا۔

میں اگر جوان ہو گیا تھا تو گھر کے باقی افراد بوڑھے ہونے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ سنبل، میر اطوطا تک بوڑھا ہو گیا تھا اور بیمار رہنے لگا تھا۔ اُسے ہری مرچ کھانے میں دلچسپی بہت کم رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ گن کتا خرگوش تک کاہل اور سست ہو گیا تھا۔ جہاں پڑ جاتا، پڑا ہی رہتا اور اپنی لال لال آنکھوں سے گھر کے مکینوں اور درودیوار کو گھورتا رہتا۔

گھر میں زیادہ تر لوگ بیمار بیمار سے رہنے لگے۔ وہ ہر وقت کھانستے، بلغم تھوکتے اور ذرا سا چل لینے پر برسوں کے تھکے ہوئے نظر آتے۔ اُن کے پیٹ زیادہ تر خراب رہتے۔ جس کی وجہ سے وہ بات بات پر ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑتے۔ وہ کٹکھنے کتے بن گئے تھے اور باورچی خانہ ہی اُن کی آپسی تکرار کا باعث تھا۔ وہ بہت اونچا سننے لگے تھے۔ انھیں چیزیں بہت کم نظر آتی تھیں۔ کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں دیکھنے سے بوڑھی بے نور آنکھیں قاصر تھیں۔ اُن کی آنتیں کوئی مرغن یا ثقیل غذا برداشت نہ کر پاتی تھی۔ دراصل بوڑھی زبانوں میں اب کوئی ذائقہ نہ تھا۔ ان کی قوتِ ذائقہ، قوتِ شامہ، قوتِ لامسہ اور سماعت و بصارت سب کے حواس ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں بکھر رہے تھے یا پھر مٹی میں مل رہے تھے۔ اُسی ہوا اور اُس مٹی میں جہاں سے زندہ اور جوان یہ حواس خمسہ نکل کر کبھی سینہ تانے باہر آئے تھے۔ اب وہ صرف پانی کا ذائقہ محسوس کرتے تھے۔ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کی تلاش میں اُن کی زبانیں ہانپتے ہوئے کتوں کی طرح باہر لٹکی رہتی تھیں۔

وہ سب ایک پرانے درخت پر لگے بوڑھے پتے تھے۔ جو ذرا سی ہوا برداشت نہ کر کے چڑچڑا جاتے تھے۔

نور جہاں خالہ کا پاگل پن اتنا بڑھ گیا تھا کہ اُنھیں محلّے والوں اور رشتہ داروں نے مل کر اُن کے ہاتھ پاؤں رسّی سے باندھ کر ایک دن پاگل خانے میں پہنچا دیا تھا۔ جب سے وہ پاگل خانے میں بھرتی

ہوئی تھیں مجھے یاد نہیں کہ کوئی اُنھیں کبھی وہاں دیکھنے یا ملنے گیا ہو۔

اور یہ ٹھیک بھی تھا، گھر میں جھاڑو لگانے کے بعد، کوڑا کرکٹ اور سڑا ہوا کھانا یا پیاز، لہسن اور ترکاریوں کے چھلکوں کو اکٹھا کر کے، جب باہر نکال دیا جاتا ہے تو انھیں دیکھنے کوڑے دان میں جھانکنے، موریوں اور نالیوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر ٹٹولنے بھلا کون جاتا ہے۔

جہاں تک اچھن دادی کا سوال تھا تو وہ تو اب بالکل ہڈیوں کے ایک ڈھانچے میں بدل گئی تھیں، افسوس کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے میں ابھی جھلّی نما گوشت اور کھال موجود تھے، جہاں زخم سڑ رہے تھے اور اُن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ بغیر کھال اور گوشت کے خالص ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتیں تو ایک نئے حسن سے مالا مال ہو جاتیں آخر ہڈیاں کے ڈھانچے کی اپنی خوبصورتی ہے۔ اپنا تناسب۔ اپنی چمک اپنی گولائیاں، خطوط اور زاویے۔

مگر عام طور پر انسان حسن اور خوبصورتی کے بارے میں بہت محدود بلکہ متعصبانہ نظریات رکھتے ہیں۔

جب میں بظاہر ایک کرّیل جوان میں تبدیل ہو گیا تو گھر میں زیادہ تر جلے ہوئے یا سڑے ہوئے کھانے کی بو پھیلنے لگی۔ اب باورچی خانے میں اکثر ہانڈی جل جاتی یا پھر رکھے رکھے کھانا سڑ جاتا اور کسی کو کوئی بدبو نہ آتی۔ روٹیاں پک جل کر سیاہ ہو جاتیں۔ اُنھیں پروا نہ ہوتی، وہ جلے اور سڑے کھانے کھاتے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ جسے وہ بدمزہ کھانا کہہ کہہ کر اُس میں ڈھیر سا نمک مرچ ڈال ڈال کر کھاتے اور ایک دوسرے کو اِس بدمزگی کا ذمے دار ٹھہراتے۔ گھر کی عورتیں باورچی خانے میں ایک دوسرے سے لڑا کرتیں۔ اُن میں کبھی کبھی ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی۔ باورچی خانہ اب صحیح معنوں میں کُشتی کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔

اور یہ سب کمزور جسموں اور معذور ذہنوں میں لگاتار بڑھتی ہوئی عمر کا کرشمہ تھا۔ وہ بوڑھے ہوتے جاتے تھے اور تمام گزری ہوئی باتوں کو بھولتے جاتے تھے۔ ماضی کا ایک بہت بڑا ٹکڑا کٹ کر اُن کی یادداشت سے دور جا گرا تھا۔ اگر اُنھیں کچھ یاد رہ گیا تھا تو وہ صرف گزرے زمانے کے کھائے

ہوئے کھانوں کے نام اور اُن کے ذائقے تھے۔ وہ ذائقے جن کو گرفت میں لینے والے اُن کی زبانوں کے خلیے، سڑ گل کر کب کے ختم ہو چکے تھے۔ اب یہاں ایک ضروری اعتراف کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ، اگرچہ میں ایک خطرناک قاتل تھا، میں نے بے حد ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ ایک نہیں بلکہ دو دو قتل کیے تھے، کسی کو مجھ پر رتی برابر بھی شک نہیں ہو سکتا تھا، میں دو دو قتل کر کے صاف بچ نکلا تھا۔ مگر پھر بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں ایک بچہ تھا۔ جب میں نے وہ قتل کیے تھے تو میں نیکر پہنتا تھا۔

اس لیے اہم اور غور کرنے لائق نکتہ یہ تھا کہ دو دو قتل کرنے کے باوجود میں نے کسی کی موت نہیں دیکھی تھی۔ موت میرے لیے ایک اجنبی شے تھی۔ قتل اور موت دو الگ الگ باتیں ہیں۔ میں نے اپنی ماہیت میں قتل کا حلیہ دیکھا ہے بلکہ وہ حلیہ میں نے ہی اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ قتل کا لباس بھی خود میں نے اپنے ہاتھوں سے سوئی دھاگہ پکڑ کر سیا تھا مگر میں موت سے واقف نہیں تھا۔

موت کیا ہوتی ہے، اس کا چہرہ کیسا ہوتا ہے، وہ کس طرح چلتی ہے، کس طرح آتی ہے؟ ان میں سے کسی بات سے میں آشنا نہ تھا۔

مگر جلد ہی وہ وقت بھی آنے والا تھا اگرچہ مجھے اس کا ذرا سا احساس تک نہ ہوا۔

تجربے کار لوگ، موت کی آہٹ کو بہت پہلے سے پہچان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ کتے اور بلّیاں تک۔ مگر میں اُن دنوں اس معاملے میں قابلِ رحم حد تک ناتجربہ کار بلکہ احمق تھا۔ میری وہ چھٹی حس جس پر مجھے بہت ناز تھا، مجھے یہ تو بتا سکتی تھی کہ کچھ بڑا یا خراب ہونے کا امکان ہے، مگر وہ بڑا کیا ہے؟ وہ بدشگونی موت تو نہیں اور اگر موت ہے تو پھر اس موت کی شکل کیسی ہے؟ یہ چاروں ہاتھ پیروں سے چلتی ہے یا کہ گھٹنوں کے بل؟؟ چھٹی حس کو اس کا علم نہیں تھا۔

پھر یوں ہوا کہ پاخانے میں چیونٹے نظر آنے لگے۔ شروع شروع میں تو کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا، ویسے بھی پرانے زمانے کا بڑے بڑے اور اونچے اونچے قدمچوں والا پاخانہ تھا اور قدمچوں کی اینٹوں کی درازوں میں کیڑے مکوڑے تو رہتے ہی تھے۔ چھپکلیاں اور سانپ کے چھوٹے چھوٹے بچے اکثر وہاں آتے تھے اور اُس زمانے میں یہ کوئی خطرناک یا غیر معمولی بات بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اگلے وقتوں کے لوگ ان چیزوں کے عادی تھے۔

مگر جب وہاں کالے کالے اور بڑے سے چیونٹوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوتا ہی گیا اور قدمچوں پر سکون سے بیٹھنا مشکل ہوگیا تو سب کو فکر لاحق ہوئی۔ دشواری یہ بھی تھی کہ چیونٹوں کو مار ڈالنے یا مسل ڈالنے پر بھی پابندی تھی۔ تب ایک دن بڑے ماموں نے بتایا کہ اُن کے پیشاب پر تو چیونٹے بری طرح یلغار کر دیتے ہیں۔

خود میں نے بھی کئی بار محسوس کیا تھا کہ بڑے ماموں کے پاخانے سے واپس آنے کے بعد، خاص طور پر، وہاں بے شمار چیونٹے فرش اور موری میں رینگتے ہوئے یا چپکے ہوئے نظر آتے تھے۔

بہت دنوں سے بڑے ماموں کا وزن گھٹتا جا رہا تھا۔ ان کا بھاری بھرکم چہرہ سُت کر رہ گیا تھا اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ پہلے اُن کی اچھی خاصی توند تھی مگر اب اُن کا پیٹ پچکا ہوا نظر آتا تھا۔ ان کے سارے کپڑے ڈھیلے ہوگئے تھے۔

آخر جب اُنھیں بہت زیادہ کمزوری محسوس ہونے لگی تو وہ اپنے خاندانی حکیم کے پاس گئے اور اس طرح پاخانے میں چیونٹوں کی فوج ہونے کا بھید کُھل گیا۔

بڑے ماموں کے پیشاب میں نہ جانے کب سے شکر آ رہی تھی اور وہ بھی تھوڑی بہت نہیں، بہت زیادہ۔

اُنھیں خطرناک اور شدید قسم کی ذیابیطس ہوگئی تھی۔ اُن کے لبلبے نے تقریباً کام کرنا بند ہی کر دیا تھا۔

حکیم نے پتہ نہیں کون کون سی جڑی بوٹیوں سے اُن کا علاج شروع کر دیا اور کھانے میں میٹھا بالکل بند کر دیا۔

بڑے ماموں کو میٹھا بہت پسند تھا۔ ان سے روکھا سوکھا کھانا نگلا تک نہ جاتا تھا۔ اُن کے لیے پرہیز کا کھانا پکتا تھا جس کو وہ اکثر غصے میں اُٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ اگر کبھی اُن کو باورچی خانے سے کوئی اشتہا انگیز خوشبو آ جاتی تو وہ بچوں کی طرح رونے لگتے۔ گھر کے باقی افراد اُن سے چھپ چھپ کر کھانا کھانے لگے۔

ایک دن بڑے ماموں نے اپنی گردن کی بائیں طرف ایک چھوٹی سی پھنسی دکھائی۔

''ذرا دیکھنا، گڈّو میاں، یہاں کیا ہے؟'' اُنھوں نے پھنسی پر اپنی خشک انگلی پھیری۔

میں نے غور سے دیکھا، ایک بہت چھوٹی سی، سرخ رنگ کی پھنسی تھی۔

''کچھ نہیں ذرا سا دانہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں مگر بہت ستا رہا ہے... لاؤ ذرا آئینہ تو لے کر آؤ۔''

میں بھاگ کر دالان میں کارنس پر رکھا آئینہ اُٹھا لایا۔

''لاؤ مجھے دکھاؤ۔''

میں نے آئینہ میں اُنھیں گردن پر نکلا وہ چھوٹا اور معمولی سا دانہ دکھایا۔ وہ مطمئن ہوگئے مگر یہ لگاتار کہتے رہے کہ دانہ درد بہت کر رہا ہے۔ پھر اُنھوں نے خود کو یہ کہہ کر بھی تسلی دی کہ چونکہ یہ دانہ گردن کی بالکل رگ پر ہے۔ شاید اس لیے اتنی تکلیف کر رہا ہے۔

مگر دوسرے دن اُس دانے میں پیلے رنگ کا مواد پیدا ہوگیا۔ اور وہ خاصا پھول بھی گیا۔

حکیم نے دانے پر پان کے ساتھ کسی مرہم کا لیپ لگانے کے لیے دیا، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ

دانے میں تکلیف اور جلن اتنی بڑھ گئی کہ بڑے ماموں رات بھر کراہتے رہے۔

صبح ہوتے ہوتے اُن کی گردن پر ایک بڑا سا پھوڑا موجود تھا اور وہ بخار سے جل رہے تھے۔

اب خاندانی حکیم سے کام چلنے والا نہیں تھا۔ بڑے ماموں کو اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اُن کا معائنہ کیا اور اس پھوڑے کی وجہ خون میں شکر کی حد سے بڑھی مقدار تجویز کی۔ مگر ڈاکٹروں نے پھوڑے کا آپریشن اُس وقت تک ملتوی کر دیا جب تک کہ شکر نارمل نہ ہو جائے۔

بڑے ماموں کے پیروں میں بھی چھوٹے چھوٹے سے زخم تھے۔

انھیں انسولین کے انجکشن دیے جانے لگے۔ وہ بات بات پر رونے لگتے اور میں اپنی چھٹی حس سے یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ موت سے گھبرا کر نہیں روتے تھے۔ موت تو شاید، ان کی دانست میں کسی غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی (جیسا کہ ہر شخص سوچتا ہے کہ دوسرے مریں تو مرتے پھریں، شاید اُن کی اپنی موت ہمیشہ کے لیے ملتوی ہی رہے۔ لوگ زندگی کی کتاب میں اپنا اندراج کرانے کے لیے ہمیشہ قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ افسوس کہ اس عرصے میں کب اُن کا نام نادیدہ ہواؤں میں اُڑ کر موت کی کتاب میں، ایک زیادہ سیاہ روشنائی میں درج ہو جاتا ہے اُنھیں اس کی ہوا تک نہیں لگتی۔)

بہر حال میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسی وجہ سے پریشان ہو کر اور گھبرا کر روتے تھے کہ انھیں کھانے میں وہ اشیاء نہیں مل رہی تھیں جو اُنھیں بہت مرغوب تھیں اور اُن کی نظر میں خدا کی نعمتیں تھیں جن سے وہ محروم ہو گئے تھے۔

وہ دن باورچی خانے پر بڑے سخت گزر رہے تھے۔ اگر کبھی چھپ کر قورمہ یا بریانی پکائے جاتے تو اُس کے ساتھ ساتھ چولہے کے آنولے پر مولیوں کی بھجیا یا گوبھی بھی چڑھا دی جاتی تا کہ مولی اور گوبھی کی ناک سڑا دینے والی بو میں بریانی کی مہک دب کر رہ جائے۔ یعنی باورچی خانہ اُس وقت بالکل دنیا کے مماثل بن گیا تھا جہاں ہر نفیس شے کو کیچڑ سے پوت دینے کا عمل ابتدائے آفرینش سے ہی جاری ہے۔

مسئلہ صرف جمعرات کا ہوتا جب گھر میں مولی یا گوبھی یا کسی بھی ایسی چیز کا پکنا ممنوع تھا جس پر

فاتحہ ہو سکتی تھی۔ جمعرات کو اوّل تو دال کبھی پکتی ہی نہیں اور اگر پکتی بھی تو اُس میں لہسن پیاز کا بگھار لگنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

جمعرات کو، سہ پہر ہی سے بڑے ماموں اپنے باندوں کے پلنگ پر بیٹھ کر باورچی خانے کی طرف بے حد چوکنے ہو کر دیکھتے رہتے تھے۔ اور بار بار ناک کے نتھنے سکوڑ کر، وہاں سے آنے والی خوشبوؤں کی تاک میں رہتے۔

دونوں وقت ملنے سے پہلے، سینے میں اگا کر جب کھانے پر فاتحہ دی جاتی تو وہ دُور بیٹھے دیکھتے رہتے اور پھر بچّوں کی طرح رونے لگتے۔ روتے وقت اُن کی گردن کا پھوڑا اور بھی زیادہ بڑا اور پھولا ہوا نظر آتا تھا۔ پھوڑے کے آس پاس کی سرخی ساری گردن پر پھیل جاتی۔ گردن کی ساری رگیں پھول جاتیں اور ایسا لگتا جیسے یہ پھوڑا ابھی ابھی پھوٹ جائے گا اور اس کا سارا کچ لہو اور مواد باہر نکل جائے گا۔

کچھ دنوں تک تو گھر کا ہر فرد بریانی اور قورمہ کھا کر اپنے آپ کو مجرم سمجھتا رہا۔ مگر یہ کب تک چلتا؟ آخر سب کی اپنی اپنی آنتیں تھیں اور اپنے اپنے دانت، اپنے اپنے وجود کے نہاں خانوں میں وہ سب قید تھے۔ آہستہ آہستہ بڑے ماموں کا رونا روزمرّہ کے معمول میں شامل ہو گیا اور گھر کے افراد نے اُن کے رونے پیٹنے سے متاثر ہونا چھوڑ دیا۔ بڑے ماموں اُس بلّی کی مانند نظر انداز کیے جانے لگے جو باورچی خانے کے سامنے بیٹھ کر مسکین انداز میں، منھ بنا بنا کے اور پلکیں جھپکا جھپکا کے کھانا پکتے یا انسانوں کو کھانا کھاتے دیکھتی رہتی ہے۔ اور کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کئی ماہ گزر گئے اور تب یہ کرشمہ نمودار ہوا۔

بڑے ماموں کی گردن کا پھوڑا آہستہ آہستہ دبنے اور سکڑنے لگا۔ اس کے اندر کا مواد سوکھنے لگا اور آس پاس پھیلی ہوئی سرخی کم ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے کچھ ہی دنوں میں وہاں بس ایک چنے کی دال کے دانے برابر ایک گلابی سی گانٹھ ہی رہ گئی۔ یہ ایک عجیب کرشمہ تھا جو ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔ جیسے چند عناصر سے دنیا کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کا حجم بڑھتا ہے، وہ ارتقا کے سفر کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ پھر ایک دن وہ سکڑنے لگتی ہے۔ واپس اپنے عناصر کی جانب لوٹتی ہے اور پھر یہ عناصر خلا میں

ادھر اُدھر بہت دور کہیں بکھر کر رہ جاتے ہیں۔ بڑے ماموں کا پھوڑا دراصل اُن کی گردن پر ایک کائنات کا بننا اور بگڑنا تھا (نمودار ہوکر معدوم ہوگئی (کائنات)) مگر پھوڑے کے دبنے کے بعد وہ بہت بوڑھے نظر آنے لگے۔ وہ ہر وقت کھانستے رہتے اور اُن کی سانس دھونکنی کی طرح چلتی رہتی۔ اُن کی یادداشت نے تقریباً کام کرنا بند ہی کر دیا۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی اجنبیت آکر بیٹھ گئی۔ اور کسی نے تو نہیں مگر مجھے اُن کی آنکھوں کی رنگت بھی بدلی بدلی لگی۔ مجھے اُن کی آنکھیں پیلی پیلی بھی نظر آنے لگیں۔ ممکن ہے کہ یہ میرا دھوکہ ہو کیونکہ پیلا پن تو ہمیشہ ہی میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔

تھوڑے عرصے بعد سننے میں آیا کہ بڑے ماموں کے گردے خراب ہو رہے ہیں۔ ان کا ہلنا پھرنا تقریباً بند ہوتا گیا۔ ذیابیطس کی وجہ سے اُن کے پاؤں میں پہلے ہی سے زخم تھے، اُن کے منھ اور پیروں پر سوجن بھی آگئی۔ اُس زمانے میں، مجھے بہت سی باتوں کی تمیز نہیں تھی۔ مگر اب جبکہ میں خود پکی عمر کو پہنچ چکا ہوں اور یہ یادداشتیں لکھ رہا ہوں تو میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ اُن کی سب سے بڑی بیماری تو بڑھاپا تھی۔ ان کی عمر ہوگئی تھی۔ بڑھاپے اور بیماری میں جسم تقریباً غیر حاضر رہتا ہے۔ سارے کام بڑھاپا اور بیماری ہی نپٹاتے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کتنا عرصہ گزر گیا۔ اُن کی بیماری اور اُن کی عمر طویل ہوتی گئی۔ شاید پھر سے سردی آگئی تھی۔ مجھے آج بھی اپنی پرانی بچپن کی رضائی یاد ہے۔ وہ رضائی جس کے اندر کی روئی دُھند کے ٹکڑے بن کر فضا کی مبہم پہنائیوں میں معدوم ہوگئی۔ مگر میرے بچپن کے جسم کے اندر بھرے خون کی ایک مٹھی بھر حرارت اُس روئی کے اندر کہیں پھنسی رہ گئی ہے۔

موسم کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ وہ انسانوں سے بھی زیادہ تغیر پذیر ہے۔ انسانوں کو، بے چارے عام انسانوں کو بدلتے بدلتے بہرحال بہت وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آدمی کو اس کنارے سے اُس کنارے کے قریب پہنچتے پہنچتے تاریک پانیوں میں ڈوب کر اوپر آنا پڑتا ہے اور تب جا کر کہیں وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اعتماد کے ساتھ اپنی یادداشت، اپنے حافظے کو فراموش کر سکے۔ اپنی آنکھوں کی رنگت کو بدل سکے۔ لوگوں کے نام بھلا سکے یا اُنھیں غلط طریقے سے پکار سکے۔ اب اُس کے پھیپھڑے،

اطمینان کے ساتھ اپنی پھولتی ہوئی سانسوں پر شاداں ہو سکتے ہیں۔ اپنی کھانسی پر فخر کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اب وہ آدھی رات کو میٹھا کھانے کے لیے کسی سے کچھ فرمائش کرنے پر جھجک نہیں محسوس کرتے۔

یہ تغیر، یہ تبدیلی اُس کی انا سے ایک مستقل نجات کا نام ہے۔ بیماری میں ایک بوڑھا، ننگی، کمزور اور تقریباً ہر منظرنامے سے غیر حاضر جسم ہی دراصل ایک مکمل انسان ہے۔ مکمل طور پر اخلاقی، ریاضی کے 'اکائی' کے ہندسے کی مانند اپنی ہی روشنی میں چمکتا ہوا، گزرے اور پچھلے وقتوں کے گناہوں کو، نفرتوں کو، محبتوں اور رفاقتوں کو، سب کو کچلتا ہوا، دربدر کرتا ہوا، ساری خواہشوں کو ساری شہوتوں کو، بس ایک 'خواہش' کے سفید پردے جیسے کفن سے ڈھکتے ہوئے۔

بس ایک ''خواہش''، میٹھا کھانے، مٹھائی کھانے کی عظیم خواہش کے سفید اُجلے بے داغ پردے کو ہر جذبے پر ڈال کر ڈھانپتے ہوئے۔

اُن دنوں بھی شاید دسمبر کی کالی ہوا چل رہی تھی۔ آج بھی وہی کالی ہوا چل رہی ہے۔ انسانوں کو اس دوسری دنیا کے نادیدہ کنارے پر اُڑا کر لے جاتی ہوئی، ڈھکیلتی ہوئی، یہ کالی ہوا دنیا کو کالا کیے دیتی ہے۔ یہ دنیا جس کی اصل روحانی تاریخ ایک ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جسے اب مجھے کچھ کچھ پڑھنا آ گیا ہے۔ مگر اُن دنوں میں یہ سب کہاں جانتا تھا؟ ہاں! اُن دنوں میں یہ سب کہاں جانتا تھا، کہ دنیا محض انسانوں کے حواسِ خمسہ کو مطمئن کرنے کے لیے چل رہی تھی، وہ خواہش، وہ پاگل، وہ ننگی، وہ شہوت کے ذائقے میں لپٹا سرخ پھل، جما جما کر جس کو کترتے ہوئے دنیا کے دانت سفید، چمکدار اور مضبوط ہوتے گئے۔ اور پھر — ؟

پھر ایک دن وہ دانت، ایک گندی سی بدرنگ موری میں گر کر، گل گل کر بہہ گئے۔ یہی اُن کا نروان تھا۔ خواہش ایک دن ختم ہوئی۔ جسم پر خوبصورت جھرّیاں پڑیں، جسم بوڑھا ہوا، اگلا پچھلا سارا حساب چکتا کر دیا گیا۔

وہ جو ایکسیڈینٹ میں مارے گئے۔ جو عین جوانی میں شہید ہوئے۔ وہ جو کسی ناگہانی بیماری کے باعث، عمرِ طبعی پوری کرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ انھوں نے زندگی کو اپنی عظیم اور دہشت خیز وسعت

کے پس منظر میں کہاں دیکھا۔ انھوں نے کہاں دیکھا، ایک کمزور ڈبے کو آہستہ آہستہ خالی ہوتے ہوئے، اپنا بوجھ، اپنی کنکریاں، اپنا گندا مٹیالا تیل گراتے ہوئے اور دکھ، سکھ دونوں سے بے نیاز ہوتے ہوئے، آزادی کے ایک عظیم الشان اونچے ٹیلے پر اپنی پاک کی گئی دھوئی گئی، روح کی نیلی قمیص کے لہلہانے کی خوبصورت آواز۔

اگرچہ دنیا ختم نہ ہوگی۔ دنیا کے ختم نہ ہونے کا شعور ایک بھیک مانگتے اور گھگیاتے ہوئے، بچے کی قابلِ رحم آواز میں بھی موجود رہ سکتا ہے۔ شعور کی اس ڈھلان پر سب کچھ ممکن ہے۔ زندگی اور موت دونوں یہاں معمولی ذرّوں کی مانند پھسلتے جاتے ہیں۔ انسان کو ان حقیر ذرّات سے ماورا ہو کر کچھ سوچنا چاہیے تھا۔ مگر ہیہات! انسان انھیں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اس کا سر انھیں دھول بھرے معمولی، روزمرہ کے ذرّات سے بھر کر رہ گیا۔ انسان یہی خاک سر میں ڈالے گھوما، پھر ڈاکو اور رشی بنا اور حافظے کے تیل میں ملے اس میل، اس دھول اور خاک سے اُس کے سر کے بال بالکل چیکٹ ہو کر ہی رہ گئے۔ (خود میرا مقدر بھی یہی ہے)

کیسا انوکھا دن ہوگا، جب وہ اپنی دوا لینا بھول جائے گا۔ وہ بھول جائے گا کہ اُس نے کھانا کھایا بھی تھا یا نہیں؟

خواب منطقی شعور پر حاوی ہوں گے۔ خوابوں کے سرمئی دھوئیں میں بچپن اور جوانی کی چند محرومیوں کے، چند گلے شکوؤں کے سڑے گلے ٹکڑوں کے سوا سب کچھ ایک پاکیزہ ہوا میں اُڑ رہا ہوگا۔ آزادی — ! آزادی!

حافظے کی ایسی کی تیسی!

بڑے ماموں اب اکثر اپنی دوا کھانا بھول جاتے۔ وہ یہ بھی بھول جاتے کہ پیٹ بھر کر وہ اپنا کھانا کھا چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ جھٹلا دیتے کہ اُنھوں نے کھانا کھالیا ہے۔ اُن کے دماغ کے ریشے اور خلیے گل رہے تھے اور آنتوں اور معدے کے پیغام وصول کرنے سے قاصر تھے۔ وہ لوگوں کا نام بھول جاتے، اشیا کو غلط ناموں سے پکارتے۔ ''رئیس میاں — اورئیس میاں'' وہ زور سے چلّاتے۔

رئیس میاں نام کا کوئی شخص گھر میں نہیں تھا۔ دراصل وہ مجھے پکار رہے تھے۔ میں سمجھ گیا اور اُن

کے پلنگ کی پائنتی جا کر کھڑا ہو گیا۔

''رات میں لوٹتے وقت کچھ کھانے کو لیتے آنا۔'' انھوں نے اجنبی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی بھی میٹھی چیز۔''

''مگر میٹھا تمھیں منع ہے، بڑے ماموں۔''

''تیری ماں کا منع...'' وہ گرجے اور اُن کی سانس بری طرح چلنے لگی۔

''سن، تل گُڑ لیتے آنا چار آنے کا۔'' وہ ہانپتے ہانپتے بولے۔ ادھر آکر انھوں نے یہ معمول بنالیا تھا، جہاں میں گھر سے نکلتا اور وہ واپسی میں کوئی میٹھی چیز لانے کی فرمائش کرتے۔ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود، وہ لڑ جھگڑ کر میٹھا کھاتے اور تھوڑی ہی دیر میں یہ بھول جاتے کہ اُنھوں نے کیا کھایا ہے۔ اگر کوئی اُنھیں یاد دلاتا تو وہ اُسے گندی گندی گالیوں سے نوازتے۔ حالانکہ اپنی تمام عمر کم از کم گھر میں، میں نے اُنھیں گالی بکتے نہیں سنا تھا۔

میرا بارہویں کلاس کا بورڈ کا امتحان سر پر تھا۔ میں رات رات بھر جاگ کر تیاری کرتا تھا۔ اس لیے مجھے یہ علم بھی ہو گیا کہ بڑے ماموں کو اب رات بھر بڑبڑانے کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ اسی بڑبڑاہٹ میں شاید صرف ایک بار میں نے اُن کے منھ سے ''ثروت'' نکلتے سنا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ میرا دھوکہ ہی رہا ہو۔

مگر اُن کی حالت ویسی ہی نہیں رہی۔ ان میں لگاتار تبدیلی آتی رہی۔ ایک روز وہ اُٹھ کر ڈگمگاتے قدموں سے جلدی سے باورچی خانے کی طرف لپکے۔

''کیا ہے، کیا ہے۔'' ریحانہ پھوپھی اور کنیز خالہ اُن کو پکڑنے کے لیے پیچھے پیچھے آئیں۔

''کچھ نہیں، پیشاب کروں گا۔'' بڑے ماموں نے اُنھیں اپنی پیلی آنکھوں سے گھورا۔

''تو یہاں کہاں — یہ باورچی خانہ ہے۔'' وہ حیرت اور خوف سے چلائیں۔

''یہ سالا کب سے باورچی خانہ ہو گیا۔ باورچی خانہ تو وہاں ہے۔'' انھوں نے آسمان کی طرف

انگلی اُٹھائی، جہاں ایک چیل کوئی اوجھڑی چونچ میں دبائے چلی جا رہی تھی۔

اُنھیں بڑی مشکل سے تھام کر پیشاب کرانے کے لیے پاخانے کی طرف لایا گیا۔

کچھ عرصے بعد انھوں نے پیشاب پاخانے کے لیے پلنگ سے اُٹھنا چھوڑ دیا، ان کی آنکھیں بند رہتیں اور منھ کھلا رہتا۔ اس کھلے ہوئے منھ پر اکثر مکھیاں بھنبھناتیں کیونکہ رات کو کھائے گئے میٹھے کے ذرّات اُن کی کھوکھلی داڑھوں اور زبان پر چپکے ہوتے۔ وہ زیادہ تر غنودگی کے عالم میں ہوتے۔

مگر اُس دن یہ غنودگی بے ہوشی میں بدل گئی جب دوپہر میں اُرد کی دال کی کھچڑی پکی تھی (اور جسے کھاتے وقت ہوا میرے کانوں میں بُد بُدائی تھی اور میرا دل گھبرانے لگا تھا) اُن کا پیٹ پھولا پھولا اور بہت سخت محسوس ہوا۔ ڈاکٹر کو گھر پر بلایا گیا۔ اُس نے معائنہ کیا اور بتایا کہ اُن کا پیشاب بند ہو چکا ہے۔ گردوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ بے ہوشی کی وجہ خون میں آلودگی کا بڑھنا ہے۔ گندا یا زہریلا خون آہستہ آہستہ دماغ کو اپنی چپیٹ میں لے رہا ہے۔

''بڑے ماموں، بڑے ماموں۔'' میں اُن کے کان کے پاس منھ لے جا کر زور سے چیخا۔ اُن کی آنکھوں کے پپوٹوں میں خفیف سی جنبش ہوئی اور بس۔

شام ہوتے ہوتے اُن کے کھلے ہوئے منھ سے زور زور کے خرّاٹے بلند ہونے لگے۔ میں اُن خرّاٹوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ بہت وحشت انگیز تھے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ایسے کوئی درندہ بہت گہری سانس لے رہا ہو اور کبھی ایسا لگتا جیسے باورچی خانے کے کواڑ بار بار کھل رہے ہوں یا بند ہو رہے ہوں۔ باورچی خانے کے کواڑ اینٹھ گئے تھے اور اُن کو کھولنے بند کر دینے پر ایسی ہی آواز آتی تھی۔

مغرب کی اذان ہوئی۔ اُن کے یہ وحشت ناک خرّاٹے رُک گئے۔ میں نے اُن کی ہچکی کو نہ سنا۔ نہ دیکھا مگر ریحانہ پھوپھی نے دیکھا بھی اور سنا بھی۔

میں نے تو لالٹین کی روشنی میں اُن کا پھولا ہوا سخت پتھر جیسا پیٹ دیکھا۔ میں نے اُن کی آنکھیں بند دیکھیں۔ میں نے اُنھیں ایک گہری نیند میں ڈوبا ہوا دیکھا۔ میں نے اب اُن کا کھلا منھ نہیں بلکہ بند منھ دیکھا — اور اس طرح میں نے موت کا 'منھ' دیکھا۔ محلے کی ایک بڑی بوڑھی نے باورچی خانے میں جا کر دن کی بچی ہوئی اُرد کی دال کی کالی کھچڑی اور دودھ اُٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دیے۔

اس کے بعد اگر کچھ یاد رہ گیا ہے تو بس وہی دسمبر کی کالی ہوا ہے جس نے شاید آج تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔

ادھر اُدھر کی اور رشتہ دار عورتیں سر کو دوپٹے سے ڈھک کر، کلام پاک پڑھتی رہیں۔ بیچ بیچ میں کہیں سے رونے کی بھی کوئی کمزور آواز اُبھر آتی تھی، جیسے موسیقی سے بھٹکا ہوا ایک اکیلا سُر۔

اُن کے پلنگ کے نیچے لوبان سلگا دیا گیا۔ تیز ہوا کے جھونکوں نے اس لوبان کی پُراسرار اور شاید موت جیسی خوشبو کو گھر کے ہر کونے میں پھیلا دیا۔

کوئی عورت (جس کا نام اور شکل آج میرے ذہن سے محو ہوگئی ہے) اُٹھی، باورچی خانے کا دروازہ کھولا اور چولہے پر حلوہ پکانے لگی۔ اُس دن مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ حلوے کا مُردوں سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

ساری رات آنگن میں جنازہ رکھا رہا۔ میں ایک کونے میں دُبکا، دور سے میت کے پلنگ کو دیکھتا رہا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر آج باورچی خانے کا چولہا ٹھنڈا تھا۔ اور وہ حلوہ؟؟

حلوہ گھر والوں کے لیے نہیں تھا۔

پھر آسمان میں سفیدی کی ایک لکیر نظر آئی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ روز کی طرح آم کے درخت پر چڑیاں آکر بیٹھ گئیں اور چہچہانے لگیں۔ مگر سنبل اپنے پنجرے میں خاموش، اپنی چونچ پروں میں دبائے بیٹھا تھا۔

نہیں یاد آتا۔ زیادہ یاد نہیں آتا۔ میرے دماغ کے بائیں حصے میں پھر درد ہونے لگا۔ اب اس عمر میں یادداشت پر اتنا زور ڈالنا اور یادوں کی جڑوں کو اُکھاڑ کر اُن کے ریشے ریشے گننا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ یہ اذیت ناک ہے، میرا وجود، میرا جسم، میرا ذہن، میری آنت اور میری یادداشت میں کوئی فرق نہیں رہا۔

دھوپ چھت کی منڈیروں پر سے اُتر کر آنگن میں چلی آئی۔ مُردے نہلانے والا ایک تختہ نل کی حوضیہ کے قریب زمین پر رکھ دیا گیا۔ میت کو غسل دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

مگر کیا مجھے یہ سب لکھنا چاہیے؟ میں یوں کاغذ پر کاغذ کیوں سیاہ کرتا جا رہا ہوں۔

اگر میں کوئی ناول لکھنے کے واقعی لائق ہوتا تو شاید اس کی کوئی اہمیت بھی ہوتی مگر آدمی کو کسی بھی جگہ کہیں بھی وہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے، جہاں وہ اپنی ذات کا اظہار کر سکتا ہے، چاہے وہ اسکول میں چھٹی کے لیے دی جانے والی درخواست ہو، مقدمے کی اپیل ہو یا سودا سلف لانے کی فہرست اور میری تو خیر ایک ذاتی 'تاریخ' کٹ کر الگ ہوگئی۔ فاضل آنت کی طرح جس کے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے اور اُس آنت کو کبھی کبھی یاد بھی کر سکتا ہے جو اُس کے جسم سے نکال کر کوڑے دان میں پھینک دی گئی تھی۔

بچپن میں بڑے ماموں اکثر مجھے سرکس یا فلم یا نمائش دکھانے جاتے تھے۔

مگر اُس دن کی دوپہر میں کوئی سرکس یا فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں جو دیکھ رہا تھا اُس میں چلتے پھرتے لوگوں کے سائے تھے۔ میں باہری دالان کے مشرقی حصّے کے برآمدے میں ایک کھٹولے پر بیٹھا تھا۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ ظہر کی اذان سے پہلے، وہاں نل کے پاس باورچی خانے کے بالکل سامنے انھیں غسل دیا جا رہا تھا۔

ایک طویل غسل۔

اتنا طویل اور رسومیات سے بھرا ہوا غسل انھوں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا ہوگا۔

میں دائیں طرف کی دیوار پر، اُس غسل کی پرچھائیاں ڈولتی اور کانپتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

یہ طہارت کی انتہا پر پہنچا ایک غسل کا سایہ تھا اور دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی ہوا اسے گھر کے گوشے گوشے میں بھنکار رہی تھی۔

یہ غسل میری بھیگی ہوئی آنکھوں کے درمیان ٹھہر نہ پاتا تھا۔

دھوپ اپنا زاویہ، اپنی رنگت بدلنے لگی۔ آوازیں بلند ہونے لگیں، اگرچہ وہ کسی گہری کھائی میں سے آ رہی تھیں۔

اب سفید کفن تھا جس میں لپٹے ہوئے بڑے ماموں سو رہے تھے۔ لوگ آ آ کر میت کے سرہانے کھڑے ہو کر اُن کا چہرہ دیکھنے لگے اور اپنی خطائیں معاف کرانے لگے۔

پھر جنازے کا پلنگ اُٹھایا گیا۔ کچھ عورتوں کے رونے کی آوازیں اُبھریں۔ دروازے تک ساتھ

آئیں اُس کے بعد جنازہ ان روتی ہوئی آوازوں سے بے رُخی کے ساتھ الگ ہو گیا۔

یہ بڑی سی پاگل خانے کی دیوار، سیاہ اور مہیب دیوار جس کی موریوں میں نیچے سر ڈال کر پاگل باہر جھانکتے تھے اور اُس دیوار کے سامنے وہ لمبا چوڑا قبرستان۔

قبرستان کے اندر ایک مسجد، جہاں اُن کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر خودرو گھاس پودوں کے درمیان، میں نے اپنے آپ کو اُن کی میت کی پائینتی کھڑے پایا۔

اُن کو منوں مٹی میں دفن کر کے، سب قبرستان سے باہر آئے۔

میں جیسے ہی گھر پہنچا وہاں کھانا لگا دیا گیا۔

کھانا ہمارے ایک دور کے رشتہ دار کے یہاں سے آیا تھا، میں اس کھانے کو تمام عمر نہیں بھول سکتا۔

ہلدی والا آلو گوشت اور موٹی موٹی، بڑی بڑی تندوری روٹیاں۔ سب نیچے فرش پر جہاں چاندنی بچھی ہوئی تھی، بیٹھ کر، تام چینی کے پیالوں میں سالن نکال نکال کر اور اُس میں تندوری روٹیوں کے نوالے خوب بھگو بھگو کر کھانا کھانے لگے۔

کھانا بہت لذیذ تھا، اور میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اگر چہ اُس کھانے کو اتنا پیٹ بھر بھر کر کھانے پر مجھے آج بھی حیرت ہے اور شرمندگی بھی۔ مجھے تو یہ بھی یاد آتا ہے کہ قبرستان سے واپس آ کر شاید میں نے ٹھیک سے ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے، اور میرے ہاتھوں میں، بڑے ماموں کی قبر کی مٹی لگی تھی۔ جب میں نے آلو گوشت کے ہلدی والے شوربے سے سنی ہوئی اپنی اُنگلیوں کو زبان سے چاٹا تو قبرستان کی مٹی کی کرکراہٹ میرے منھ میں اُتر گئی۔

مگر المیہ یہ ہے کہ جن باتوں سے انسان کو شرمندگی ہوتی ہے، وہی باتیں اصل ہوتی ہیں۔ باقی سب مصنوعی اور بناوٹی۔

رات میں، ٹھیک اُس مقام پر جہاں آنگن میں اُنھیں غسل دیا گیا تھا، ایک چراغ جلا کر رکھ دیا گیا۔

یہ چراغ بڑے ماموں کے چالیسویں تک روز، رات کو روشن رکھنا تھا۔ شاید اس لیے کہ چالیس دن تک اُن کی روح گھر میں، خاص طور پر اس مقام پر جہاں اُن کے جسم کو غسل دیا گیا تھا۔ آتی رہے

گی۔لحد پر جلتا ہوا یہ چراغ۔ ہوا سے کہیں بجھ نہ جائے!

اب بس ایک آخری منظر رہ گیا ہے۔ حافظے کی جھلّی پر بالکل چپٹا ہوا، اُسے بھی ناخن سے نوچتا ہوں اور یہاں سامنے لاکر ڈال دیتا ہوں۔

سوئم کے روز باورچی خانہ انواع واقسام کے کھانوں کی خوشبوؤں سے مہک اُٹھا۔ باورچی خانے میں ایسی چہل پہل تھی کہ میں نے انجم باجی کی شادی میں بھی نہ دیکھی تھی۔ تمام دن صبح سے ہی شور مچا رہا۔ برتن کھڑکھڑاتے رہے اور عورتیں آپس میں خوب باتیں کرتی رہیں۔ ایک آدھ عورت درمیان میں چپکے سے ہنس بھی دیتی تھی۔

اب وہاں، کسی کی آنکھ میں کوئی آنسو نہ تھا۔ کھانا پکاتے وقت سارے غم، سارے صدمے بھاپ کی طرح اُڑ کر غائب ہوجاتے ہیں۔

عصر اور مغرب کے درمیان فاتحہ کی تیاری شروع ہوگئی۔ باہر والے دالان کے فرش پر چاندنی بچھا کر، اُس پر طرح طرح کے کھانے لگادیے گئے۔ ایک اگر بتی بھی سلگادی گئی۔

لوگ اکٹھا ہوئے، ایک مولانا صاحب سب سے آگے، کھانے کے بالکل سامنے آکر دوزانو بیٹھ گئے اور کچھ سورتیں پڑھنا شروع کردیں۔

میں ٹوپی اوڑھے، دالسے سے لگا کھڑا تھا اور کھانوں کو دیکھ رہا تھا۔

بڑی بڑی تام چینی کی رکابیاں، ڈونگے، سینیاں اور تسلے۔ جن میں پلاؤ، قورمہ، شامی کباب، قیمہ، دہی بڑے اور پھلکیاں قطار سے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ تندوری روٹیاں، چپاتیاں، پراٹھے اور پوریاں بھی تھیں۔ میٹھے میں حلوہ، کھیر اور شاہی ٹکڑے۔ میری نظر میٹھے پر جم کر رہ گئی، مجھے لگا بڑے ماموں نے میرے کان میں کہا تھا۔

''رات کو جب واپس آنا تو چار آنے کی کوئی میٹھی چیز بدّو اں حلوائی کے یہاں سے لیتے آنا۔''

میری نظر میٹھے سے پھسلی تو دیکھا کہ ایک تھالی میں پان بھی بنا رکھا ہے۔ اور ایک پیالی میں چائے بھی رکھی ہے۔ طرح طرح کے پھل، کیلے، سیب اور امرود وغیرہ کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ ان کھانوں کے برابر میں ایک نیا کرتہ پاجامہ مع بنیان کے سلیقے سے رکھا تھا۔

مولانا صاحب نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا۔

''کے کلام پاک ختم ہوئے؟''

چھوٹے ماموں نے ادھراُدھر دیکھا پھر جواب دیا۔

''دو۔''

مولانا صاحب نے دو کلام پاک پڑھنے کے ثواب اور بخشے جانے کی دُعا کی۔ پھر اُس سارے کھانے کے ثواب کے لیے بھی دُعا کی۔ وہ دیر تک دُعا کے لیے اپنے ہاتھ اوپر اُٹھائے رہے۔

کھانوں، میٹھی چیزوں اور پھلوں پر مکھیاں آ رہی تھیں۔ چھوٹے ماموں بار بار ایک پنکھا ہلا کر مکھیاں اُڑاتے۔

اب جلدی جلدی خوراکیں نکالنے کا مرحلہ انجام دیا گیا۔ شاید سات یا گیارہ خوراکیں تھیں جو مسکینوں اور فقیروں میں تقسیم کرنی تھیں۔

مغرب کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اندھیرا سا ہونے لگا۔

''بڑے ماموں بھی آج اپنی قبر میں، اپنی پہلی فاتحہ کے کھانے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' میں نے تاسف کے ساتھ سوچا۔

اُس رات تمام رشتے داروں اور محلے والوں نے مل کر فاتحہ کے لیے پکایا گیا کھانا کھایا، گھر میں رونق رہی، اور اتنی باتیں ہوئیں کہ میرا دل گھبرا گیا۔ پتہ نہیں کیوں لوگ اُس دن اتنا بول رہے تھے؟

مگر دیر رات، جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو پورے گھر میں ایک دل ہلا دینے والا سناٹا پھیل گیا۔ لحد پر جلتے ہوئے چراغ کی روشنی میں، میں نے تو اس سناٹے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا!

فاتحہ کا یہ سلسلہ سات جمعراتوں تک چلتا تھا اور پھر چالیسواں بھی تھا۔

اگرچہ میں نے صرف تین جمعراتیں دیکھیں۔

مگر میں نے اب موت دیکھ لی تھی، اور اُس کا مکمل حلیہ بھی۔

میں پورے ایمان و ایقان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قتل اور موت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دونوں کے حلیے الگ، دونوں کے چہرے الگ اور دونوں کے لباس الگ۔

میں آج بھی اپنے اس خیال پر قائم ہوں۔

میرا، بارہویں کلاس کا نتیجہ آ گیا تھا اور میں نے پورے شمالی صوبے میں اوّل پوزیشن حاصل کی

تھی۔ اخبار میں میرا فوٹو بھی شائع ہوا تھا۔

چھوٹے ماموں تعلیم کے سلسلے میں بہت سنجیدہ تھے۔ اس چھوٹے سے قصبہ نما شہر میں کوئی ڈھنگ کا ڈگری کالج نہ تھا۔ انہوں نے کسی سے کوئی مشورہ کیا نہ میری مرضی جاننے کی کوشش کی۔ بس ایک دن ایک فارم بھر کر مجھ سے دستخط کرائے اور پھر کہا، ''گڈو میاں! تمھیں تین دن بعد بڑے شہر جانا ہے، تمھارا داخلہ وہاں کے سب سے بڑے کالج میں ہو گیا ہے۔ بس اپنا سامان باندھنا شروع کردو۔''

''ارے بچہ چالیسویں تک تو رُک جاتا۔'' ممانی نے اعتراض کیا۔

''نہیں، مجبوری ہے۔ داخلے کی تاریخ نکل جائے گی۔'' چھوٹے ماموں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

بڑے شہر کے لیے رات کے دو بجے ٹرین روزانہ ہوتی تھی۔

اُس رات، ایک بجے کے قریب مقصود خاں اپنا تانگہ لے کر آ گئے۔ تقریباً پورا محلّہ مجھے رخصت کرنے آیا۔

جب تانگے پر سامان رکھ دیا گیا تو گھر کے ہر فرد نے مجھے گلے سے لگایا، سب کی آنکھیں آبدیدہ تھیں۔

میرا کن کٹا خرگوش، میرے پاؤں پر اپنے پنجے رگڑ رہا تھا، اس کی لال لال آنکھیں مجھے اندھیرے میں بھی چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا۔ میں گھر کے اندر تیزی سے دوڑا اور طوطے کے پنجرے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ طوطے نے مجھے ناراض آنکھوں سے دیکھا اور اپنی چونچ پروں میں دبالی۔

میں جب خاموشی سے واپس پلٹنے لگا۔ تو میں نے دیکھا کہ لحد پر جلتا چراغ اچانک بجھ گیا ہے اور آنگن بے حد تاریک اور ویران ہو گیا ہے۔

میں نے چیخ کر کہا۔

''چراغ بجھ گیا ہے۔''

ممانی اور ریحانہ پھوپھی بھاگی بھاگی آئیں اور ماچس کی تیلی رگڑ کر دوبارہ چراغ روشن کردیا۔

لحد پر جلتے اس چراغ کی روشنی میں، باورچی خانہ کا بند، بوسیدہ دروازہ ایک نامعلوم سائے کی طرح نظر آیا، جس کے آگے نل کا ہتھا جھکا کھڑا تھا۔ میں جب ماموں کے ساتھ، تانگے پر بیٹھ گیا تو مجھے دھوکہ ہوا جیسے گھر کے اندر، پنجرے میں سے سنبل نے کہا تھا۔

''گڈو میاں گئے، گڈو میاں گئے۔''

اسٹیشن پہنچ کر چھوٹے ماموں نے مجھے ریل میں بٹھا دیا۔ اور خود کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اسٹیشن پر ہوا بہت تیز تھی، اُن کی شیروانی، اس ہوا میں بار بار پھڑپھڑاتی تھی۔ جب ٹرین نے چلنے کی سیٹی دی تو وہ اچانک رو پڑے، ''خوب محنت سے پڑھنا، ایسے ہی خاندان کا نام روشن کرنا۔'' وہ رینگتی ہوئی ٹرین کے ساتھ پلیٹ فارم پر بھاگنے لگے۔ ''گڈو میاں! محنت سے پڑھنا، خط لکھنا۔ تم ہی اب خاندان کے چشم و چراغ ہو۔'' اُن کی آواز اور اُن کا جسم دونوں تھوڑی دیر تک ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑے پھر، ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور اندھیرے میں گم ہو گئے۔ برابر والی لائن پر کسی مال گاڑی کا ڈبہ لڑھکا پڑا تھا جو مجھے مردہ ہاتھی کی مانند نظر آیا۔ تو میں ہی اب خاندان کا چراغ تھا! چالیسویں تک لحد پر چراغ جلے گا۔ اور دسمبر کی ہواؤں سے اپنا رشتہ بنائے رکھے گا۔ یہ ہوائیں بڑے شہر میں بھی ہوں گی۔ میں نے سوچا اور یہ بھی کہ اچانک میرے گھر سے رخصت ہوتے وقت چراغ گل کیوں ہوا تھا؟ کیا بڑے ماموں کی روح، مجھے رخصت کرنے آئی تھی؟ ٹرین اب اندھیرے جنگلوں میں کہیں دوڑ رہی تھی۔ کھڑکی سے تیز سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا لیا۔ اب اندر باہر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں ریل کے دھچکے لوری سنا سنا کر مجھے جھولا جھلانے لگے۔ پتہ نہیں کب، میں یوں ہی بیٹھے بیٹھے گہری نیند سو گیا۔
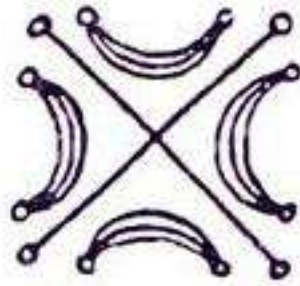
محمد ساجد

لیس سر

عبدل معید

لیس سر

شاہکار عالم وارثی

لیس سر

انیل کمار سنگھ

لیس سر

صابر علی صدیقی

لیس سر

ہرش سچدیو

''حفیظ الدین بابر''

''لیس سر۔'' میں کھڑے ہو کر جواب دیتا ہوں۔

پروفیسر ایس پی یادو اپنی آنکھوں سے چشمہ اُتارتے ہیں۔ اُن کی دو لال لال ویران آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

''تمھارا نام حفیظ الدین بابر ہے۔'' وہ مجھے غور سے دیکھ کر کہتے ہیں۔

''جی۔''

''والد کا نام۔''

''ظہیرالدین بابر۔''

''کیا کرتے ہیں؟''

''جی، وہ اب اس دنیا میں نہیں۔''

''اوہ مجھے افسوس ہے۔'' پروفیسر یادو دوبارہ اپنی لال لال آنکھوں پر چشمہ لگا لیتے ہیں۔

میں چاہوں بھی تو اس منظر سے میرا پیچھا کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ مجھے یاد ہی رہتا ہے۔ ہمیشہ یاد، بلکہ اسے یاد رہنا بھی کیسے کہا جائے؟

کیا مجھے اپنا گھٹنا، اپنا ناخن، اپنے کان کا میل یاد رہتا ہے؟ مگر وہ ہیں میرے ساتھ۔ میرے جسم کے ساتھ، بالکل اسی طرح شہر میں۔ کالج کے پہلے دن کا یہ منظر میرے ذہن کے ساتھ ہے۔ بے وجہ اور—بغیر کسی مقصد کے ساتھ۔

یہ پالیٹیکل سائنس کی بی۔اے کی کلاس تھی۔ شہر کا یہ سب سے اچھا کالج تھا۔ اس کی عمارت لال رنگ کی اور گوتھک طرز کی بنی ہوئی تھی۔ یہ بہت قدیم کالج تھا اور کسی زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک رہ چکا تھا۔ اس کالج کا ہوسٹل دور دور مشہور تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ چند بڑی بڑی یونیورسٹیاں بھی اس کالج کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔ مجھے بہت آسانی سے ہوسٹل میں کمرہ الاٹ ہوگیا تھا۔

یہ بڑا شہر، ہمارے اُس قصبے نما چھوٹے سے شہر سے بہت دور نہ تھا۔ راستے میں صرف دو ندیاں پڑتی تھیں—ایک تو شہر چھوڑتے ہی قلعہ کی ندی اور دوسری، کچھ آگے جا کر رام گنگا۔

مگر یہاں آکر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بہت دور آگیا ہوں۔ جیسے میرا گھر، بہت دور تھا۔ گزرے ہوئے واقعات مجھے اب ایسے بھیانک خواب کی طرح محسوس ہوتے تھے، جنھیں صبح کو جاگ جانے پر، ہنس کر بھلا دیا جائے۔

یہ کچھ قابل تعجب بات تھی۔ شہر آکر میں جیسے ایک ایسی آندھی کی زد میں تھا جو میرے آس پاس کی تمام اشیا یعنی وہ تمام یادیں جو میں اپنے گھر سے اپنے بدن پر چپکائے ہوئے لایا تھا، دھول کے

پُراسرار غبار میں اُڑاتی ہوئی بھیانک تیزی کے ساتھ، مجھ سے دور لے جا رہی تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے کوئی افسوس بھی نہ تھا۔ شاید میرے لاشعور میں دبی ہوئی خواہش تھی کہ میں وہ سب بھول جاؤں۔ وہ سب—؟

اور حقیقتاً، اُن دنوں، شہر میں نیا نیا اور کالج میں نیا نیا میں تقریباً سب بہت بے رحمی کے ساتھ بھولنے لگا۔ کچھ دنوں بعد تو میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ مجھے گھر پر گڈو میاں کہا جاتا تھا۔ اب میں حفیظ الدین بابر تھا یا حفیظ الدین۔ یا پھر صرف حفیظ۔ مگر اب میں کسی کے لیے گڈو میاں نہ تھا۔

یہاں آ کر میرے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ میری شخصیت کا رُخ ہی بدل کر رہ گیا۔ میں چند ذہین لڑکوں کے گروپ میں شامل ہو گیا۔ کالج میں، لڑکیاں بھی ساتھ پڑھتی تھیں۔ اور لڑکوں کے ساتھ اُن کے معاشقے بھی چلتے تھے۔ مگر پابندیاں بہت تھیں۔ آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں (کیا واقعی لکھ رہا ہوں؟) تو مجھے حیرت ہے کہ ساٹھ کی دہائی ہر لحاظ سے کتنی مختلف تھی اور زمانہ کس قدر تیزی کے ساتھ بدلا ہے۔

مگر ٹھہریے! مجھے اپنی یادداشتیں اس طرح نہیں لکھنی چاہئیں۔ یہ تو محض بیان ہیں۔ اور بیان سے میرا کام نہیں چل سکتا۔ مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میں اپنی سوانح وغیرہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو دراصل کچھ عرض داشتیں، کچھ اپیلیں وغیرہ لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد تو اپنی عدالت کی تلاش ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر مجھے ڈھنگ کی ایک بھی سطر لکھنا آتی یا ایک تخلیقی جملہ بھی لکھ سکتا تو پھر تو میں ناول کا صدر دروازہ تیار کر ہی لیتا۔ پھر تو مجھے اور کہیں جانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ میں اپنے ناول کے اندر ہی رہتا۔ میرا مقدمہ، میری عدالت، میرا انصاف اور میرا گھر سب ناول کے اندر رہتے۔ ناول چیز ہی ایسی ہے۔ بس آپ کو لکھنا آنا چاہیے۔ اس کے بعد تو، سزا جزا، جنت، جہنم سب ناول کے اندر ہی مل جائیں گے۔

مگر ایک بار پھر افسوس اور صد ہا افسوس کہ اس معاملے میں انتہائی بنجر واقع ہوا ہوں۔ اس لیے جو لکھ رہا ہوں، وہ ایک کے بعد ایک عرضیوں کی ڈھیریاں بنتی جا رہی ہیں۔ عرض داشتوں کا پلندہ لگتا جا رہا ہے۔ مگر چونکہ ہر اپیل اور ہر عرض داشت میں کوئی نہ کوئی پہلو تو داخلی نوعیت کا ہوتا ہی ہے، بلکہ

شاید سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن پہلو تو لکھنے والے کی داخلی شخصیت ہی ہوتی ہے۔ قابلِ رحم انداز میں، بھیک کا کٹورا ہاتھ میں لیے کھڑے ہونے میں ہی ایک عظیم آرٹ پوشیدہ ہے۔ اس لیے میں ہر اُس بیان سے کترا رہا ہوں جہاں میری اپنی ذات ایک فعال کردار نہ بن سکے۔ اور عرضیاں، اپیلیں سب میں الفاظ کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ لفظوں کا پابند رہنا پڑتا ہے اگر لفظ زیادہ ہو جائیں یا بہت کم ہوں تو وہ کاغذ کے یہ ورق پھاڑ کر دھجیاں دھجیاں کر کے — تمھارے منہ پر مار دیتے ہیں اور تمھارے بس میں کچھ نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ تم کاغذ کے ان چیتھڑوں کو فرش سے بین بین کر اُٹھاؤ اور خود ہی وہاں رکھے ایک بڑے اور منحوس کوڑے دان میں ڈال دو۔ اپنی عرض داشتوں کے ساتھ لگے ہوئے بیانِ حلفی اور اُن پر چسپاں ٹکٹ۔ لیجیے ایک ذرا سی غلطی پر سب گئے اُس کوڑے دان میں۔

وہ کوڑے دان تو اب ایک آرکائیو، ایک ریکارڈ روم ہی بنتا جا رہا ہے۔

اسی لیے میں غیر ضروری تفصیلات سے دامن بچانے پر مجبور ہوں۔ حالانکہ مجھے یہ احساس ہے کہ اس سے پہلے میں نے بے وجہ، غیر ضروری تفصیلات اور بے معنی جزئیات سے کام لیا ہے۔ مگر اتنے سنجیدہ قانونی معاملات میں، یہ شوقِ فضول بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کا احساس بہرحال مجھے ہے۔

بی۔اے میں میرے مضمون تھے معاشیات، سیاسیات، فلسفہ اور انگریزی ادب۔

میری ذہانت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں کسرِ نفسی سے کام کیوں لُوں؟ اور وہ بھی اب جبکہ زندگی کی شام دُھند اور غبار میں لپٹی ہوئی سامنے ہی نظر آ رہی ہے۔

میں اپنے — بی۔اے کے ساتھیوں سے بہت کم گفتگو کرتا، زیادہ تر ایم۔اے کے طلبا اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ ہی اُٹھتا بیٹھتا اور بحثیں کرتا۔

بحث، مباحثہ، کرنے کی تو بہت بری لت پڑ گئی تھی مجھے۔ فلسفے میں منطق نے اس عادت کو اور بھی جلا بخشی تھی۔ حالانکہ فلسفے میں، میری دلچسپی اور مضامین کے مقابلے بہت کم تھی۔ کیونکہ سوائے مجرد خیالات کے، وہاں کچھ تھا ہی نہیں، خاص طور پر مغربی فلسفہ تو بے ہنگم تصوّرات اور بچکانہ خیالات کے

مجموعۂ اضداد کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

ہاں! مگر ہندوستانی فلسفے میں بعض باتیں اور بعض نکات ایسے تھے کہ جن پر ہمیشہ میں نے بہت سنجیدگی سے غور کیا۔ خاص طور پر روح اور جسم کے معاملات، حیات بعد الموت کے نظریات اور بہت سی چیزیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی فلسفے میں نیائے درشن نے جو ترک شاستر پیش کیا ہے، ارسطو اُس کے عشر عشیر بھی کچھ نہ کر سکا۔

روح اور جسم کے باہمی رشتے اور تعلقات انسان کے لیے پوری طرح قابل فہم نہیں رہے۔ اس لیے میری دلچسپی مجرد خیالات میں نہ ہو کر، انسانوں میں رہی، میں دوسرے مضامین بہت لگن اور جی توڑ محنت سے پڑھتا رہا۔ اب جاسوسی ناولوں کا شوق بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر روح اور جسم کا تعلق مجھے ہمیشہ ایک جاسوسی ناول کا پلاٹ محسوس ہوتا رہا اور اب — میں جو لکھ رہا ہوں، کاش کہ زمانۂ طالب علمی میں ہی اُسے سمجھ لیتا۔ ایک بار، پھر اُن سطروں کو لکھنے کو جی چاہ رہا ہے جو اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔

یہ دنیا ایک حقیر نقطے سے شروع ہوئی تھی۔ اب یہ کیسا شیطانی روپ اور حجم اختیار کر چکی ہے اور اس میں مرنے اور جینے کا سلسلہ چل رہا ہے۔ روح ایک ہوا کی مانند جسم کے اندر رہتی ہے۔ پھر ایک دن جسم کو چھوڑ کر ایک بے حد بے مروت اور خود غرض مہمان کی طرح وہاں سے چل دیتی ہے۔ اپنے اُس آبائی گھر کو چھوڑ کر جس میں اُس کا اتنا خیر مقدم کیا گیا۔ سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ کتنی خاطر، کتنی تواضع کی گئی، کتنے ناز نخرے اُٹھائے گئے۔ مگر روح کی آنکھوں میں سور کے بال ہیں۔ وہ جسم کو چھوڑ کر اُسے زمانۂ گزشتہ کا واقعہ سمجھ کر رخصت ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے عالم کے لیے، شاید عالم لافانی کے لیے۔

مگر اُس کی روح ایسا نہیں کرے گی۔ وہ اپنے میزبان کے گھر کو، بلکہ اپنے گھر کو نہیں بھولے گی۔ وہ عالم بالا کی طرف رُخ نہیں کرے گی، وہ اس دنیا سے، اس گھر سے، اپنے لوگوں سے رابطہ قائم رکھے گی۔

ممکن ہے کہ یہ اس کی روح کے لیے بڑی بدنامی کی اور ذلیل بات ہو جس کے لیے اُس پر لعنت ملامت کی جائے، جھاڑ پھونک کی جائے۔ عاملوں کا سہارا لیا جائے، تعویذ اور گنڈے استعمال کیے جائیں۔

مگر اُس کی روح لعنت کے اس طوق کو، اپنی صلیب بنا کر، اپنے گناہوں اور اپنے جرائم کو اپنے غیر مرئی کاندھوں پر لاد کر، ادھر — یہیں جی ہاں، ادھر ہی بھٹکے گی۔ وہ کسی عالم لافانی کی طرف کوچ نہیں کرے گی۔ اس کرب، بے چینی اور گھبراہٹ کو وہ اپنا دائمی مقدر تسلیم کرے گی۔ اور ایک قندیل کی طرح ہوا میں اُڑتی بھٹکتی پھرے گی۔

روح اور جسم کے آپسی گٹھ بندھن نے ہی خوف مرگ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ دنیا جو ایک حقیر نقطے سے شروع ہوئی تھی، انسان کے لیے ایک معمہ بن کر رہ گئی۔

مگر اُس کے لیے یہ معمہ نہیں ہے۔ یہ کوئی سوال نہیں ہے، یہ محض ایک بے تکے نقطے کا بے ہنگم انداز میں پھیلتے رہنا ہے، ایک مرض — ایک کینسر کی مانند۔

یہ دنیا جس میں انسان رہتے ہیں، بچے رہتے ہیں اور ایک باورچی خانہ بھی اِسی نقطے میں چھپا رہتا ہے۔

ہاں، باورچی خانہ۔ ایک انتہائی — بھیانک اور خطرناک جگہ۔ اس شیطانی نقطے کو بڑھانے اور پھیلانے میں شاید سب سے زیادہ مدد اِسی باورچی خانے نام کے مقام نے کی ہے۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں سے اُسے مستقبل کی تمام بدشگونیوں کی علامتیں اس طرح حاصل ہوتی تھیں، جیسے سر پر بارش ہو رہی ہو۔

مگر یہ ''اُس'' کی کہانی ہے جو ابھی اپنے ''میں'' سے کٹ کر یا نکل کر باہر نہیں آیا۔ مگر یہ اُس ''میں'' کے صیغۂ غائب میں ایک حلفیہ بیان تو مانا ہی جا سکتا ہے۔ اور مناسب وقت آنے پر، اس کا جائز استعمال ہونے کے امکان سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ابھی ''اُس'' کی کہانی سنانا یا بات سننا ذرا مشکل ہے۔ ابھی بڑا شور برپا ہے۔ ''میں'' نے بھیانک شور شرابا اور ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ ابھی رُکی ہوئی ہواؤں اور سناٹوں کی آوازوں کو کوئی نہیں سن پائے گا۔ ابھی شور ہے، بہت شور۔
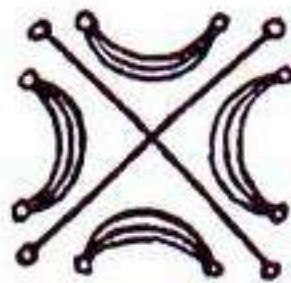
اور اسی شور میں، میری کھوپڑی میں، وہ زہریلا سانپ موجود تھا جس نے ایک طرح سے، کچھ معاملوں میں میرے اوپر چودہ طبق روشن کر رکھے تھے۔ یہ سانپ سر میں کلبلاتا، دل میں گھبراہٹ ہوتی اور پیر کانپنے لگتے۔ میری بدقسمتی کے اس مرض نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

میں دو دو قتل بھول گیا۔ میں بڑے ماموں کی موت بھول گیا، میں بہت جلد، نہ جانے کیا کیا بھول گیا مگر باورچی خانے سے آتی ہوئی، کسی خوشبو یا بدبو کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ میں یہ نہیں بھولا۔

میں اپنی اس پُراسرار صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

ہوسٹل میں جہاں میرا کمرہ تھا۔ وہاں راہداری ختم ہو جاتی تھی۔ یوں دیکھیں تو آخری کمرہ تھا جس کے بعد میس کی عمارت شروع ہو جاتی تھی۔ یعنی باورچی خانے کی حکومت۔

دن بھر میرے کمرے میں، طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں یا کبھی کبھی بدبوئیں بھی آتی رہتی تھیں اور میں اُنھیں ایک کتّے کی مانند سونگھنے پر مجبور تھا۔ کچھ دنوں سے طلبا، ہوسٹل کے کھانے سے مطمئن نہیں نظر آرہے تھے۔

میرے کمرے میں ترپاٹھی اور ادریس بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

''یار حفیظ... اب ایسے کام نہیں چلے گا۔'' ادریس نے سگریٹ سلگایا۔

''کیا ہوا؟''

''کل سالوں نے بریانی کے نام پر دھوبی پلاؤ زہر مار کرادیا۔''

ترپاٹھی نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور پان مسالہ منہ میں ڈال کر بے ہنگم انداز میں چبانے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کھانے کے بارے میں، ویدوں یا اُپنشدوں سے کوئی نکتہ یا فقرہ نکال کر لائے گا ترپاٹھی کو قدیم ہندوستانی فلسفے پر خاصا عبور حاصل ہو گیا تھا۔ مگر ٹھیک اُسی وقت مجھے اپنی ناک میں ایک سڑاندھ کا احساس ہوا۔ میں نے نتھنے پھلائے تو علاء الدین ہنس کر بولا۔ ''گوبھی ہے، گوبھی۔''

''بڑی بدبو ہوتی ہے یار جب گوبھی پکتی ہے۔''

''یہ اصل میں گندھک کی وجہ سے ہے، گوبھی میں گندھک یعنی سلفر بہت پایا جاتا ہے۔'' ترپاٹھی نے اپنی علمیت کا اظہار شروع کر دیا۔

''پتہ ہے یار— '' علاء الدین نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کھیتی میں بطور کھاد تازہ تازہ انسانی فضلہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔''

''دیکھ بھائی علاء الدین— تو نے Food Cycle پڑھی ہے؟'' ترپاٹھی نے پوچھا۔

علاء الدین نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرے پاس ہائی اسکول میں سائنس تھی، میں نے پڑھی ہے۔ سارا کھیل نائٹروجن اور امونیا کا ہے۔ چیزیں وہیں سے شروع ہوتی ہیں جہاں پر ختم ہوتی ہیں۔ یہ آنتوں سے آنتوں تک کی یاترا ہے۔ انسان کی آنت میں گیا کھانا، رنگ روپ، بدل کر باہر آتا ہے، اور دوبارہ اُس کی آنتوں کے لیے خود کو مٹا کر سڑا کر نیا کھانا تیار کرتا ہے۔ اسی لیے یجروید میں اُس یگیہ کی بہت اہمیت ہے، جس میں صرف منتر کے ذریعے، آنتوں کی بھوک مٹ جائے اور کھانا محض علامتوں میں بدل جائے۔'' ترپاٹھی آگے بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر میں نے نہیں سنا۔

میرے ہاتھ پیر کانپنے سے لگے۔

وہ کالا جادو یہاں بھی چلا آیا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے۔ اپنے گھر سے اس شہر تک۔ میں نے دو ندیاں پار کیں، مگر جادو نہیں کٹا۔ لیکن پھر مجھے ایک کمینی اور چھچھوری مسرّت کا احساس ہوا۔ یہ جادو میرا دشمن نہیں ہے۔ یہ تو میری طاقت ہے۔ ایک ایسی کالی طاقت جس کا علم کسی کو نہیں، میری چھٹی حس جو اپنی وسعت میں ایک دن اس نیلگوں آسمان کو بھی سمیٹ لے گی۔ مجھے اپنی جیومیٹری کی ساری اشکال، اُن کے زاویے اور آپسی محور یاد تھے۔ اس کمینی اور چھچھوری مسرّت کا احساس ہوتے ہی میرے ہاتھ پیر

کانپنا بند ہو گئے۔

''آج گوبھی کا پکنا اچھی بات نہیں ہے۔'' میں نے مسکرا کر اپنے لفظوں کو تولتے ہوئے کہا۔

''ارے یار گوبھی پکنا تو کسی بھی دن اچھی بات نہیں ہے۔'' ترپاٹھی بیزاری سے بولا۔

میں فخریہ انداز میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

''چلو، ڈائننگ ہال میں چلیں دو بج رہے ہیں۔ بھوک لگنے لگی۔'' علاءالدین اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم لوگ جاؤ، میں کمرے میں ہی کھانا کھاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''ابے سالے پڑھاکو — تیرے جیسوں کا ہی بیڑہ غرق ہوتا ہے۔ مت بن کتابی کیڑا، مت بن۔'' ترپاٹھی نے پھر اپنی تقریر شروع کی۔

میں نے اُسے دکھانے کے لیے، ایک جماہی لی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

علاءالدین اور ترپاٹھی کمرے سے چلے گئے تھے۔ نومبر کا مہینہ تھا جو کوئی مہینہ نہیں ہوتا۔ اس کی اپنی کوئی شناخت، کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے، اور اپنی تاریخیں یاد کرانے کے لیے بھیانک واقعات یا حادثات کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوپہر تین بجے سے ہی اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ کیونکہ دھوپ کا گزر نہیں تھا۔ ڈائننگ ہال سے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے چادر سے منھ نکال کر غور سے سننے کی کوشش کی۔ یہ شور کھانے کے بارے میں یا کھاتے وقت کا عمومی شور تو نہ تھا۔ اب مجھے بھی کچھ بھوک لگ رہی تھی۔ بیرا نہ جانے کب کا میز پر کھانا رکھ کر چلا گیا تھا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ پہلے کوئی بڑی خبر سن لوں۔ پھر آرام سے کھانا کھاؤں گا۔ کسی طالب علم کی خبر آتی ہے یا کسی پروفیسر کی یا پھر جلاّد پرنسپل کی — ؟ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ آج، اس وقت ہوسٹل کے میس میں گوبھی پکنا غلط تھا، اور بدشگونی کی علامت تھا۔

ڈائننگ ہال سے شور بڑھتا ہوا گیلری کی طرف آنے لگا۔ میں بستر سے اُٹھ کر کمرے کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ تیز تیز بھاگتا ہوا، ترپاٹھی مجھے دور سے ہی نظر آ گیا۔

''حفیظ — حفیظ — غضب ہو گیا۔'' وہ دور سے ہی چلاّنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' میں اندر ہی اندر اپنی صلاحیت کا معترف ہونے لگا۔

''اِندرا گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔''

اب مجھے واقعی سکتہ سا طاری ہونے لگا۔ اس نوعیت کی خبر کی مجھے خواب تک میں توقع نہ تھی۔
طلبا اور پروفیسر افراتفری میں اِدھر اُدھر جاتے ہوئے نظر آئے۔ کئی لوگ کان پر ٹرانسسٹر لگائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ کل تک کے لیے کلاسز ملتوی کردیے گئے ہیں۔

نہ جانے کب شام ہوگئی۔ اکتوبر کے آخر اور نومبر میں سورج اتنی تیزی سے ڈوب جاتا ہے کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ ہر جانب ایک سناٹا تھا۔ سڑکیں سنسان اور دہشت زدہ سی نظر آرہی تھیں۔ لوگ یا تو بھیڑ بنا کر ایک جگہ اکٹھا ہوکر چہ میگوئیاں کررہے تھے یا پھر بہت تیزی کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جارہے تھے۔ سرکاری دفاتر کے بند کرنے کا اعلان کردیا گیا تھا۔ میں کالج کے آس پاس کی سڑکوں اور کتابوں کی چند دوکانوں پر بھٹکتا رہا۔ مجھے اپنے قصبے میں کسی کی کہی ہوئی بات یاد آرہی تھی کہ جب ملک کا کوئی بڑا سیاسی رہنما یا قائد مرتا ہے تو سارا ملک سائیں سائیں کرتا ہے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی پھیل جاتی ہے۔ اور یقیناً ایسا ہی تھا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو یہاں سے چار سو پچاس کلومیٹر دور — دہلی میں اپنے گھر کے قریب، اُن کے اپنے ہی باڈی گارڈوں یا محافظوں کے ذریعہ گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ مگر ویرانی یہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس میں نومبر کی بے رنگ شام کا بھی کچھ حصہ مل گیا ہو۔

میں چلتے چلتے پرساد ٹاکیز کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ یہاں امیتابھ بچن اور دھرمیندر کے بڑے بڑے پوسٹر لٹک رہے تھے۔ فلم شعلے چل رہی تھی۔ شعلے اس ٹاکیز میں گذشتہ آٹھ سال سے چل رہی تھی۔ اور آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو یقین کیجیے پرساد ٹاکیز میں آج بھی شعلے دکھائی جارہی ہے۔ آج جب میری عمر اڑسٹھ سال کی ہوچکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ امیتابھ بچن اور دھرمیندر کی شکلیں بھی اب بوڑھی اور قابلِ رحم نظر آتی تھیں۔ مگر ٹاکیز خالی تھا۔ اُس پر تالہ لٹکا ہوا تھا۔ شہر کے سارے سنیما ہال بند کردیے گئے تھے۔ میں فلم دیکھنے نہیں گیا تھا۔ مگر سنیما ہال کو ویران دیکھ کر، اُس پر ایک منحوس تالہ لٹکا ہوا دیکھ کر، میرے دل کو سخت دھکا پہنچا۔

پوسٹر میں، میں نے سنجیو کمار کی انتقام میں جلتی سلگتی ہوئی آنکھیں دیکھیں اور سوچا کہ آج شام کے اور رات کے شو میں، سنجیو کمار کا انتقام فلم کی ایک خاموش اندھیری ریل میں بند رہے گا۔ وہ باہر نہیں آئے گا۔ جس طرح ہر انتقام، بلکہ ہر جذبہ وقت کے فریم میں بہتا ہے اور کبھی — شاید رُک جاتا ہے

بالکل اس طرح جیسے کسی کے دل کی رگوں میں بہتا ہوا خون جم جاتا ہے اور حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔

وہ انتقام کا زمانہ تھا۔ اینگری ینگ مینوں کا زمانہ۔ راجیش کھنہ کی قربانیوں، الیوں اور محبتوں کا زمانہ ابھی بس حال ہی میں گزرا تھا۔ مگر اب اُس کے نشان بھی باقی نہ تھے۔ اب انتقام کا رُخ انفرادی تھا۔ اور اِس انفرادی انتقام کو اجتماعی شعور نہ صرف پسند کرتا تھا بلکہ اس پر پھول برساتا تھا اور تالیاں بجاتا تھا۔

انتقام جس کی پیداوار یا جس کی جڑوں کا ایک کیڑا خود میں بھی تو تھا اور اِندرا گاندھی کا قتل ——؟

سورن مندر پر گولیاں چلائے جانے کا بدلہ اور خالصتان کو سیاسی طور پر قبول نہ کرنے کی سزا۔

سنیما ہال کے سامنے کھڑے پولیس کی گاڑیاں سائرن دیتے ہوئی نکل گئیں۔ دفعہ 440 لگا دی گئی تھی۔ ریڈیو پر خبر آئی کہ دہلی میں سکھوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ بازاروں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ سکھوں کے گھر پھونک دئے گئے ہیں۔ اب اِندرا گاندھی کے قتل کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔

31/اکتوبر کی یہ شام اب جاڑوں کی رات میں بدلنے لگی۔ ویرانی کا احساس اور بڑھ گیا اور خوف و دہشت کا بھی۔

میں واپس ہوسٹل اپنے کمرے میں آیا۔

گیلری میں میرے احباب میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب میرے کمرے میں چلے آئے۔

کمرے میں، گوبھی کی بو بری طرح بھری ہوئی تھی۔

مجھے اپنی ناک پر ہاتھ رکھنا پڑا۔

اُس رات میرے کمرے میں دوستوں کا آنا جانا لگا رہا۔ ہیٹر پر چائے بنتی رہی اور سیاسی بحثیں ہوتی رہیں۔ حالانکہ ہم سب کی عمر اُن دنوں سیاسی یا سماجی شعور کے معاملے میں صرف بچکانہ رویّوں یا خیالات کے مناسب ہی ہو سکتی تھی۔ پھر بھی بہت بکواس ہوتی اور بکواس کے درمیان کہیں کہیں کوئی ایسا جملہ بھی چمک اُٹھتا تھا جس کی معنویت آج مجھے پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے، مجھے نہ اُن دنوں کوئی سیاسی شعور تھا اور نہ اب ہے۔ میرے سامنے دوسرے سوال تھے اور یہ سوال خود میرے وجود کی آہٹیں مجھ سے ہی کرتی تھیں۔ میرے ساتھ ایک ماضی تھا جس سے خون کی بو

آتی تھی۔ اگرچہ میں اس ماضی کو بڑی بے شرمی کے ساتھ بھول گیا تھا مگر دراصل ہم بھولتے کچھ بھی نہیں ہیں۔ پیڑ سے گرا ایک پتہ تمھارے جوتے کے تلے میں چپک جاتا ہے، تم چلتے چلتے کچھ دیر تک پتے کی سڑک پر رگڑ کی آواز سنتے ہو، پھر دنیا کے شور اور اُس کی بے ہنگم آوازوں میں پتے کی رگڑ دب کر معدوم ہو جاتی ہے۔

مگر ایک دن آتا ہے جب تم اپنے جوتے کی صفائی کرنے اور اس پر پالش کرنے بیٹھتے ہو۔

بس وہی دن — دوبارہ تمھیں تمھارے گناہ یاد دلاتا ہے۔ وہ دن تمھیں یاد دلاتا ہے کہ تم نے اپنے کتنے گندے کپڑے دھوبی کو دھلنے کے لیے دیے تھے، تم اپنی جیب سے وہ فہرست نکالتے ہو اور پڑھتے ہو اور پھر ملاتے ہو— کپڑے سے کپڑا— اور یہ بھی کہ کون سا کپڑا مسک کر، پھٹ کر، دھوبی کے یہاں سے واپس آیا ہے اور کون سا کپڑا گم ہو گیا، ہمیشہ کے لیے۔ تو بس اتنا ہی تھا اور یہاں شہر آ کر محض ایک گوبھی پکنے کی بُو نے مجھے ایک بار پھر اپنے اندر بیٹھے خوفناک بن مانس کا احساس دلا دیا۔ مجھے سب کچھ بڑی شدّت کے ساتھ یاد آ گیا۔ اتنی شدّت کے ساتھ کہ کاغذ پر اس لفظ ''یاد'' کو لکھنے سے زیادہ مضحکہ خیز اس وقت اور کچھ نہیں ہوگا۔

میرے سوال سیاسی غلطیوں کے بارے میں نہیں تھے۔ میں اندرا گاندھی کی سیاسی غلطیوں کے بارے میں گفتگو کرنے کا اہل ہی نہ تھا۔ میں تو مگر، جرم، سزا اور انصاف کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنے سر کے بائیں حصے کو ہمیشہ کشمکش میں مبتلا کرتا رہتا تھا۔ اور وہ حصہ پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا تھا۔

جرم کس سے سرزد ہوتا ہے؟

سزا کیسی ہوتی ہے؟ سزا کا چہرہ کیا قتل سے ملتا جلتا ہوتا ہے؟

پھانسی کے تختے کی طرف مجرم کو لے جاتے ہوئے جلاّد کون سا گیت گاتا ہے۔

اور انصاف— ؟ انصاف کس عدالت میں ہوتا ہے؟ عدالت آخر ہے کہاں؟ سزا اور انصاف میں کیا فرق ہے؟ کیا سزا کے دانت اُتنے ہی بڑے بڑے اور نکیلے ہیں جتنے کہ انصاف کے دانت۔ سزا اور انصاف کے چہرے آپس میں کتنے مشابہ ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر وہ ہاتھ، جو انصاف کی خون جیسی لال روشنائی میں اپنی انگلیاں ڈبو کر، انسان کی پیٹھ پر سزا کے منحوس عدد لکھتا ہے، وہ ہاتھ کس کا ہے؟

وہ ہاتھ کس کا ہے؟

ریڈیو نے بتایا کہ دلّی میں سکھوں کے پورے کے پورے علاقے پھونک دیے گئے اور گرودواروں میں آگ لگا دی گئی۔ سکھوں کا قتل عام تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ بہت بعد میں شاید، راجیو گاندھی نے کہا تھا کہ ''جب ایک — بڑا اور گھنا پیڑ گرتا ہے.....تو؟''

پتہ نہیں آگے کچھ کہا تھا۔ مگر میرے لیے اُسے اس وقت یاد کرنا اور وہ بھی ذہن پر زور دے کر محض ایک رائیگاں اور بے معنی سی تکلیف دہ حرکت ہے۔

اُس رات میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ اگلا سال میرے بی۔ اے کا سال دوئم ہوگا اور میں جو ایم۔ اے پالیٹیکل سائنس میں کرنے کے بعد ریسرچ کرنا چاہتا تھا اور کسی یونیورسٹی میں پروفیسر بننا چاہتا تھا — اچانک بدل گیا۔

میں نے حتمی فیصلہ کرلیا کہ میں قانون پڑھوں گا۔ اگلے سال میں ایل. ایل. بی. میں داخلہ لوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ دل میں یہ فیصلہ کرتے ہی مجھے وقتی طور پر بہت سکون حاصل ہوا — رات گزر گئی تھی، پو پھٹ رہی تھی۔

میری ہی نہیں، ہم سب کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

نیند میں اونگھتے ہوئے، میرے کان میں ریڈیو پر آتی ہوئی خبر سنائی دی۔

''راجیو گاندھی کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔''

یہ خبر میرے لیے ایک لوری کی طرح تھی۔ اچانک مجھے بہت گہری نیند کا غلبہ محسوس ہوا۔ نومبر کی اس بے ہنگم صبح کی ہوا میں ایک بدمزہ اور خشک سی خنکی تھی۔ میں نے چادر کو منھ تک اوڑھ لیا۔

شہر میں، میری تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا اور چھٹیوں میں، میں گھر بھی جاتا رہا مگر اب میں اپنی اپیل کے اُس پیراگراف پر آپہنچا ہوں جہاں گھر کے بارے میں دوبارہ تفصیل سے باتیں کرنا تکنیکی اعتبار سے میری عرض داشت اور میری اپیل کو خراب کرسکتا ہے اور میرا کیس کمزور پڑسکتا ہے۔

پھر بھی، چند باتیں اور واقعات تو ایسے ہی ہیں جن کو مختصراً مجھے اس مقام پر بیان کرنا چاہیے۔ کم از کم جتنا قانون میں نے پڑھا ہے اور دستاویزوں کو مستند بنانے کا جو طریقہ مجھے بتایا گیا ہے، اس کے مطابق مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ حالانکہ میرا دل اور طبیعت دونوں اس سے اُچاٹ ہیں۔

گھر پر سب کمزور ہوتے رہے اور پہلے سے زیادہ بوڑھے بھی۔ مجھے اب نہ اُن کی کمزوری میں پہلے جیسی دلچسپی رہی اور نہ اُن کے بڑھاپے میں۔ ایک بار جب بی۔ اے فائنل کے امتحانات سر پر تھے، مجھے ایک ساتھ گھر سے دو اموات کی خبر ملی۔ اچھن دادی آخرکار مرگئی تھیں اور اُن کے مرنے سے دو دن پہلے میرا کن کٹا خرگوش بھی آم کے درخت کے نیچے مردہ پایا گیا۔ میں ان دونوں اموات سے زیادہ تو کیا، بالکل بھی متاثر نہ ہوا۔

پتہ نہیں یہ بات میری موافقت میں جاتی ہے یا میرے خلاف، مگر حقیقت یہی ہے کہ کالج کے اُن دنوں، میں اپنا گھر، اپنا بچپن، اپنے پالتو جانور سب کو اس طرح بھلا چکا تھا جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلا دیا جاتا ہے۔

گھر میں واقع ہوئی اموات کی خبریں مجھے اخبار میں شائع ہونے والے تعزیتی کالم کی مانند محسوس ہوتی تھیں۔ کن کٹے خرگوش کے بارے میں ضرور میں نے جب یہ سنا کہ وہ میرے گھر چھوڑنے کے

بعد سے ہی سست رہنے لگا تھا تو ذرا سا افسوس بھی ہوا مگر مجھے اس پر یقین بھی نہ تھا کیونکہ نسرین خالہ ہمیشہ جانوروں کے معاملات ذرا بڑھا چڑھا کر اور ڈرامائی انداز میں ہی بتاتی تھیں۔ نسرین خالہ کو ہمیشہ ہر جانور بخار میں مبتلا نظر آیا چاہے وہ بلّی، کتا، خرگوش ہو یا طوطا۔ کبوتر اور حد یہ کہ گائے بھینس اور گھوڑا بھی۔

معلوم ہوا کہ کن کٹا خرگوش گھر کے کچے آنگن میں ہی گڈھا کھود کر گاڑ دیا گیا ہے۔

مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ جو کچھ بھولا ہوا محسوس ہوتا ہے یا جسے ہم بھول جاتے ہیں، وہ ہمیشہ ہمارے جوتوں کے تلے میں چپکا رہتا ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ ہم اپنے جوتوں کی صفائی کرنے کب بیٹھیں گے۔

کم از کم اُن دنوں میں نے اپنے جوتوں کی تو کیا، پیروں کی صفائی کی طرف بھی دھیان دینا بند کر دیا تھا۔

پھر گرمیوں کی چھٹیاں آئیں۔ میں گھر واپس آیا، تقریباً ایک ماہ کے لیے اور بہت اُکتایا اُکتایا سا رہا۔ ایک تو ہر وقت گھر میں جلے ہوئے کھانے کی بُو آتی رہتی اور دوسرے، گھر کے افراد میری دانست میں تو بہرے ہی ہو چکے تھے اور سوائے باورچی خانے کے اندر یا اُس کے دروازے پر بے وجہ کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے بحثیں کرنے یا لڑنے جھگڑنے کے سوا اُن کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ ان بحثوں اور لڑائی جھگڑوں میں، اب عورتیں ہی نہیں مرد بھی شامل تھے جن کی توجہ کا واحد مرکز کھانا کھانا اور باورچی خانہ ہی بن گیا تھا۔ بوڑھی اور کھانے سے تھکی ہوئی زبانوں میں ذائقے کا کوئی خلیہ زندہ نہ بچا تھا۔ زبانیں سُن ہو چکی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب باورچی خانے سے نمک کے ڈبّے بہت جلدی جلدی ختم ہونے لگے۔ اپنی عمر تک پہنچتے ہوئے ان لوگوں کو سوائے نمک مرچ کے کسی دوسری شے میں کوئی ذائقہ نہ محسوس ہوتا تھا۔ ان کے لیے اب دنیا میں اگر کوئی واحد نعمت بچی تھی تو وہ سرخ لال مرچ تھی۔

باورچی خانے میں نمک مرچ کے مسئلے کو لے کر خوفناک جھگڑے ہوتے۔ نسبتاً کم عمر افراد نمک مرچ کو اعتدال کے ساتھ کھانا چاہتے تھے جبکہ بزرگ لوگ مرچوں کے پورے پورے ڈبّے ہانڈی

میں خالی کر دینے کے چکر میں تھے۔ جھگڑے کبھی کبھی اِتنے بڑھ جاتے کہ یہ غصہ ور لوگ ایک دوسرے کی آنکھوں میں ہی مرچیں جھونکنے کے درپے ہو جاتے تھے۔ یہ بڑا بھیانک زمانہ تھا۔ بڑا بھیانک۔

جو زیادہ بوڑھے ہو گئے تھے اُن کے دانت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے لگے۔ زمین پر دانت نظر آتے، نالیوں میں دانت نظر آتے۔ جھوٹے برتنوں میں دانت نظر آتے۔ کھتئی اور بے جان دانت، ان دانتوں میں اتنی خلا تھی کہ گرم مسالے وہاں پھنسنے لگے۔ جب وہ انگلیوں سے منجن کرتے تو رات کے کھائے ہوئے کھانوں سے، کالی مرچیں، زیرہ، لونگیں اور سرخ مرچوں کے بیج نکل نکل کر نالی میں اکٹھا ہو جاتے۔ وہ زور زور سے کلّی کرتے رہتے مگر اُن کا منھ کبھی پوری طرح صاف نہیں ہو پاتا۔

کھانا کھانے میں بھی اب اُن کا منھ دوسرے ہی انداز میں چلتا۔ یہ جوانی میں چلنے والا منھ نہ تھا۔ یہ اب ایک ناخوشگوار، تکلیف دہ مگر بدنیتی سے بھرا ہوا عمل تھا۔ اور کسی حد تک مضحکہ خیز بھی۔ اُن کے گال اس طرح پھولتے اور پچکتے اور حلق سے ایسی آوازیں نکلتیں جیسے وہ کوئی بھولا ہوا راگ الاپنے کی ناکام اور قابلِ رحم قسم کی حرکتیں کر رہے ہوں۔

پھر ہوا یہ کہ ایک بھری دوپہر میں، اچانک ایک رکشہ گھر کے دروازے پر آکر رُکا۔ جون کا مہینہ، لو کے جھکّو اور ایک عورت اور ایک مرد۔ مجھے یہ منظر اس طرح یاد ہے جیسے سفید کاغذ پر چاقو سے لکیر کھینچ دی گئی ہو۔ جہاں یاد اور تکلیف، یادداشت اور خراش ایک دوسرے کے مترادف الفاظ بن جاتے ہیں۔

عورت نے جب اپنا کالا برقعہ اُتارا تو میں نے اُنھیں کوشش کرتے ہوئے پہچان لیا، ہاں یقیناً مجھے کوشش کرنی پڑی تھی۔

وہ انجم باجی تھیں، مگر بہت موٹی ہو گئی تھیں۔ گول مٹول جس کی وجہ سے اُن کا قد بھی ٹھگنا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اوپر سے نیچے تک بیش قیمت اور جاہلانہ حد تک بھاری زیورات سے لدی ہوئی تھیں۔ زیوروں کے اس بوجھ کے نیچے دب کر شاید وہ جھک جھک کر چل رہی تھیں۔

وہ دو سال بعد دوبئی سے آئی تھیں۔ اُن کا شوہر مجھے ایک احمق سا مگر اپنی امارت اور دولت پر خاصی شیخی بگھارنے والا آدمی نظر آیا۔ انجم باجی نے مجھے دیکھا، مسکرائیں۔

مگر اُن کی پوری شخصیت میں جو افسردگی اور پیلا پن تھا، وہ اب عنقا تھا۔ بلکہ اُن کی کھال اب لال رنگ کی نظر آتی تھی۔ اُن کے جسم میں شاید اب زیادہ خون تھا اور جسم میں زیادہ خون ہونا بھدّا ہے۔ (بھدّا تھا)

انجم باجی نے مجھے دیکھا اور مسکرائیں، مگر اس مسکراہٹ کے کوئی معنی نہ تھے۔ یہ ایک رسمی اور دنیادار قسم کی مسکراہٹ تھی۔ اُنہوں نے پوچھا، ''شہر میں اچھا لگتا ہے؟''

''ہاں۔''

''بی۔اے فائنل ہے؟''

''ہاں۔''

پھر اُنہوں نے میری طرف سے منھ پھیر لیا اور گھر کے دوسرے افراد سے باتیں کرنے لگیں۔

اگر کسی کو تقدیر کی ستم ظریفیوں پر یقین نہ ہو تو مجھے آکر دیکھے۔ اُسی دن نہیں بلکہ اُسی وقت انجم آپا بھی وہاں آگئیں۔ وہ دراصل انجم باجی کی آمد کا سن کر اُن سے ملنے آئی تھیں۔ لُو سے بھری وہ دوپہر، وہ جلتی ہوئی آگ کی لپٹ۔

آہ انجم آپا بھی اُسی طرح موٹی ہو گئیں۔ اُن کے تن پر بھی زیورات۔ اُن کے آگے پیچھے کئی چھوٹے بڑے بچے شور مچاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ انجم آپا کی توند بھی نکل آئی تھی جو اُن کے ہنسنے پر بار بار ہلتی تھی۔ تب انھوں نے میری طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہو گڈو میاں؟''

''ہاں۔''

''چودھویں کلاس میں ہو؟''

''ہاں۔''

پھر انجم آپا نے بھی میری طرف سے منھ پھیر لیا اور انجم باجی کو نہ جانے کیا کیا سنانے لگیں۔

لُو سے بھری اُس دوپہر میں، جب مہمانوں کے آگے شربت لاکر رکھا گیا تو میں خاموشی سے اُٹھ کر دالان میں طوطے کے پنجرے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

سنبل نے اپنے منہ سے ہری مرچ اُگل دی اور دیدے گھما گھما کر مجھے دیکھنے لگا۔

''سنبل، میرے کن کٹے خرگوش کی قبر کہاں ہے؟'' میں نے پنجرے کی تیلیوں پر ہونٹ رکھتے ہوئے پوچھا۔

طوطا بولا۔ ''گڈّو میاں آگئے.... گڈّو میاں آگئے....''

میرا دل زور زور سے رونے کو چاہا۔

شام کے وقت انجم باجی اور انجم آپا دونوں واپس اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ جاتے وقت اُنھوں نے مجھ سے صرف ایک دو رسمی سی باتیں کی تھیں۔

اور المیہ یہ تھا کہ وہ دونوں اس بات سے بے خبر اور یکسر انجان تھیں کہ ''میں'' نے کبھی اُن دونوں پر اتنے بڑے اور عظیم احسانات کیے تھے۔

اتنے بڑے بڑے احسان!

''اُف! اتنے بڑے بڑے دھبّے۔''

دو دو قتل — ایک نہیں دو دو قتل جن میں میرے دونوں ہاتھوں کی مرضی شامل تھی۔

مگر اُن دونوں کو کچھ نہیں معلوم۔

میں اُن دونوں کے لیے خاندان کا ایک معمولی جھینپو سا لڑکا تھا اور بس، اور اُن دونوں کی اپنی اپنی دنیائیں تھیں جن کا میری سیاہ اور زہریلی پُر اسرار دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جیسے اُڑن طشتری پر، بے مروّتی کے ساتھ بیٹھ کر، کسی دوسرے سیارے پر پہنچ گئی تھیں۔

اور میں اس کرۂ ارض، اس زمین اور اس مٹی میں تمام رات اس کاکروچ کو ڈھونڈھتا پھرا جو میرے اُن عظیم احسانوں کا گواہ تھا۔

کم بخت وہ کاکروچ بھی مجھے اُس دن نہ ملا اور سنبل بار بار مجھے یہ کہہ کہہ کر چڑاتا رہا کہ — ''گڈّو میاں آگئے.... گڈّو میاں آگئے....'' تھی نہ یہ ایک لرزہ خیز داستان!

کئی بار غصّے اور جھنجھلاہٹ میں میرا دل طوطے کی گردن مروڑ دینے کو چاہا۔ مگر یہ سب تب کی باتیں تھیں۔ اب تو مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ دراصل زندگی اتنی ہی سپاٹ شے کا نام ہے۔ یہ سب روزمرہ ہے۔ ماضی، حال، مستقبل سب ایک دوسرے کے اوپر لدے ہوئے ہیں۔ سب ایک دوسرے کے اوپر سواری کرتے ہیں۔ صرف کھانا کھانا اور پیٹ بھر کر کھانا ہی انسان کا نصب العین ہے۔ صرف اُس کی آنتیں ہی ہیں جو انسان کو ایک مسخ شدہ یا ٹوٹا پھوٹا وژن عطا کرتی ہیں۔

بس سارا چکر یہی ہے۔ کسی سے کوئی شکایت کیا کرے۔ شکایت کے معنی ہی کیا جب سب اپنی ناک میں کھانا ٹھونس کر، ہمہ وقت مباشرت کررہے ہوں تو اُنھیں کسی کے احسانوں کا کیا پتہ چلے گا۔ اور یہاں تو کسی کا سرے سے کوئی قصور ہی نہ تھا۔ بھلا مجھ سے کس نے کہا تھا کہ میں اُن کی خاطر قتل کرڈالوں۔

۸

اُس دن کے بعد میں نے انجم آپا اور انجم باجی دونوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ اب تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر کھپ گئیں؟ پھر کوئی تعلق باقی ہی نہ رہا۔ ہم تینوں ایسے سوکھے درخت بن گئے جہاں کبھی کوئی پانی ڈالنے نہ آیا۔

گرمیوں کی وہ اُداس اور تکلیف دہ چھٹیاں گزار کر میں واپس شہر آیا۔ بی۔ اے میں پھر ٹاپ کیا اور آسانی سے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔

قانون کی تعلیم حاصل کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہوتا جیسے ابھی اچانک، مجھے کہیں نہ کہیں سے مسائل کا حل مل جائے گا۔ مگر حل ملنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

یہ بھی مذہب، سائنس اور فلسفے کی طرح ہی تھا۔ جہاں بس کچھ لفظ ہوتے ہیں، پھر اُن لفظوں کی نمائندگی کرنے والی کچھ اشیا ہوتی ہیں اور پھر زندگی گزارنے کی ترکیبیں ہوتی ہیں۔ تاہم میں دل و جان سے قانون پڑھتا رہا۔ کوئی یقین کرے یا نہیں، مگر میں اپنا کیریئر بنانے کے لیے قانون نہیں پڑھ رہا تھا۔ میں نہ جج بننا چاہتا تھا، نہ وکیل۔ میں تو اُس راستے کی کھوج کر رہا تھا اور اُس راستے پر نصب سمتوں کے نشان سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، جس پر چل کر مجھے وکیل اور منصف دونوں مل سکتے تھے۔ اور وہ بڑی سی گوتھک طرز کی عمارت بھی، جسے عدالت کہتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ہمیشہ سے عدالت کے لفظ پر مجھے ایک وسیع و عریض، ویران اور گوتھک طرزِ تعمیر والی عمارت ہی یاد آتی رہی ہے۔

اگرچہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عدالت کھلے آسمان کے نیچے، ہواؤں میں بھی لگتی ہے۔

ایک دن — ستمبر کے مہینے میں بڑی تیز ہوا چلی، ایسی تیز ہوا میں تو آسمان کے بادل اُڑتے چلے

جاتے ہیں۔ برستے نہیں مگر یہ تیز ہوا ایک گزرے ہوئے وقت کے بادل کو پتہ نہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لے آئی تھی۔ شاید پاتال سے — میں نے غور سے دیکھا۔ آسمان پر بالکل وہی بادل تھا۔ ہلکا سرمئی اور بھورا ملا ہوا۔ وہ ہوا کے ساتھ اُڑ نہیں رہا تھا، وہ تو آسمان پر رُکا کھڑا تھا۔ ایک مہیب پہاڑ کے مانند یا پھر ایک گہرے کالے دریا کی طرح۔

میں نے اس بادل کو پہچان لیا۔ برسوں پہلے جب وہ بھیانک بارش ہوئی تھی۔ جب سیلاب آگیا تھا، جب اچھن دادی م۔ق۔م۔ق کا کاغذ نارنگی کے پیڑ میں باندھنے کے لیے گئی تھیں اور پھسل کر گری تھیں۔ جب اُن کے کولہے کی ہڈی ٹوٹی تھی — وہی اچھن دادی جو اُس بارش کے سبب ہمیشہ کے لیے صاحب فراش ہوگئی تھیں، جن کے جسم پر زخم ہوگئے تھے اور زخم میں کیڑے۔ تب یہی بادل تھا۔ بالکل یہی۔ جب مجھے رات میں عجیب خواب آتے تھے۔ جن خوابوں میں ہمیشہ مجھے ایک ایسی لڑکی ملتی تھی جس کی شکل یا تو کسی سے نہیں ملتی تھی، یا پھر سب سے۔ وہ خواب جو میرے وجود پر ہمیشہ ایک جھاڑو سی پھیر کر چلے جاتے تھے۔ ایک ایسی افسردہ جھاڑو جو کسی کے مرنے کے تین دن بعد ہی گھر میں دی جاتی ہے۔

میں ہوسٹل کی چھت پر چلا گیا۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ ہاں یہ وہی بادل تھا۔ یہ جب پہلی بار آیا تھا تو وہ بھیانک اور طویل بارش ہوئی تھی۔ وہی رنگ، وہی حجم، وہی کنارے، وہی دھواں دھواں سے زاویے۔ وہی روشنی کو مٹا کر رکھ دینے والا کینہ پن اور وہی سورج کو ڈھکتا ہوا موٹا، منحوس، یہ بڑا سا کالا پردہ۔

تو کیا اس سال پھر سیلاب آئے گا، کیا پھر ایسی ہی بارش ہوگی۔ وہ مہیب بادل خاص میرے سر پر ٹکا ہوا کھڑا تھا۔ اِتنی تیز ہوا میں بھی اُس کا کوئی ریشہ تک ادھر اُدھر نہ ہوا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

بارش شروع ہوگئی۔

شروع شروع میں سب خوش ہوئے۔ کالج میں لڑکے لڑکیاں بارش میں خوشی خوشی بھیگتے اور گرم گرم سموسے کھاتے پھرے۔ اخبارات اور ریڈیو میں مانسون کے طاقت ور ہونے کی خوش خبریاں آنے

لگیں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ستمبر میں کوئی مانسون نہیں آتا۔ ستمبر میں تو مانسون واپس جاتا ہے۔ ریڈیو ہوں یا اخبارات انھیں جھوٹ بولنا آتا ہے۔ اور ان کے جھوٹ بہت گہری معاشی اور زرعی پالیسی کے مدّنظر بولے جاتے ہیں۔

عام آدمی کو، اس کی خبر تک نہیں لگتی۔ عام آدمی کو کبھی یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ محکمہ موسمیات نام کے کسی خودمختار ادارہ کا وجود نہیں ہے۔

ہفتہ بھر بعد وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں تو ایک پرانی، پیلے پڑ گئے کاغذ والی دستاویز کی ایک عکسی نقل دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سیلاب آئے گا۔ اور یہ بھی کہ زلزلے کے جھٹکے بھی آئیں گے۔

وہی سب ہوا، بارش گرتی رہی، شہر پر، ندیوں پر اور گھروں پر اور انسانوں کی قسمت پر۔

میرے ہوٹل کی چھت ٹپکنے لگی۔ دور دور تک باڑھ کا پانی پھیل گیا اور آہستہ آہستہ رات میں بارش کی آواز اور ایک بار پھر، میرے لیے بچپن کی۔ وہی پرانی لوری بن گئی اور میں گہری نیند سونے لگا۔ نیند میں، ایک بار پھر وہی بھولے ہوئے خواب دیکھنے لگا۔ جو میرے دماغ کے بائیں حصے کی تاریک قدیم گہرائیوں سے نکل نکل کر باہر آ رہے تھے۔

باڑھ کے پانی میں کیا کیا بہہ رہا تھا اور ایک مکان بھی اس پانی میں بہتا چلا آتا تھا۔ اپنی بنیادوں کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے بازار کے مصروف ترین چوراہے کو چھوڑ کر، اپنی کائی لگی۔ دیواروں اور خستہ حال کواڑوں کے ساتھ۔ سینکڑوں میل اور سینکڑوں سال لمبا سفر طے کر کے وہ مکان اپنی ٹوٹی ہوئی برجیوں کے ساتھ اور اوپر بنے گول کمرے سمیت یہاں چلا آیا۔ اور خاص میرے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے کالے پانی میں ہچکولے مارتا ہوا ٹھہر گیا۔

مکان کے اندر چوڑیوں کی کھنک تھی۔ ایک نیلا دوپٹہ آنگن میں لہرا رہا تھا۔ باورچی خانے سے گرم گرم روٹیوں کی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اب کیا تھا، بس مجھے ایک چھلانگ لگانی تھی۔ ایک چوکھٹ پار کرنی تھی، مگر تب ہی میرے آس پاس کی ساری ہوا نیلی ہو گئی۔ یہ ایک بڑی ہوا تھی، اور پرانی ہوائیں واپس جا رہی تھیں۔ مجھے اکیلا، بے یار و مددگار چھوڑ کر۔

وہ فرش پر بیٹھی ہوئی، ایک پرات میں، میلے ردّی کاغذ اور لکڑی کا کھورا جلا رہی تھی۔ باہر بہت ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ پرات میں آگ روشن ہوئی تو میں اُس پر اپنے ہاتھ سینکنے لگا۔ میرے دانت سردی کے باعث کٹکٹا رہے تھے۔ میرے ہاتھ اُس ٹھنڈی برف جیسی روٹی سے ٹکرا رہے تھے جو وہ پرات میں میرے لیے سینک رہی تھی۔ میرے ہاتھ سے لگ کر وہ سفید روٹی، آدھی ٹوٹ کر پرات میں گر گئی اور آٹا بن کر جلنے لگی۔ مگر آدھی روٹی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ ایک آدھے کٹے ہوئے چاند کی مانند۔

وہ کچھ بولی نہیں صرف آدھا کٹا ہوا چاند میری طرف بڑھا دیا۔ روٹی پر اُس کی آنکھوں سے نکلا خون جم کر کالا ہو گیا تھا۔

میرے اوپر ایک ساتھ سردی، ذلّت اور دُکھ کے پتھر پڑنے لگے۔ میں پرات میں رکھی آگ کو گھور رہا تھا۔ میری آنکھوں کے ذلیل اور کمینے آنسو آگ میں گر رہے تھے۔ یہ آنسو جلتے تھے تو اُن میں سے نمک نہیں اُڑتا تھا۔ یہ آنسو، نمک تک سے خالی، حد درجے کے بے شرم اور ڈھیٹ تھے۔ ان سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ آگ ایک بڑی قربانی مانگتی تھی۔ دھواں کمرے میں بھرنے لگا، وہ بے اختیار کھانسنے لگی۔ کھانستے میں، فرش پر بیٹھی ہوئی اُس کی پرچھائیں دیواروں پر بھی پڑنے لگی۔ اُس نے وہ آدھا کٹا ہوا چاند، وہ آدھی سفید روٹی میرے سر پر رکھ دی۔ اور پھر دھواں دھواں سی ہو گئی۔ وہ مکان اب اپنی بنیادوں کو چھوڑ کر عدم میں گم ہونے کو چلا۔

آنکھ کھل جاتی، بارش کی آواز لگاتار سنائی دیتی رہتی۔ روز وہ لڑکی خواب میں آتی۔ وہ لڑکی کون تھی؟ یا وہ کون ہے؟

ہوا، بارش؟ سنّاٹا، جُرم، قتل، گناہ یا محبت؟ آخر وہ میری کون ہے؟

اس سے کیا غرض کہ وہ کون ہے مگر جب تک بارش ہوتی رہی وہ لگاتار مجھے نظر آتی رہی۔ کچھ نہ کچھ کھلاتے ہوئے، مگر اُداس، اکیلی اور شکایت سے بھری ہوئی۔

ان خوابوں سے، دل میں لگے بہت پرانے زخم یاد آ گئے۔ وہ زخم جو کب لگے تھے؟ اس کا بھی صحیح اندازہ مجھے نہیں۔

مگر وہ تھے۔

اور پرانے دُکھ اس طرح مل گئے کہ جب دل کو ٹٹولا تو وہ وہاں موجود تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے پتلون کی جیب میں کوئی پرانا کاغذ گڑی مڑی بنا ہوا مل جائے۔ یا برسوں پرانا سنیما کا ٹکٹ، یا ریل یا بس کا ٹکٹ جس کے ہندسے مٹ چکے ہوں مگر وہ پھر بھی موجود ہو۔

پتلون کو سینکڑوں بار دھونے اور استری کرنے کے بعد بھی سوال یہ تھا کہ اب اِن دکھوں اور زخموں کا ہوگا کیا؟ سوال اِن کے ازالے کا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ ان کا مصرف اب کیا رہ گیا تھا۔ ان کے اندر کی ٹیس، پیپ اور سرخی تو دُھل کر غائب ہو چکی تھی۔ ٹکٹ کے نمبروں کی طرح۔

تو کیا بارش کے رُک جانے کے بعد، میں نے ان کاغذوں کو، ان دُھلی ہوئی دھجیوں کو نکال کر باہر پھینک دیا؟

نہیں بس مجھ سے یہی نہیں ہوا۔

ایک سعیٔ لاحاصل، ایک کارِ رائیگاں باقی رہا۔

ابھی تو خود پر شرمندہ ہونے کی یہ میری شروعات ہی تھی۔

بارش پندرہ دن کے بعد جا کر رُکی تھی اور مجھے چھوٹے ماموں کے خط سے معلوم ہوا کہ اس بارش میں وہاں دور، میرا گھر بہت بوسیدہ اور تقریباً کھنڈر سا بن گیا ہے۔ ہر چھت اور ہر دیوار کی حالت خستہ ہے اور یہ بھی کہ انہیں بارش کے دنوں میں، میرا طوطا بھی ایک دن مر گیا۔ وہ دالان میں آئی بارش کی جھاوٹ سے بھیگ گیا تھا۔ وہ اب بہت بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے پنجرے میں ایک بار زور زور سے پھڑپھڑایا پھر ختم ہو گیا۔ اب وہاں جاؤں گا تو کون کہے گا ''گڈو میاں آ گئے.... گڈو میاں آ گئے....''
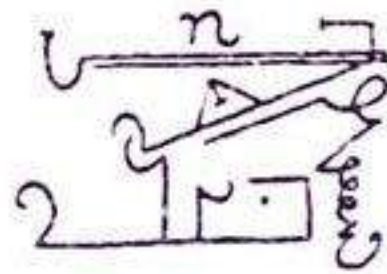
کیا میں کچھ بھول رہا ہوں؟

مجھے بار بار یہ احساس ہونے لگا ہے کہ دوسروں کی کہانیاں سناتے سناتے میں اپنی ہی کہانی بھولنے لگا ہوں۔ اب اس عمر میں یہ فطری ہے کہ میں کچھ نہ کچھ بھول جاؤں مگر مصیبت یہ ہے کہ جو بھی بھولوں گا، وہ بہت اہم ہوگا اور کیونکہ اب بڑھاپے میں یہ اپیل دائر کرنے کا چسکہ مجھے لگ گیا ہے، تو مجھے خدشہ یہ ہے کہ میری دماغی کمزوری کی وجہ سے بہت سی اہم باتیں میری عرض داشت میں درج ہونے سے رہ جائیں گی اور میں اپنی عدالت کو، ایک صحیح مقام پر اور اپنی سزا کو ایک صحیح وقت پر پانے میں ناکام رہوں گا۔

مگر یہ بھی ہے کہ دوسروں کی یہ کہانیاں ہی دراصل وہ ناقابلِ فہم دستخط شدہ مہریں ہیں جن کے ذریعے میری اس تحریر کو کوئی قانونی حیثیت مِل سکے حالانکہ نقلی دستخط اور نقلی مُہریں مہیا کر لینا مشکل کام نہیں۔ آپ ان عرض داشتوں میں آئے ہر کردار اور ہر نام کو جعلی مُہر سمجھنے میں بھی حق بجانب ہی کہے جائیں گے۔ مجھے اس سے، مگر کوئی صدمہ پہنچنے کا دُور دُور تک اندیشہ نہیں۔ کیوں؟

کیونکہ مجھے اب معلوم ہو گیا ہے کہ بڑی عدالتوں میں ساری لڑائیاں زبان کی ہوتی ہیں۔ انسان کے ''ہونے'' اور اُس کے وجود کی تمام حدود دراصل اُس کی زبان کی حدود ہوتی ہیں۔ (شاید وٹگنسٹائن نے کہا تھا)

اور پھر میری عدالت تو شاید ان بڑی عدالتوں سے بھی بڑی ہو—''تعزیراتِ ہند'' تو بہت زیادہ

میرے کام کا کبھی ثابت نہ ہو بھلے ہی۔ میں نے قانون کی پڑھائی میں اسے اور اُس کی تمام دفعات کو رٹ رٹ کر اپنی روح تک کے اندر اُتارنے کی کوشش کی تھی۔

تو میرے لیے بھولنا بہت خطرناک ہے۔ ورنہ میں اپنا قرض کبھی نہیں اُتار پاؤں گا۔ اس بڑی عدالت میں، ایک دوسری ہی زبان ہونے کا امکان مجھے پریشان کرتا رہتا ہے۔ اگر کچھ بھول گیا یا ٹھیک سے یاد نہ کر پایا یا پھر غلط تلفظ اور غلط صرف ونحو کے ساتھ کہا تو میں اپنا مقدمہ ہار جاؤں گا۔

اس لیے میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی کھوئی ہوئی یادداشت مانگ رہا ہوں۔ (بشرطیکہ میں کچھ بھول رہا ہوں تو!) کیونکہ ہاتھوں کی اپنی انفرادی شخصیت ہوتی ہے۔ ان کی اپنی فہم، اپنا ارادہ اور اپنا انفرادی جذبہ۔

جب ایک ہاتھ کسی کو قتل کرنے کے لیے چھرا اُٹھاتا ہے تو کوئی مائی کا لال یہ نہیں بتا سکتا کہ دوسرے ہاتھ کی مرضی کیا تھی؟ یا دوسرے ہاتھ کے اعصابی نظام نے اُسے قبول کیا تھا یا نہیں؟

اب ان ہاتھوں پر رگیں ہی رگیں اُبھر آئی ہیں۔ یہ کالے اور دُبلے ہو گئے ہیں۔ اتنے دُبلے کہ میری چین والی گھڑی بار بار بائیں ہاتھ کی کلائی سے پھسل کر ہتھیلی میں جا پھنستی ہے۔

مگر شاید یہ ہاتھ خاموش ہیں۔ بلکہ گونگے اور بہرے اب یہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔

تو بس — اب تو میرے دماغ کا کمزور بایاں حصہ ہے یا پھر میری بدنصیب، بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھیں، جہاں جو منظر بھی اُلٹا سیدھا قید ہے، میں اُس کو حقیقی یادداشت مان لیتا ہوں اور اپنی عرض داشت کو آگے بڑھاتا ہوں۔ تمام خدشات کے باوجود، مجبوری ہے۔ شرمندہ اس بات پر بھی ہوں کہ اپنی یادداشت کو میں نے کبھی معجزہ کہا تھا، اگرچہ اُس زمانے میں، میں گھر اور بچپن کی یادوں کو کبھی کبھی اس بے رحمی کے ساتھ بھلا دیا کرتا تھا۔ جیسے یہاں اس کاغذ کے حاشیوں کو میں قلم تراش چاقو سے کاٹ کاٹ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈالتا جاتا ہوں تاکہ اپیل کے کاغذات خوبصورتی اور سلیقے سے تراشے گئے محسوس ہوں۔

مگر پھر بھی، بچپن کے اُس آسیب نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اکثر میری روح کے اندر خطرے کا لال بلب جلنے لگتا۔ میں کتے کی طرح چوکنا ہو جاتا۔ میں کچھ سونگھنے لگتا جیسے کتے آسمانی بلاؤں کو منھ

اُٹھا کر دیکھتے ہیں اور پھر رونے لگتے ہیں۔

مجھے یاد ہے اُس دن ہوسٹل کے لڑکوں میں خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی کیونکہ رات کے کھانے میں چکن بریانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجھے چکن بریانی بالکل پسند نہیں۔ اس میں بساندھ آتی ہے۔ اس لیے پہلے ہی سے میرا موڈ خراب تھا، مگر شام سات بجے کے قریب جب میری ناک میں یخنی کی خوشبو آئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کے بعد مجھے اپنی سانس بھی پھولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سانس عجیب طرح سے پھول رہی تھی جیسے پھیپھڑے خوف زدہ ہو گئے ہوں۔

بہر حال ڈائننگ ہال میں رات کا کھانا بڑے جوش وخروش اور شور شرابے کے ساتھ کھایا گیا۔ میں نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ مجھے کچھ گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ تیزابیت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ میں دوستوں کے ساتھ ڈائننگ روم میں ہی بیٹھا تھا۔

اچانک برابر میں، گرلز ہوسٹل کی طرف سے ایک شور سنائی دیا۔ ہم باہر کی طرف دوڑے۔

گرلز ہوسٹل کے گیٹ پر ایک ایمبولینس کھڑی نظر آئی۔ ہوسٹل کے وارڈن افراتفری میں ادھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہاں لڑکیوں کی بھیڑ اکٹھا تھی۔

اور تب بس تھوڑی ہی دیر میں یہ معلوم ہو گیا کہ منورما کے کھانا کھاتے وقت، نوالہ گلے میں اٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پانی پی سکتی یا کچھ کر سکتی۔ اس کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی اور آناً فاناً اس کی سانس رُک گئی۔

میری پھولی ہوئی سانس اب قابو میں آ گئی۔ اب نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ چکن بریانی پکنے کا نتیجہ، اس لیے اب مجھے گھبراہٹ کیوں ہوتی؟ گھبراہٹ تو ہمیشہ کسی نادیدہ خطرے کے امکان کے باعث ہوا کرتی ہے۔

میں نے پیچھے مڑ کر ترپاٹھی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ پتّے کی طرح کانپ رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ یہاں سے نکل جانے کے لیے کوشاں ہے اور اس سے پہلے کہ میں اُس سے کچھ کہہ پاتا، وہ بھیڑ میں گم ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کیا آپ اس پر یقین کریں گے کہ وہ آج بھی میری نظروں سے اوجھل ہے۔ میں نے ترپاٹھی کو

پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میں ایل ایل بی کر رہا تھا اور وہ فلسفے میں ایم۔اے۔ مگر ہماری دوستی قائم تھی اور ہم روزانہ بہت سا وقت ایک ساتھ گزارتے تھے۔ مجھے کیا، پورے کالج کو معلوم تھا کہ ترپاٹھی کا منورما کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا۔ مگر بات یہاں تک پہنچ جائے گی اس کا کسی کو سان وگمان تک نہ ہوگا۔

اصل میں، ترپاٹھی کے والدین نے حال ہی میں اُس کی شادی طے کردی تھی اور اُدھر نہ جانے کیسے اور کب، منورما، ترپاٹھی کے بچّے کی ماں بننے والی تھی۔ منورما بھی فلسفے میں ایم۔اے کر رہی تھی اور مجھے ہمیشہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی نظر آئی۔ بہت چھوٹے قد کی، مگر بہت تیز اور غصہ ور۔

میں نے اُس زمانے میں کہیں پڑھا تھا کہ تیز اور غصہ ور لڑکیاں، محبت میں آکر جسم جلد ہی سونپ دیتی ہیں۔ جسم اُن کے لیے تھالی میں رکھے پان کی مانند ہوتا ہے اور گھر آئے مہمان کی خاطر کے لیے اور کچھ نہیں تو کم از کم پان تو پیش کرنا ہی چاہیے۔

پولیس کیس بنا، پھر دب گیا۔ ترپاٹھی کے والد ایک سیاسی لیڈر بھی تھے اور اُن کا اثر ورسوخ کا پوچھنا ہی کیا۔

منورما کی سہیلیاں بتاتی تھیں کہ نوالہ دوالہ کچھ نہیں اٹکا تھا، اس نے چکن کی ایک بوٹی میں سنکھیا رکھ کر نگل لی تھی۔

مگر افسوس کہ میرے سامنے ایک بار پھر سزا اور جزا کا مسئلہ بے وجہ ہی سامنے آ گیا تھا۔

اُس زمانے میں، ہم دو چار دوستوں کو راتوں میں شہر کی سڑکیں ناپنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ رات میں شہر بالکل دوسری ہی شے محسوس ہوتا تھا۔ اُس کے منظر، اُس کی آوازیں اور حتیٰ کہ چلنے والی ہوائیں بھی بدل جاتی تھیں۔

ہم رات کو میلوں پیدل چلتے، کہیں رُک کر چائے پیتے۔ سگریٹ سلگاتے، چائے کے چند ڈھابے رات بھر کھلے رہتے۔ کبھی کبھی ریلوے اسٹیشن یا بس اسٹینڈ کی طرف بھی نکل جاتے۔ پھر، صبح ہونے سے کچھ پہلے ہی ہوسٹل واپس لوٹتے اور وارڈن سے لائبریری میں بیٹھنے کا بہانہ کرتے۔ لائبریری رات بھر کھلی رہتی تھی۔

اُسی زمانے میں، ایک دن میں نے ایک گرافٹی آرٹسٹ کو دیکھا۔ وہ ایک فلائی اوور کے نیچے، ایک بالٹی اور برش ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ رات کے اندھیرے میں، وہ اندھیرے کا بنا اور تراشا ہوا ایک انسان بلکہ انسان کی ایک غصہ ور پینٹنگ نظر آتا تھا۔

وہ کون تھا؟

مگر اس سے پہلے اشفاق کو جاننا ضروری ہے۔

اُس کا نام اشفاق تھا۔

رات سے پہلے شام بھی تو آتی ہے۔ جب دونوں وقت ملتے ہیں۔ شام کا یہ لمحاتی منظر پُراسرار بھی ہوتا ہے اور اُداس معنی کے موہوم سے رنگ سے پُتا ہوا بھی۔

جب مغرب کی اذان ہوتی اور اذان کی آواز ہمیشہ مغرب کی جانب سے ہی آتی ہوئی محسوس ہوتی۔ کہرے کی چادر پھیلنے لگتی۔ انسان سایوں کی طرح چلتے پھرتے محسوس ہوتے۔ تب وہ کاندھے پر لکڑی کے ڈنڈوں سے بنی ایک سیڑھی اُٹھائے، ہاتھ میں مٹی کے تیل کی کالی چکنی پپیا لیے اور دوسرے ہاتھ میں میلا کپڑا اُٹھائے نمودار ہوتا۔ ہمارے گھر کے عقب میں، جو گلی کھیتوں کی طرف جاتی تھی۔ اور جس کے موڑ پر ایک آخری مکان تھا۔ اُس مکان کے بعد صرف کھنڈر نما گھروں، چند جھونپڑوں اور پھر کھیتوں کے ہرے بھرے سلسلے نظر آنے لگتے تھے۔ اُدھر نہ تو ہمارا کوئی رشتہ دار رہتا تھا اور نہ ہمارے دینی مسلک کا کوئی فرد۔

میں بچپن میں کبھی اُس گلی کے آخری مکان تک جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے، جب میں اُس مکان کے پار بھی گیا اور چڑیل کی پائل کی آواز سننے کی ناکام کوشش بھی کی۔ جو اُسی درخت پر رہتی تھی اور جس کے پاؤں اُلٹے تھے۔ پھر اسی درخت کے نیچے اُس کنویں میں بھی جھانکا جیسی میں مُردہ کتوں اور بلیوں کی لاشوں اور پنجروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

مگر اشفاق کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ جب بڑے ماموں مجھے گود میں لے کر مغرب کی اذان کے بعد اُس گلی میں آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب یہ یاد نہیں کہ مجھے تب سردی لگتی تھی یا نہیں مگر اشفاق کی چنگی کی خاکی وردی پر اکثر ایک خاکی مٹمیلا سویٹر بھی ہوتا۔ تو شاید میں نے یہ منظر

جاڑوں میں ہی دیکھا تھا۔

وہ سیڑھی لگا کر گلی کے پہلے کھمبے پر کھڑا ہو جاتا اور وہاں کیروسین لیمپ میں تیل ڈالتا۔ پھر لیمپ کی چمنی اُتار کر اُسے اُس کالے میلے کپڑے سے صاف کرتا۔ چمنی کو دوبارہ لیمپ پر فٹ کرتا اور ایک چھلاوے کی طرح سیڑھی سے نیچے اُتر آتا۔

بڑے ماموں نے اُس سے جان پہچان پیدا کر لی تھی۔ وہ اُس سے کچھ باتیں کرتے۔ پھر گلی روشن ہو جاتی۔ دور ایک ویران چھت کی منڈیروں کے پیچھے لال کپڑوں میں ایک لڑکی کا ہیولیٰ سا کانپتا ہوا نظر آتا۔ اُس کے بعد کیروسین لیمپ کے آگے کہرا اپنا دھندلا اور تاریک حالہ بنانے لگتا۔

جب ہم واپس لوٹتے تو اشفاق سیڑھی کاندھے پر اُٹھائے گلی کے آخری موڑ کی طرف جاتا نظر آتا۔ لال کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی اب سلسلے سے ملے ہوئے مکانوں کی کسی دوسری منڈیر پر نظر آتی۔ بڑے ماموں اُس کی طرف سر اُٹھا کر دیکھتے۔ مجھے لگتا جیسے دونوں نے آپس میں کچھ کہا ہو مگر بے تحاشہ گرتا ہوا کہرا، اور اچانک چل نکلنے والی سائیں سائیں کرتی ہوا، اور ایک مونگ پھلی والے کا جھولی لٹکائے اُدھر سے گزرنا۔ افسوس میں ان منظروں کے خاموش شور میں کچھ سن نہ پاتا۔

یہی وہ گلی تھی جس کے کسی درمیانی مکان کے اندر انڈوئے کا پیڑ تھا۔ بڑے ماموں ایک بار، وہیں سے تو مجھے گود میں لے کر میرے ہاتھ کی موچ کے لیے، انڈوئے کا پتہ لے کر آئے تھے۔ اب مجھے یہ مبہم سا احساس ہوتا ہے کہ اس گھر کی تاریکی، ویرانی اور خاموشی سے بڑے ماموں کا کوئی پُراسرار رشتہ تھا ضرور۔

اس بڑے شہر کی شامیں بہت رونق افزا ہوتی ہیں۔ ہر طرف نیون لائٹوں کے سلسلے ہی سلسلے ہیں جو رات بھر شہر کو روشن رکھتے ہیں۔ فلائی اووروں کے نیچے بھی روشنیاں ہی روشنیاں ہیں۔

مگر انسان کا مقدر اتنا روشن نہیں۔ کبھی کبھی تو انسان ایک کولتار جیسے اندھیرے سے باہر نکل کر آتا ہے۔ رات کے ویرانے میں کوئی بدنصیب، مصور جو آدھی رات کو سیڑھی لگا کر، اس بڑے شہر کے فلائی اووروں کی ڈھال اور دیواروں پر پینٹنگس بناتا ہے اور نعرے لکھتا ہے۔ وہ ایک سیاہ آلۂ موسیقی کو اس روشن دیوار پر زور سے مارتا ہے۔ وہ ایک کالے برش کو کالے رنگ میں ڈبو کر سفید دیوار پر کچھ اشکال

بنا تا ہے۔ وہ اپنے پھیپھڑوں کے اندر سمائی تمام سیاہی کو ایک چیخ کی طرح گا تا ہے۔ ایک سیاہ گیت جس کے سُر تال، فلائی اوورں کی دیواروں کے نیچے سے ایک بھوتانہ ہوا کی طرح نکل جاتے ہیں۔

یہ آرٹسٹ، گرافٹی کا یہ آرٹسٹ، اندھیرے سے نکلا یہ آرٹسٹ آج کا ''اشفاق'' ہے۔ وہ اس روشن شہر کو کالا کر دینے کے لیے دوبارہ پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ یہی انصاف ہے اور یہی احتجاج اور یہی اُس کے فرائضِ منصبی میں شامل ایک عین اخلاقی فرض۔

روشنیاں شہر کو بے رحم بناتی ہیں۔ اتنی صفائی، اتنی چمک دمک غیر انسانی ہے۔ اب سیڑھی، مٹی کے تیل کے لیمپ روشن کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اس عیاش، بدنیت اور بے رحم شہر کو کالا کر دینے کے کام آئے گی۔

جہاں تک میرا سوال ہے مجھے یہ علم ہے کہ ہر شہر کی طرح یہ شہر بھی ایک جنگل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ جنگل جہاں پانی کا ایک گڈھا بھی ہے۔ کبھی خندق رہی ہوگی۔ ہر گڈھے کے اس پار، اُس پار، کبھی نہ کبھی کوئی جنگ ہوئی ہوگی۔ آگ لگی ہوگی۔ اور کچھ شیطانی انسان جیتنے والی فوج کے بہت پیچھے پیچھے چلے ہوں گے۔ اُن کا تعاقب کرتے ہوئے تاکہ بعد میں لاشوں کے ڈھیر کی تلاشی لے سکیں۔ لاشوں کو ننگا کر سکیں۔ چوری کر سکیں۔

ہمیشہ سے یہی تو ہوتا آیا ہے۔ جوانمردوں، بہادروں، بے جگروں اور شہیدوں کے پیچھے لُچوں پُراسرار کمینوں، اور ہجڑوں کی ایک قوم پُراسرار انداز میں لگ جاتی ہے۔ پھر اسی قوم کی لوٹی ہوئی دولت سے شہر عیاش بنتے ہیں۔ سیاست پیدا ہوتی ہے۔ لیڈری ہوتی ہے۔ بار، مال اور نائٹ کلب کھلتے ہیں۔ تب شہر غیر انسانی طور سے اور بے رحم اور بے حس انداز میں خوبصورت ہونے لگتے ہیں۔ عورتوں کے کولہوں پر چربی کی تہیں ایسے شہروں کے فلائی اوورں کے نیچے پھینکے گئے مادہ منویہ سے بنتی ہیں۔ ان فاحشہ عورتوں کے ہونٹ اور منہ اپنے آپ اس انداز میں ہمہ وقت کھلے رہتے ہیں۔ جیسے وہ نامرد کے عضوِ تناسل کو چوسنے کے لیے تیار ہیں۔

تب نامردوں کے جتھے، اس شہر میں اپنے بیمار اور کمزور عضوِ تناسل لیے ہوئے مساج کیفوں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔

وہ نامرد، چوہئے! جو بہادروں اور ایمانداروں کی لاشوں کے کپڑے اُتارنے والی جماعت کے فرد ہیں۔ میں اس شہر میں ہمیشہ ہر جگہ ایک ایسا گڈھا محسوس کرتا ہوں جس کے اندر پانی کا سوتا اب سوکھ گیا ہے۔

مگر ہوشیار...! یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ یہ سب میں نے اُن دنوں زمانۂ طالب علمی میں، راتوں کو بھٹکتے ہوئے سوچا یا محسوس کیا تھا۔ یہ تو میں نے اب محسوس کیا ہے۔ اُن دنوں میں اس لائق نہ تھا، مگر اندھیرے سے نکلے اُس آرٹسٹ نے مجھے ایک بار پھر، نادیدہ جرائم اور نادیدہ سزاؤں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ قانون کو میں ہر وقت ہر شے اور ہر واقعے سے منسلک کر کے سمجھنا چاہتا تھا۔

یہ شہر بھی سزا بھگت رہا تھا؟

مگر میری سمجھ میں سزا کا وہ نظریہ آج تک نہیں آسکا۔ جس کے مطابق تمھیں سزا اس لیے نہیں دی جا رہی کہ تم نے بھیڑیں چرائیں ہیں بلکہ اس لیے کہ مستقبل میں کبھی بھیڑیں نہ چرائی جائیں!

مجرم تو قربانی کا بکرا تھا؟

اشفاق ایک منصف تھا، اندھیرے کی سزا روشنی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے شہروں کی گلیوں کو روشن کرتا تھا۔ اور یہ گرافٹی آرٹسٹ بھی منصف تھا۔ روشنی کی سزا اندھیرا تھی۔ وہ روشن کالے کولتار سے انصاف لکھتا تھا۔

پھر، آخر روشنی اور اندھیرے میں فرق کیا تھا؟

اور سزا اور جزا میں؟

۱۱
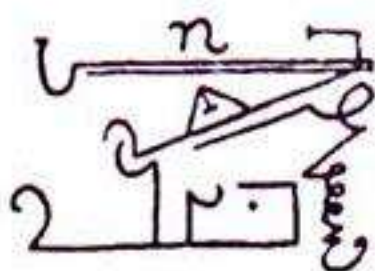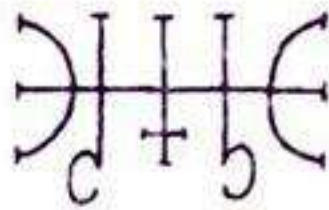
قانون کی کتابوں میں صرف تکنیک ہی تکنیک تھی۔ کبھی کبھی تو دفعات، ریاضی کے فارمولوں کی طرح نظر آنے لگتی تھیں۔ قدیم روم کے سخت آہنی قانون سے لے کر یوروپ کے جدید ترین ممالک میں بھی قانون کو کچھ اس زبان میں لکھا گیا ہے جسے کچھ لوگ تو سمجھ لیتے ہیں، بے حد آسانی کے ساتھ مگر ایک پوری خلقت ہے جو اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ پاتی۔

یہ کتنا مضحکہ خیز امر ہے کہ میڈیکل اور انجینئرنگ کی طرح قانون میں بھی ڈگری لینا پڑتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو شے انسان کے لیے اتنی فطری اور عام اور روزمرّہ کی ہے جیسے چھینکنا، دانت میں درد ہونا، رو دینا یا مسکرا دینا تو اتنی آسان شے کو اتنا غیرانسانی کیوں بنا دیا گیا۔ بھاری اور ثقیل اصطلاحات اور اُن کو منظم کرنے کے تصنع سے بھرپور، قانون کی یہ ضخیم ضخیم کتابیں!

میں نے کتنی راتیں جاگ جاگ کر، اُن کتابوں کو سمجھنے میں کاٹی ہیں مگر یقین کیجیے کہ سزا اور جزا اور عدل کسی کا بھی مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا یا مجھے یہ کہنے دیجیے کہ میں قانون کے ذریعہ اپنے وجود کے بنیادی سوالات کو حل کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں ہلکورے مارتی ہوئی دہشت، بے چینی اور ایک قسم کے غصّے کو سمجھنا چاہتا تھا— میں احساس جرم کی سطحی قسم کی نفسیاتی توجیہہ سے مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ میں مہاتما گاندھی کی کتاب ہند سوراج میں وکیلوں کے بارے میں کی گئی تنقید اور ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کا بھی قائل نہ تھا۔ ایسا معاشرہ جہاں کوئی جرم نہ تھا۔ یہ ایک بہت عامیانہ سا آدرش نظر آتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جرم، معاشرے کی نیو کی اینٹ ہے۔ بغیر کسی گناہ، اور بغیر کسی جرم کے کسی بھی معاشرے بلکہ نسل انسانی کی ہی تشکیل ناممکن ہے۔

جرم، معاشرے کی عمارت کی اینٹوں کی درزوں میں بھرے جانے والے سُرخی چونے کی طرح ہے اور یہ بے حد عام اور فطری سی بات ہے۔ جُرم کے حوالے سے لن ترانیاں اور ڈگریاں وغیرہ سب کبھی کبھی مجھے تضیع اوقات ہی نظر آتی تھیں۔

اس کا سب سے بڑا گواہ میرے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا؟ میں، جس نے شہد کی مکھیوں کے چھتے پر مٹی کا ڈھیلا مارا تھا۔ میں جس نے دو دو قتل کیے تھے۔

اور میں — حفیظ الدین بابر۔ اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ میرے اندر پائی جانے والی وہ پُراسرار بھیانک صلاحیت جس کے سبب میں کسی مخصوص کھانے کی خوشبو یا اُس کے پکنے کی خبر سن کر، اس وسیع وعریض کائنات میں، کہیں نہ کہیں کسی بڑے واقعے کے ہونے کو یقینی بنا سکتا ہوں!

مگر یہ سب میرے لیے واقعتاً اب اتنا عام اور معمولی سا نظر آتا ہے جیسے صبح کو اُٹھ کر کلّی کر لینا۔

یہی وجہ ہے کہ میں اپنی سزا، اپنی عدالت اور اپنے منصف کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانوں کے مقدر کا اُن کے عدل کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اگر قانون انسان کے مقدر کی تشریح نہیں کر سکتا تو سزائے موت یا عمر قید وغیرہ تو ایک طرح سے مضحکہ خیزیاں ہی بن جاتی ہیں۔ مگر وہ نادیدہ عدالت!

نہیں میں مذہبی آدمی نہیں اور ادھر آکر مارکس کو پوری طرح پڑھ لینے کے بعد تو، میں مذہبی پس منظر میں کوئی بات کر پانے کے اہل ہی نہیں رہا۔

یوں بھی اس اول جلول سی عرض داشت میں، قانونی طور پر مذہب کا کیا کام؟ میں جو اتنا بھٹک رہا ہوں اور بھٹکتا ہوا، طالب علمانہ جوش میں آکر قانون میں ڈگری بھی حاصل کر چکا ہوں۔ مگر شاید میری عدالت ان سب معلومات کے اندر نہیں بلکہ باورچی خانے کے کسی برتن میں چھپی ہوئی ہے۔

ایک کاکروچ کی طرح۔

قدیم یونانی فلسفے سے لے کر اب تک عدل وانصاف اور جرم وسزا پر کتنی بحثیں ہوئیں۔ کتنی گفتگو مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ابھی ساری دنیا اس بات پر اتفاق رائے نہیں رکھتی ہے کہ سزائے موت درست ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ سزا کا انتقامی نظریہ اگر ختم ہوگیا ہے تو سزا کا نظریۂ عبرت تو موجود ہے۔ جرم کو ایک بیماری سمجھنے والے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اولوالعزمی کے شکار ہیں اور سزا کے اخلاقی نظریئے کو ڈھنگ سے پیش کرنے میں ناکام ہیں۔

ویسے عدل کا مفہوم وہ احکام ہیں جو کوئی ریاست اپنے عوام پر صادر کرتی ہے۔ یعنی عدل ہمیشہ اُن لوگوں کے مفاد میں ہوتا ہے جو طاقت ور ہیں۔ اب منافقت میں تو کچھ بھی تاویل پیش کی جاسکتی ہے۔

سزائے موت سے کون سے عدل کا تقاضہ پورا ہوتا ہے۔ (انڈین پینل کوڈ، دفعہ 302، بار بار میرے کان میں کوئی کہتا ہے۔)

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب انگلستان میں جیب کاٹنے والے کی سزا موت تھی۔

قطع نظر اس کے کہ جیب کاٹنا = موت، الجبرے کی ایک بھیانک، بے تکی مگر لطیفہ آمیز مساوات نظر آتی ہے اور معاشرے کی ذہنی حالت پر رحم بھی آتا ہے۔ بقول آرتھر کوسلر کچھ جیب کترے وہیں لوگوں کی جیبیں کاٹ رہے ہوتے تھے، جہاں دوسرے جیب کتروں کو مجمع کے سامنے پھانسی دی جارہی ہوتی تھی۔

مگر کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ فطری ہوتا ہے، سب سے زیادہ اُلجھاوا بھی اُسی میں ہوتا ہے۔ قانون بظاہر کتنا ہی مشکل اور عام لوگوں کے لیئے ناقابل فہم محسوس ہوتا ہو مگر ہے ایک سادہ سی چیز ہی۔ ریاضی یا الجبرا یا جیومٹری کی نقل سی کرتی ہوئی جبکہ انسانی فطرت کو قانون تو بھلا کیا گرفت میں لے گا، بڑے بڑے فلسفے اور مذاہب بھی یہ کام نہ انجام دے پائے۔

بیکن نے اپنے مضمون میں بڑے پتے کی بات کی تھی۔ (مجھے یاد پڑتا ہے کہ کامیو اور بورخیس نے بھی بیکن کے اسی خیال کو دہرایا ہے۔)

بیکن نے کہا تھا کہ کوئی انسانی جذبہ اتنا زیادہ کمزور نہیں ہوتا کہ وہ موت سے ڈر جائے۔ انتقام، عزت، محبت، دُکھ وغیرہ سب موت کے ڈر کو وقتی طور پر مٹا کر رکھ دیتے ہیں۔

مجھ سے بہتر یہ کون جانے گا کہ زندگی کی کشمکش میں اکثر ایک جذبہ ایک آسیب یا پریت کی طرح دیگر جذبوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

اس لیے مجھے تو، چاہے منشور حقوقِ انسانی ہوں یا منشور حقوقِ اقوام دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اور دونوں ہی ناقص اور مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ وہ مکمل جمہوریت ہو، یا محدود جمہوریت، راست جمہوریت ہو یا بالواسطہ جمہوریت، پابند جمہوریت ہو یا سوشلزم اور کمیونزم ہی کیوں نہ ہوں، سزا اور عدل کا مسئلہ ہر جگہ اُسی طرح برقرار ہے جیسے کہ ابتدائے آفرینش میں تھا۔

ہر ملک اور ہر قوم کا قانون ایک الگ قسم کی اقلیدسی آرائش کے سوا کچھ نہیں۔

دوسری بات یہ کہ سزا ہی کبھی کبھی انعام بھی ثابت ہوتی ہے۔ میں جو یہ اپیلیں پر اپیلیں لکھے جا رہا ہوں۔ اور اپنی عدالت نیز اپنے مقدمے کی تلاش میں دیوانہ وار بھٹک رہا ہوں، کون جانے کہ میں اپنا انعام وصول کرنا چاہتا ہوں اور مجھے ایک موہوم سا احساس ہے کہ وہ مجھے غیر متوقع طور پر ملے گا بالکل اسی طرح کہ آپ اپنے گھر میں مسور جیسی غریب پرور دال کھانے بیٹھے ہوں اور محلے کے سامنے والے گھر سے کوئی ایک پیالہ پائے کے شوربے کا لے کر آجائے یا مٹی کی ہانڈی میں کوئی رساول ہی لیے چلا آئے۔

علاء الدین نے میرے ساتھ ہی ایل. ایل. بی میں داخلہ لیا تھا۔ اُس کا دماغ خوب چلتا تھا اور اُس کے ایک کامیاب وکیل بننے میں کوئی شک وشبہ ہی نہ تھا۔

علاء الدین میری ان باتوں کا مذاق اُڑاتا۔ وہ اکثر کہتا ''حفیظ! دفعات یاد کرو، بس دفعات اور نظریوں کو ہمیشہ کے لیے حفظ کرلو۔ اس کے علاوہ کسی چیز سے مطلب مت رکھو۔ وکالت ایک پیشہ ہے، فلسفہ نہیں۔''

میں اُس سے جھگڑنے بیٹھ جاتا اور سزا اور انعام کا فرق سمجھانے لگتا۔ علاء الدین کہتا۔۔۔

''انعام لذت پہنچاتا ہے جب کہ سزا تکلیف پہنچاتی ہے۔ سامنے کی بات ہے۔''

''نہیں ہمیشہ ضروری نہیں۔'' میں کہتا، مگر میری بات ادھوری ہی رہ جاتی۔ پھر بھی دل میں سوچتا رہتا کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو بھی تو سزا دے سکتا ہے اگر خارجی حکومت کو اُس کے جرم کا پتہ نہ چلے یا وہ غلطی سے اُسے سزا نہ دے سکے۔ جرم سے بری کر دے۔ ایسی صورت میں سزا انعام میں بدل جاتی ہے۔ اور مجھے تو ہر حال میں، ان دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک چیز چاہیے تھی کیونکہ انجم باجی اور انجم آپا دونوں نے میری حق تلفی کی تھی۔

میں قانون پڑھتا رہا بلکہ رٹتا رہا۔ اور اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا، مگر نہ تو میری سمجھ میں ارسطو کا اصلاحی عدل آسکا اور نہ سزا کا انسدادی نظریہ، نہ ہی نظریہ تلافی۔

ان کے علاوہ سزا کا مانع نظریہ اور رُوسو اور اسپنسر کے فطری نتائج اور سزا کا انتقامی نظریہ۔ یہ سب تو میرے ذہن کو پوری طرح پراگندہ کر گئے تھے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اگر میرے ذہن میں سزا، جزا اور عدل وانصاف کی یہ دھول نہیں چھٹی تو میں وکالت نہیں کر پاؤں گا۔

ڈاکٹری پڑھنے والا ایک طالب علم اگر کسی انسان کی روتی یا مسکراتی، روشن جھپکتی ہوئی آنکھ سے ہی واقف نہیں، تو اپنی تجربہ گاہ میں انسانی پنجر کی آنکھوں کے گڈھوں میں انگلیاں ڈال ڈال کر، وہ کچھ بھی ٹٹول لے، اُس کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا سوائے مریضوں کو احمق بنانے کے حق کے۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ میں بھلے ہی ناول نہیں لکھ سکتا، مگر اُسی طالب علمی کے زمانے میں، میں نے دنیا کے چند بہترین ناول پڑھے جو میرے موضوع سے مطابقت بھی رکھتے تھے۔۔ مثلاً دوستوئسکی کا جرم وسزا، ٹالسٹائی کا 'عروج ثانی' اور استاندال کا سرخ وسیاہ۔ اور چند دوسری کتابیں بھی۔ مگر ان ناولوں کی تمام تر عظمت کے باوجود، اِن میں جس طرح انسان کو اور انسانی صورت حال کو آفاقی بنا کر پیش کیا گیا تھا، اور خیر وشر کے فلسفے کو بے حد سہل پسندی کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا، اُس سے مجھے تشفی نہ ہوئی۔ دوسرے یہ کہ سزا اور جرم کے مسائل اور اُن کی ماہیت پر، ہر قسم کی گفتگو، ان ناولوں میں، آخر تک آتے آتے عیسائیت کے رنگ میں رنگ جاتی تھی۔ مجھے ان مذہبی تاویلات سے دلچسپی نہیں تھی مگر یہ سب دنیا کے عظیم ناول ہیں۔ آپ ان میں فلابیر کا مادام بوواری بھی شامل کر لیں۔

اب رہا سوال کافکا کا۔ اُس کے یہاں بھی یہی مسائل شروع سے لے کر آخر تک موجود ہیں، مگر وہ بطور ایک ناول نگار اپنی تمام عظمت کے باوجود، ان معاملات میں، مجھ سے بھی زیادہ کنفیوژ اور اُلجھا اُلجھا نظر آیا۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ سزا کی عامیانہ نفسیاتی توجیہہ۔ میری روح کے مطالبے کو ہرگز پورا نہیں کرسکتی تھی، ورنہ میں منٹو کا ایک افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' پڑھ کر ہی سوٗر کی طرح پھول جاتا۔ فرائیڈ کی یک رُخی ذہانت نے ادب میں بعض مقامات پر بڑی گڑبڑ پھیلائی ہے۔

نہیں، نہیں! میں ادب پر تبصرہ کرنے کا اہل نہیں۔ کاش کہ میں ادب تخلیق کرسکتا۔

اب بس ایک بات رہ گئی ہے جو سزا اور جرم سے متعلق اکثر میرے ذہن میں آتی رہتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کی پیدائش ایک سزا ہے اور جس جرم کی یہ سزا ہے وہ جرم عورت اور مرد کی آپسی محبت اور پھر مباشرت ہے۔ مگر مباشرت کرنے کے لیے انسانوں کا ہونا ضروری ہے یعنی عورت اور مرد کی پیدائش ضروری ہے۔ تو پھر اصل جرم کیا ہے؟ اور اصل سزا کیا ہے؟ بدّھا کے مطابق خواہش؟

جنم لینے کی خواہش، یا گناہِ اوّل یا ہبوطِ آدم؟؟

بس یہی تو گڑبڑ ہے، آ گیا مذہب بیچ میں اور مذہبی تاویلیں اور مذہبی قصے۔

خیر یہ سب تو چین کی نیند سونے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

مگر میں چین سے نہیں سونا چاہتا۔ آج بھی نہیں اور تب بھی نہیں جب میں یہاں قانونی لطیفوں پر ہنستا مسکراتا رہتا تھا اور اُدھر، دور میرے چھوٹے سے شہر میں، میرا گھر روز بروز خستہ حال ہوتا جاتا تھا اور اکثر کسی نہ کسی کی موت کی خبر آتی رہتی تھی۔ جس سے پہلے کسی کھانے کے پکنے پر میرا اعصابی نظام اکڑ کر مجھے خبردار کر دیتا تھا اور میں ایک ناقابلِ فہم، بے تکے اور بے وجہ قسم کے احساس جرم سے چُور چُور ہو جایا کرتا تھا۔ تب قانون کی کتاب نہیں بلکہ میرے اندر کوئی شے مجھے یہ بتاتی بلکہ سمجھاتی کہ جرم اور سزا دونوں جڑواں ہیں۔ ایک دوسرے کے کلون (Clone) یا پھر سزا جرم کی پرچھائیں ہے۔ وہ جرم کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ سزا دنیا میں پیدا ہونے کی ازلی خواہش کی شکار ہے۔ وہ جرم کے پیٹ میں اپنا نطفہ داخل کرتی ہے۔ جرم محض ایک وسیلہ ہے سزا پیدا کرنے کا۔ مگر یاد رہے کہ سزا جرم کے پیٹ میں پلنے والا نطفۂ حرام ہے۔ اس لیے آگے چل کر جرم یا گناہ کو، اسے چھپ کر دودھ پلانا

پڑتا ہے۔ جرم اور گناہ کے اندھیرے سزا کو روشن کرتے ہیں۔ پھر ایک عدالت لگتی ہے جہاں انصاف ہوتا ہے اور کسی بے چارے اور بدنصیب انسان کو سزا دے دی جاتی ہے۔

انسان — بے چارہ انسان جو اپنی ذات میں نہ جرم تھا نہ گناہ اور نہ ہی سزا۔ انسان جو اپنے مقدر کا مارا ہوا ہے۔ نفرت اور محبت کا مارا ہوا ہے۔ انتقام اور دکھ کی خراشوں سے جس کی روح لہولہان ہے — وہ انسان اپنی سزا کو اپنے کاندھے پر اُٹھائے — دور تاریکی میں چلنے لگتا ہے۔ پھر بھی یہی سزا اُسے انعام محسوس ہوتی ہے۔ پھر موت زندگی، اور نفرت محبت۔

سارے متضاد الفاظ ایک دوسرے کے مترادف بن جاتے ہیں۔

میری یہ اپیل، یہ عرض داشت کیا وہاں تک پہنچے گی بھی یا نہیں جہاں ایک خاموش عدالت لگی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ وہ عدالت ایک گہری، اندھیری گپھا میں لگتی ہے۔ اگر میں بھٹکا نہیں تو کاغذوں کا یہ پلندہ لیے اُس گپھا تک پہنچ جاؤں گا مگر اس سے پہلے مجھے اپنی یادداشت کے پھوڑے میں سے پس، اور مواد کی ایک ایک بوند کو دبا دبا کر باہر نکالنا ہوگا۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔
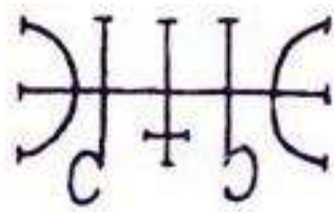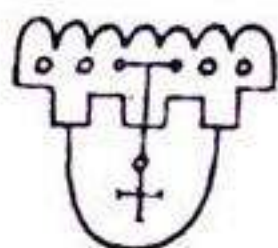
ڈیڑھ سال اور گزر گیا۔ میں ایل۔ایل۔ بی۔ میں بہت خراب نمبروں سے پاس ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں دفعات کے نمبر بھول جایا کرتا تھا۔ عدد یا ہندسوں کو کسی تھیوری میں تبدیل کر دینا یا کسی اُصول یا دفع میں بدل دینا مجھے ہمیشہ غیر فطری اور بچکانہ پن ہی محسوس ہوتا رہا ہے۔ جو چیزیں انسان کے جذباتی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں اُن کو ہندسوں کے ایک بے معنی ربط میں تبدیل کر دینا کہاں تک جائز تھا؟ میں نے ان دفعات کے نمبروں کو پوری رات رٹ رٹ کر یاد کیا مگر امتحان کا پرچہ حل کرتے وقت سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ دفعہ 320، 304 میں بدل جاتی تھی اور دفع 415 دفعہ 420 میں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن، بہر حال مجھے وکالت کی ڈگری تو ہر حال میں حاصل کرنی ہی تھی۔ اس لیے میں مجبوراً رٹتا رٹتا رہا اور اُن دنوں مجھے اپنے مرے ہوئے طوطے کی یاد بھی بہت ستاتی رہی۔ وہ آج اگر میرے ساتھ ہوتا تو میں اُسے یہ ساری دفعات رٹا دیتا اور پھر امتحان گاہ میں بلکہ عدالت میں بھی اُسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ عدالت میں بحث میں کرتا اور طوطا مجھے دفعات کے صحیح نمبر یاد دلاتا رہتا۔

ہوسٹل میں آدھی رات گئے، کمرے میں میرے احباب اکٹھا ہو جاتے۔ اُن میں علاء الدین بھی تھا جس نے ایل بی کے پہلے سال میں ٹاپ کیا تھا۔ ہم سب احمق قسم کے لوگ تھے جو محض اپنی چرب زبانی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے بے وجہ فضول سی بحثیں کیا کرتے۔ راجندر کمار مصرا کو ہمیشہ کھانے پر گفتگو کرنے میں ہی مزہ آتا تھا۔ وہ ہوسٹل لاؤنج میں رکھے ٹی۔وی پر کوکری شو بھی بے حد دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔

''یار سوال یہ ہے کہ انسان کی زبان ہر اجنبی ذائقے کو محسوس ہی کیوں کر لیتی ہے؟'' ایک دن

اُس نے بحث چھیڑی تھی۔ میں کھانوں کا ذکر آتے ہی گھبرا جایا کرتا تھا کیونکہ ان کمبخت کھانوں کے ساتھ ہی میری زندگی کے المیے کا اسٹیج لگا ہوا تھا۔ جس کی باگ ڈور میری منحوس روح میں پوشیدہ وہ کالی صلاحیت تھی جس کے بارے میں لکھتے لکھتے اب میں بھی تھک چکا ہوں۔

''اور جب جدید سائنس یہ ثابت کر چکی کہ ہر ذائقے کے لیے زبان میں مخصوص خلیے ہوتے ہیں تو پھر لاتعداد کھانوں کے لاتعداد ذائقے کیا پہلے ہی سے زبان میں موجود ہوتے ہیں؟ یا یہ جو نئے کھانے ایجاد کیے جا رہے ہیں اُن کے ردِ عمل کے طور پر زبان اُن کے لیے اپنے اندر محسوساتی خلیے پیدا کر رہی ہے؟'' کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر انیل نے سکوت توڑا۔

''میرا خیال ہے کہ ذائقے تو بنیادی طور پر تین ہی ہیں یعنی کھٹا، میٹھا اور کڑوا (نمکین کو بھی کڑوے میں ہی شامل کر لیجیے) باقی سب تو ان تین ذائقوں کے شیڈس ہیں جس طرح رنگوں میں ہوتے ہیں۔ اور جس طرح بعض لوگ کلر بلائینڈ ہوتے ہیں اُسی طرح بہت سے لوگ ٹیسٹ بلائنڈ بھی ہوا کرتے ہیں۔ اُنھیں کچھ بھی کھلا دو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ کھٹے اور میٹھے کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔''

''رنگوں سے مقابلہ مت کرو۔ سارے رنگ سورج کی روشنی میں پوشیدہ ہیں اور...'' راجندر آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انیل نے فوراً اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اے اتنی سائنس میں نے بھی پڑھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس طرح سارے رنگ سورج کی روشنی میں موجود ہیں کیا اُسی طرح ذائقوں کا بھی کوئی منبع ہے؟''

''ہاں ہے--!'' میں نے کہا۔

انیل نے بیڑی سلگائی۔

''انسان کے جسم بلکہ اُس کی روح میں پوشیدہ تشدد آمیز چٹور پن۔''

''دیکھا...دیکھا...ہوہو...ہوہو'' علاء الدین بھدے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

''ان صاحبزادے کو تو کوانٹم چھلانگ لگانے کی عادت ہے۔ یہ سائنسی مسائل کو فوراً فلسفے کی سطح پر لے آتے ہیں۔''

''تم جاہل ہو علاء الدین۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ ''اس میں کون سا فلسفہ ہے۔ ہاں! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں سائنس کا رُخ انسانی مسائل کی طرف مڑتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا صاحب! ہم جاہل ہی سہی مگر یہ جو کل آپ مربھکوں کی طرح پلاؤ پر ہاتھ صاف کر رہے تھے اور مرغ کی ہڈیاں چچوڑ رہے تھے، تب آپ کو انسان کے چٹورپن کا کوئی خیال نہیں آیا؟ ہو ہو..... ہو ہو...!''

''ہاں ہاں، میں زہر مار کر رہا تھا مگر تمھیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پلاؤ نہیں بریانی تھی۔ مجھے پلاؤ سے سخت نفرت ہے۔''

''بریانی اور پلاؤ میں بھلا کیا فرق ہے؟ ہو ہو...... ہو ہو...!''

''شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' پڑھ لو۔ معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

''شرر کو میں فراڈ سمجھتا ہوں۔ اُس کے تاریخی ناول ٹھیک ٹھاک ہیں مگر یہ کتاب تو دراصل لطیفوں کا مجموعہ ہے اور جس سے یہ بھی نہیں ظاہر ہوتا کہ لکھنؤ کی تعریف کی جا رہی ہے یا اُس کے زوال آمیز معاشرے کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔'' مقیم علی بہت دیر سے چپ تھا۔ اب اُس نے زبان کھولی۔ میں مقیم علی سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ بھی پلاؤ اور بریانی کے مسئلے پر۔ مقیم علی سنجیدہ نوجوان تھا اور ناپ تول کر بات کرتا تھا۔

مگر اب تو کھانے کا ذکر چل نکلا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہونے والا تھا۔

اور یہی ہوا۔ راجندر کمار مصرا تقریباً جوش میں کرسی سے اُٹھ کر ہی کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے کے انداز میں کہنے لگا۔ ''سنئے، غور سے سنئے۔ ہپوکریٹس نے کہا تھا کہ کھانا۔ میرا مطلب بھوجن ہی اصل دوا ہے اور رسوئی ہی اصل مطب۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کھانا کس شے یا کس بیماری کی دوا ہے؟''

''زندگی کی دوا؟

یا موت کی دوا؟

دنیا کی؟

یا پھر جب دیوتا بیمار ہو جاتے ہیں۔''

سب نے راجندر کی باتوں پر زور سے قہقہہ لگایا جس میں میں شامل نہ ہوسکا۔

''اور — اور ہم ہندوؤں کے یہاں یہ بے وجہ ہی نہیں مانا جاتا کہ گوشت کھانے سے شیطانی طاقتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راکشسوں کا کھانا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں گائے کی قربانی کا ذکر بھی آیا ہے مگر یہ قربانی یہاں گوشت نہیں بلکہ گھی اور دودھ کا ایک مجموعہ ہے۔ ایک پاکیزہ ترین کھانا...'' راجندر اپنی تقریر جاری رکھتا اگر فوراً ہی کرسی سے اُٹھ کر اسلام صابری نہ کھڑا ہو جاتا۔ اسلام صابری بہت ہی کٹر قسم کا مسلمان تھا۔ وہ جمال الدین افغانی کو اپنا آئیڈیل تسلیم کرتا تھا۔

''خاموش رہو — یہ کیا پاک اور ناپاک کھانے کی بکواس لگا رکھی ہے۔ قانون جیسا مضمون پڑھ کر اتنا غیر منطقی اور بد اعتقادیوں سے بھرا ہوا ذہن....'' اسلام صابری زور سے گرجا۔ ''سارے اعلیٰ کھانے ہمارے ہیں۔ تم لوگ جن پر جان دیتے ہو کیا تمھیں علم ہے کہ سموسے کا اصل نام ''قطب'' ہے۔ یہ دراصل سنبوسہ ہے اور ایران سے مسلمان اسے یہاں لائے۔ یخنی، کباب، دو پیازہ، دم پخت، نان، چپاتی، پھلکا اور خشکہ سب ترکی سے ہندوستان آئے۔ روٹی اور پوری بھی وسطی ایشیا سے ہی یہاں آئے اور یہاں تک کہ کھچڑی بھی مغلیہ کھانا ہے اور ہمایوں سے پہلے تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کھانا تو صرف مسلمان پکانا اور ایجاد کرنا جانتے ہیں۔ یہ اُن کے خون میں شامل ہے۔''

اسلام صابری جوش میں کچھ دیر کانپتا رہا پھر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ اس بحث میں قوموں اور تہذیبوں کو مت گھسیٹو ورنہ Clashes of Foods، کھانوں کا تصادم کا بھی اعلان ہو جائے گا۔ جو شاید کرۂ ارض کی آخری فیصلہ کن جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔'' مقیم علی نے بہت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

مگر اس بار انیل سنگھ نے دوبارہ بیڑی سلگائی۔ جب بھی وہ بیڑی سلگاتا تھا اُسے کچھ نہ کچھ کہنا ضرور ہوتا تھا۔ اُس نے بیڑی کا ایک لمبا کش کھینچا۔ منھ اور ناک سے تھوڑا دھواں باہر نکالا۔ آہستہ سے کھانسا، پھر کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''نہیں، میں اسلام صابری کی بات کا جواب ضرور دوں گا۔ یہ

جو اپنے چند کھانوں کی فہرست رٹ کر، تم نے یہاں سنائی ہے تو میں اُس سے چوگنی لمبی فہرست پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ مگر ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمھارے یا کسی کے بھی ان کھانوں کی اہمیت بغیر مسالوں کے کیا رہ جاتی ہے۔ اور مسالے ہمارے بھارت کی شان ہیں۔ یہ صرف ذائقہ ہی نہیں بڑھاتے بلکہ بیماریوں سے بھی بچاتے ہیں۔ کالی مرچ، لال مرچ، سونف، ہینگ، زیرہ، اجوائن، جاوتری، تیز پات، ادرک، ہلدی، دھنیہ، دارچینی اور جائفل۔ ہیروں اور موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی تھے۔ عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے روم اور یونان کے سوداگر بھارت آکر ہیرے موتی اور لعل و جواہرات دے کر یہاں سے مسالے لے جایا کرتے تھے۔ یہی حال عرب اور ایران سے آئے ہوئے سوداگروں کا تھا۔ کالی مرچ کی ایک بوری کی قیمت ایک انسان کی زندگی کے برابر تھی اور جتنے تالوں میں بند آج سونا چاندی بھی نہ رکھا جاتا ہوگا، اُس سے زیادہ حفاظت کے ساتھ اِن مسالوں کے رکھنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔'' انیل نے پھر ایک بیڑی کا لمبا کش لیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے اُسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا جسے اُس نے مان لیا اور واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ انیل نہ جانے کیوں ہمیشہ میری بات مان لیا کرتا تھا۔ مجھے اُس کی یاد آج بھی آتی ہے۔ مگر بحث کا سلسلہ رُکنے میں نہیں آرہا تھا۔

مقیم علی کو پھر جوش آیا، وہ کہنے لگا۔

''دیکھو کھانوں وانوں کی بات ہی کرنا فضول ہے۔ ہر شے کھائی جارہی ہے۔ وہ تو مذہب نے حرام حلال کی پابندی لگا رکھی ہے ورنہ دنیا کی ہر شئے کھائے جانے کے لیے تیار ہے۔ ہر شے پر دوسری شے کا حملہ ہے۔ ہر شے دوسری شے کو ہڑپ کرنے کے لیے تیار۔ اب سننے میں آیا ہے کہ گھوڑے کا گوشت یوروپ میں بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سلطنتیں ایک گھوڑے کے لیے بنتی اور بگڑتی رہتی تھیں۔ وہ گھوڑا ہماری پلیٹ میں چٹ پٹے مسالے میں لپٹا رکھا ہے... اور ٹھیک بھی ہے۔ جو شے تم پر حاوی ہوتی نظر آئے، بہتر ہے کہ اُسے پالتو بنا لیا جائے۔ پالتو بنا کر اُسے ہڑپ کر جانا زیادہ آسان اور اخلاقی اعتبار سے بھی مستحسن ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ پالتو بنا لینا اور کھا جانا ایک ہی بات ہے۔ میرے دادا کے بارے میں سنتے ہیں کہ ایک دن روہو مچھلی کا بڑا سا قتلہ نگلتے وقت اُس کا کانٹا اُن کی داڑھ میں پھنس گیا تھا۔ منھ سے خون کی ٹلیاں بہہ نکلیں۔ بڑا درد ہوا، آخر انھوں نے روحو مچھلی کے

اُس کانٹے کو داڑھ سے نکال کر ہمیشہ کے لیے اُسے اپنا خلال بنا لیا۔''

''ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔'' علاء الدین اپنی بھدّی ہنسی ہنسنے لگا۔ دوسرے لوگ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ مگر مجھے بالکل ہنسی نہیں آ رہی تھی۔ مقیم علی کی بات نے مجھے سنجیدگی کے ساتھ متاثر کیا تھا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے کھانے سے ہر جرم کو منسلک کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ قتل کو بھی۔ جس طرح پرودھاں نے ہر قسم کی نجی جائیداد کو چوری قرار دیا تھا، اسی طرح کھانا بھی ایک قسم کا ''قتل'' ہے۔ ایسا کتنی بار سننے میں آیا ہے کہ بھوک میں ماں باپ اپنے بچے کھا گئے اور آدم خور انسان بھی اسی دنیا میں رہتے آئے ہیں۔ آخر پہلا آدم خور کون تھا۔ اور پہلا کھانا کس طرح تیار ہوا تھا۔

''تم کیا سوچنے لگے حفیظ۔'' مقیم علی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''سنو حفیظ — دیمک بھی لکڑی کھاتی ہے اور میرے ایک عزیز کو عجب عارضہ ہو گیا ہے۔ اُن کی بڑی آنت میں برسوں سے کھانا سڑ رہا تھا۔ انھیں برائے نام ہی اجابت ہوتی ہو تو ہو۔ آخر ایک دن اس سڑے ہوئے فضلے نے اُن کی پوری آنت کو کھا کھا کر صفایا کر دیا۔ بڑی دردناک مگر گندی سی موت تھی اُن کی۔ جب انھیں غسل دیا جا رہا تھا تو وہاں بدبو کے مارے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔''

میں نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔

''مقیم! میں یہ سوچ رہا تھا کہ غور کرو تو ساری دنیا پر کھانوں کا حملہ اور یلغار ہے۔ ٹی وی پر کھانا پکانے والے شو دیکھ لو۔ اخباروں میں کھانوں کے کالم دیکھ لو، مجھے احمقانہ طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کھانے ہی وہ ہتھیار ہیں جو آہستہ آہستہ انسان کو بلکہ ساری دنیا کی بدنیتی اور چٹورے پن کو اپنے اندر نگلتے جا رہے ہیں۔ وہ انسان کو اپنا پالتو بنا رہے ہیں تا کہ انسان ''کھانے'' کو نہیں بلکہ ''کھانا'' انسان کو کھا سکے۔ اور اگر ایسا ہوا تو یقین کرو کہ ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھی جا چکی۔ یہ نئی دنیا مٹی کی تہوں، پہاڑوں، سمندروں اور درختوں سے نہیں بلکہ گوشت سے تیار ہوگی — کرۂ گوشت، گوشت کے پہاڑ، خون کے دریا ہڈیوں کی زمین۔ انسان جس پر اس طرح رینگتے پھریں گے جیسے آج کے حشرات الارض۔''

''ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔'' اس بار علاء الدین کی ہنسی میں ''ہو ہو'' کے ساتھ ''ہی ہی'' کی آوازیں شامل تھیں۔ ''بس شروع ہو گیا حفیظ کا کچا پکا فلسفہ۔'' وہ ہنسی سے دوہرا ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں! یہ غلط نہیں ہے۔'' مقیم علی نے اُس کی بات کاٹی۔ ''اس کائنات میں جہاں ہر شخص کا اوّلین اور آخری مقصد یہ ہو کہ وہ دوسرے کو بس ایک ''کھانے'' میں بدل دے۔ انسان دوسرے تمام انسانوں کے ساتھ سارے حشرات الارض کو کھانے میں بدل رہا ہے۔ اور دوسری طرف حشرات الارض خود انسان کے ''کھانا'' بن جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کائنات کا مقدر یہی ہوگا۔ دور سے آتے ہوئے چیل، گدھ، کوّے اور چیونٹیاں— کیا تمھیں ابھی بھی نظر نہیں آئے۔ اس لیے اگر سؤر کھاؤ تو اُسے سؤر کی طرح ہی کھاؤ اور اگر بھینسے کا گوشت کھاؤ تو ایسے ہی جیسے بھینسیں چرتی ہیں۔ تب شاید توازن برقرار رہے۔''

''مقیم! شاید تم نے Food Cycle اور Nitrogen Cycle میں سے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اور نہ ہی ڈارون یا اسپنسر کو۔'' راجندر کمار مصرا بُرا سا منھ بنا کر بولا۔

''مگر سنو، مقیم۔'' میں نے راجندر کمار مصرا کی سائنسی معلومات پر توجہ نہ دیتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

مقیم کے ساتھ سب ہی میری جانب دیکھنے لگے۔

''اصل مسئلہ باورچی خانے کا ہے۔ یا اُس جگہ کا جہاں کھانا پکانے کے لیے پہلی بار آگ جلائی گئی۔'' (وہ دو پتھر کے ٹکڑے جنھیں آپس میں رگڑا گیا اور آگ پیدا ہو گئی کیا پتہ کہ جہنم کی آگ بھی انھیں دو پتھروں کے ٹکڑوں کے رگڑنے سے پیدا ہوئی ہو، اور اِس جہنم کی آگ میں وہ پتھر کی سِل بھی جلے گی جو انجم باجی کے باورچی خانے میں تھی اور وہ آگ بھی یقیناً جہنم کی آگ میں ڈال دی جائے گی جو انجم آپا کے باورچی خانے میں لگی— میرے اندر کوئی سانپ کی سی آواز میں کہہ رہا تھا جسے کوئی نہ سن سکا۔)

''باورچی خانہ؟ مطلب کچن؟'' راجندر نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''کچن کی کیا اوقات ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی کتنی سی ہے۔ جیسے تم کچن کہہ رہے ہو۔ اٹھارہویں

صدی سے پہلے یوروپ تک میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ تو کھانا پکانے کی جگہ پر پانی کی سپلائی اور اسٹوو کی ایجاد کے بعد پیدا ہوا ہے۔ باورچی خانہ وہ تھا جہاں چولہے میں لکڑیوں کے ذریعے آگ روشن ہوتی تھی۔ اس کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہوتی تھیں۔ بالکل کالی''، اسلام صابری نے اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔

''تو کیا اب ایسے باورچی خانے نہیں ہوتے؟''

''ہوتے ہیں، ہوتے ہیں۔'' میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا اور وہاں چھپکلیاں ہوتی ہیں۔ سانپ کے بچے ہوتے ہیں۔ وہاں پتھر کی سل ہوتی ہے۔ مٹی کے تیل کا کنستر ہوتا ہے۔ اور ــــ وہاں قتل ہوتے ہیں۔ باورچی خانہ قتل گاہ ہوتا ہے۔'' مگر کسی نے سنا نہیں۔

مگر یہ میں نے بلند آواز میں کہا۔

''باورچی خانے میں آگ ہوتی ہے۔ کبھی یہ کھانا پکاتی ہے، کبھی کھانا گرم کرتی ہے اور کبھی کبھی انسانوں کو بھی جلا ڈالتی ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ کچن میں بھی کسی نہ کسی شکل میں آگ تو ہوتی ہی ہے اور حادثات وہاں بھی ہوتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں باورچی خانے کا انگریزی مترادف کچن ہے۔''

''نہیں! باورچی خانے کی بھیانک روایت کا کوئی تعلق اس جدید طرز کے دو کوڑی کے کچن سے نہیں قائم کیا جا سکتا۔ یہ حقیر کچن تو مشترکہ خاندان کے خاتمے کے بعد ہی پیدا ہوا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

انیل سنگھ آہستہ سے کھنکارا۔ ایک بیڑی پھر سلگائی۔ انیل سنگھ کٹر قسم کا کامریڈ تھا۔ اُس نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''باورچی خانہ کو مارکس کے فلسفے کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

میرے خیال میں اصل پیداواری طاقتوں کا مرکز تو یہی ہے۔ اصل کارخانہ یا فیکٹری تو باورچی خانہ ہی ہے جسے ہر کوئی اپنے گھر میں لیئے لیے گھومتا ہے۔ اس میں معمولی سے ڈھابے سے لے کر پانچ ستارہ ہوٹلوں کے باورچی خانے بھی شامل ہیں۔ سڑک چھاپ ڈھابے اِسی لیے زیادہ مارکسی

اخلاقیات اور مارکسی جمالیات دونوں کے قریب ہیں کہ وہ اپنے آپ میں صرف باورچی خانے ہیں اور کچھ نہیں، کیونکہ ان ڈھابوں میں باورچی خانے کسی پوشیدہ جگہ پر نہیں ہیں۔ اور نہ اُن پر کوئی پردہ پڑا ہوا ہے۔ باورچی خانے کے لیے کسی آڑ کی کیا ضرورت تھی؟ نہ وہ غسل خانہ ہے اور نہ پاخانہ اور نہ ہی نئے شادی شدہ جوڑوں کی خواب گاہ۔ اس لیے ''سانجھا چولہا'' کا نظریہ، مکمل طور پر مارکسی ہے۔ اور بورژوائی اخلاقیات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔''

''مارکس کی بات مت کرو۔ مارکس بھی فراڈ تھا...'' مقیم علی نے زور سے کہا۔ ''اس نے اپنے گھر کی کم عمر نوکرانی سے ناجائز رشتہ قائم کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار نوکرانی کو حمل بھی ٹھہر گیا تھا۔''

''یار مقیم چپ رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے حال ہی میں پال جانسن کی کتاب The Intellectuals پڑھی ہے۔ مگر پال جانسن بھی فراڈ ہے اور اُس کی حیثیت ایک زرد صحافی سے زیادہ اور کچھ نہیں — اور ویسے بھی یہاں مارکس کے نظریے کی بات ہو رہی ہے۔ مارکس کے کردار کا تجزیہ نہیں کیا جا رہا ہے اور نہ اُس کی بدکرداری کے لیے اُس پر کوئی مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔'' انیل سنگھ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''نہیں — مقیم، تم بالکل حق بجانب ہو۔ مارکس بہت خراب آدمی تھا'' اسلام صابری مٹھیاں بھینچے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا—

''مارکس کو آخری عمر میں خارش جیسی گندی، مکروہ اور قابلِ نفریں بیماری ہو گئی تھی۔ یہ اُس پر خدا کا عذاب تھا۔ وہ دہریہ تھا، دہریہ۔'' انیل سنگھ کا چہرہ غصّے سے سیاہ پڑ گیا۔ اُس کے ہونٹوں میں دبی بیڑی بجھ گئی۔ جسے اُس نے فرش پر گرا کر پیر سے مسل دیا، وہ مارکس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ آگے بڑھ کر اسلام صابری کے منہ پر مکّہ رسید کرنے والا ہے۔ تبھی میں نے اُسے آنکھ سے اشارہ کیا۔ اُس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ اس نے ایک بار قہر آلود نظروں سے اسلام صابری اور مقیم علی کو گھورا، پھر میری بات کا پاس کرتے ہوئے خاموشی سے کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں سناٹا تھا، بس باہر ہوسٹل میں کچھ برتنوں کی کھٹر پٹر ہو رہی تھی۔ میں نے میس کی جانب سے ایک ناگوار سی بو آتی محسوس کی۔

اچانک انیل سنگھ دوبارہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سنو حفیظ!'' وہ دوسروں سے بظاہر لاتعلق ہو کر صرف میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ ''سنو— پیداواری قوتیں اور اُن کے آپسی اُلجھے ہوئے دھاگے انسان کی آنتوں کے ریشوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ انسان کے بھیجے میں نہیں۔ یہ سارا معاملہ مکمل طور پر مادّی ہے مگر یہ ایک بے حد لطیف قسم کی مادّیت ہے جس میں آدمی کی آنتوں کی چکنائی کے ساتھ اُس میں رہنے والے کینچوے بھی شامل ہو جاتے ہیں اور اُس کے معدے میں بنی ہوئی تیزابیت کے باعث حلق میں آتی ہوئی بدبودار اُبکائیاں اور ڈکاریں بھی۔ اسی مقام پر بھوک کا مادّی پہلو بہت کھل کر سامنے آجاتا ہے اور ذائقے، بدنیتی اور لالچ تک کا۔ یہ ایسی لطیف مگر وسیع مادیت ہے جو تمھاری روحانیت تک کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیتی ہے۔ درگاہوں اور خانقاہوں میں ہونے والے لنگر فاتحہ اور نیاز و نذر کے کھانے، گردواروں میں ہونے والے بھنڈارے، مندروں کی سیڑھیوں پر ہونے والے بھوج اور مرنے والے کا شرادھ، صدقہ، قربانی کون سی ایسی چیز ہے جو اس مادّیت سے ماورا ہے۔ اس لیے میرا کہنا ہے کہ بلکہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ باورچی خانے یا رسوئی کو عوامی ملکیت ہی ہونا چاہیے۔ گھر سے دور بہت دور۔ ورنہ ہم گھر میں ہی ایک میدانِ جنگ تیار کر لیں گے۔ ایک جدلیاتی کشمکش اور پھر مضحکہ خیز انقلاب آئے گا۔ مشترکہ خاندان کی بچی کھچی ہڈیاں بھی ریزے ریزے ہو کر چونا بن کر بکھر جائیں گی۔ تب انسان، بدقسمت انسان کی ازلی تنہائی اُس کی ازلی بھوک کے ساتھ چپک کر اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟

''کھانا، کھانا، کھانا اور صرف کھانا۔ مارکس کو دوبارہ یہیں سے دریافت کرنا ہوگا۔''

انیل سنگھ خاموش ہو گیا۔ اس بار کمرے میں واقعتاً ایک گہرا اور سنجیدہ سناٹا تھا۔ اور مجھے تو ایسا لگ رہا تھا، جیسے انیل سنگھ کی آواز میں، شاید میں ہی بول رہا تھا۔

اچانک وہ ناگوار، بُو پھر آئی۔ میں نے ناک کے نتھنے سکوڑے اور دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔

باتوں باتوں میں آدھی رات گزر گئی تھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔

''چلو کہیں چل کر چائے پیتے ہیں۔ (کمروں میں تو بجلی بچانے کے چکر میں کالج نے ہیٹر کے استعمال پر پابندی کر رکھی تھی۔)

راجندر کمار مصرا نے تجویز پیش کی۔

مگر پتہ نہیں کیوں میری توجہ اُس ناگوار بو کی طرف لگی رہی۔

''ایسا لگتا ہے جیسے شہد سڑ رہا ہو یا پھر سرکا نکالا جا رہا ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہوں، بد بو تو آ رہی ہے۔'' کئی دوستوں نے میری تائید کی۔

''کم بخت میس کے بیرے آدھی رات میں کچی شراب تو نہیں کھینچ رہے ہیں۔''

اسلام صابری بڑبڑایا۔

''ارے نہیں، اس کے باورچی خانے میں بہت گندگی رہتی ہے۔ کوڑے دان کو کئی کئی دن تک صاف نہیں کیا جاتا۔ انڈوں کے چھلکے، پھلوں کے چھلکے، چائے کی پتی، ساگ، ساگ میں بجبجاتے ہوئے سفید کیڑے۔ کوڑے دان کو چاٹتی ہوئی چھپکلیاں۔ ابھی جا کر دیکھ لو۔ یہی سب ملے گا۔ ہندوستان گرم ملک ہے لہٰذا یہاں کیمیائی عمل بھی تیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کھانا سڑتا بہت ہے۔'' مقیم علی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

اور تب ہی علاء الدین منھ دبا کر اپنی مکروہ ہنسی ہنسا۔

''ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔''

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے علاء الدین کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تم سب گدھے ہو..... ہو۔ ہو۔ سڑا ہوا شہد۔ ہو ہو۔ سرکا، ہو۔ ہو— کچی شراب، ہی ہی۔''

علاء الدین کے ہلکی سی توند نکل آئی تھی جو اس طرح ہنسنے کے باعث بری طرح ہل رہی تھی۔

ہم سب اُسے حیرت سے دیکھے جا رہے تھے۔

بمشکل تمام اُس نے اپنی ہنسی روکی پھر کہا:

''کل میں نے کلّن سے فرمائش کی تھی وہ صبح کے ناشتے میں میرے لیے بھینس کے پائے تیار کر دے۔ میں نے اُسے پائے لانے کے لیے بیس روپے بھی دیے اور آگے بھی انعام دینے کا وعدہ کیا۔

یہ پائے گرم پانی میں ڈال کر اُبالے جار ہے ہیں تا کہ کھروں کالی چمڑی اور بال الگ کیے جا سکیں۔ اُس میں سے ایسی ہی..... سڑ اند آتی ہے۔''

''سالے بدنیت۔ ناشتے میں بھینس کے پائے کھائے گا۔ وہ بھی اکیلے اکیلے۔'' اسلام صابری چیخ پڑا۔ سب ہنسنے لگے۔

مگر مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے سینے پر بائیں طرف کچھ گیلا گیلا سا رینگ رہا ہے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ مجھے پسینہ کیوں آرہا ہے؟ اور وہ بھی جسم کے صرف ایک حصے پر! میں نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ حصہ چھوا جہاں گیلا گیلا لگ رہا تھا۔ مگر وہ تو اب حیرت انگیز طور پر خشک اور گرم تھا۔ تپتا ہوا، بخارزدہ۔ ہاں مگر اب یہ گیلا پن مجھے دائیں طرف محسوس ہونے لگا۔

میرے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے۔ میرا جی گھبرا رہا تھا۔

انیل سنگھ نے میری بے چینی کو بھانپ لیا۔

''کیا ہوا—بابر؟''

''کچھ نہیں۔''

''کوئی بات تو ہے؟''

''نہیں—بس میرے خیال میں اس وقت پائے اُبلنا اچھی بات نہیں ہے۔'' میں نے بے دلی کے ساتھ جواب دیا۔ اور پھر انیل سنگھ سے اپنے لیے ایک بیڑی طلب کی۔

انیل سنگھ نے بیڑی کا بنڈل اُٹھایا ہی تھا کہ میس کی جانب سے عجیب سا شور اُٹھا۔ کئی لوگوں کی آوازیں تھیں جن پر کسی کی بھیانک ہذیانی چیخیں حاوی ہو رہی تھیں۔ ہم سب کمرے سے نکل کر بھاگے۔ ہوسٹل کے ''باورچی خانے'' کی طرف۔ ہوسٹل کے چوکیدار اور دوسرے ملازم افراتفری میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ وارڈن صاحب بھی شور سن کر تیزی سے اِدھر چلے آرہے تھے۔

''کیا ہوا، کیا ہوا—؟'' سب سے پہلے میں نے پوچھا۔

''دیگچی—!'' کوئی بولا۔

''کیا ہوا دیگچی کو۔''

''دیگچی اُلٹ گئی صاحب۔ اُبلتے ہوئے پاؤں کی دیگچی چولہے پر سے اُلٹ گئی۔ کلّن پر اُلٹ گئی۔''

اور تب ہم سب نے دیکھا۔

فرش پر کلّن پاگلوں کی طرح لوٹیں لگا رہا تھا۔ وہ کبھی سیدھا ہو کر دھڑ کے بل اُٹھنے کی کوشش کرتا، پھر ناکام ہو کر باورچی خانے کے گیلے فرش پر ہذیانی چیخیں مارتا ہوا لوٹیں لگانے لگتا۔

باورچی خانے میں گندے بروزے کی سی بُو اور ایک عجیب ناگوار سی چرانده پھیل رہی تھی۔

پھر میں نے غور سے دیکھا۔

کلّن کے بدن پر بڑی تیزی کے ساتھ سفید پانی کے بلبلے سے پیدا ہو رہے تھے۔ یہ آبلے تھے۔ اُس کی قمیص اور بنیان، اُس کی لال کھال پر چیتھڑے چیتھڑے ہو کر چپٹ گئی تھیں۔ اور پھر میں نے یہ بھی صاف صاف دیکھا کہ اُس کی جلی ہوئی لال کھال پر ہر طرف ہڈیوں کی کرچیاں، بھینس کے کھروں کی چکنائی اور ریزے اور کالے بال جم کر رہ گئے تھے۔

رات کے سناٹے میں دور سے آتی ہوئی ایمبولینس کے سائرن کی آواز بہت وحشت انگیز محسوس ہوئی۔

کچھ دیر بعد، کلّن کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے جایا جانے لگا۔ ایمبولینس نے پھر سائرن دینا شروع کیے۔ اس سائرن کے ساتھ ہی کلّن کی دردناک اور وحشت انگیز چیخیں بھی سنائی دے رہی تھی جو آہستہ آہستہ مدھم پڑتی گئیں۔

بس دور تک سائرن کی وہی دہشت سے بھری آواز رہ گئی جو سناٹے کے سینے کو چیرتی ہوئی پتہ نہیں کدھر کو جا رہی تھی۔ میں نے علاء الدین کی طرف دیکھا۔

وہ مجرم بنا کھڑا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ زور زور سے کپکپا رہا ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر علاء الدین کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''نہیں علاء الدین تمھارا اس میں کوئی قصور نہیں۔''

''میں نے ہی کلّن سے پائے پکانے کے لیے کہا تھا۔'' وہ افسوس کے ساتھ بولا۔

''نہیں۔ قصور تمھارا نہیں بلکہ اس وقت پائے اُبلنے کا ہے۔ اگر اس کی جگہ آج کوئی اور چیز اُبلتی تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا، میں کسی کو بھی کیا جواب دیتا۔ میں اپنے سینے کے گیلے پن کے آگے لاجواب تھا۔

میں تو خود اپنی روح کی گہرائیوں میں پوشیدہ اس شیطانی علم کے آگے، نہ جانے کب سے بے بس، پریشان اور لاچار کھڑا ہوا ہوں۔

JK
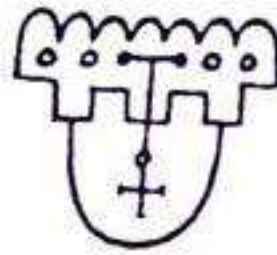
بھونک کتے، بھونک۔ اور چاہے چبا ڈال میرا ہاتھ۔ مگر اب میں تیرا پنا نہیں چھوڑوں گا۔ برسوں سے تُو میرے تعاقب میں ہے، تو نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ گاڑ دے اپنے نکیلے دانت میری کلائی میں، بھنبھوڑ کر رکھ دے مجھے مگر میں تجھے اپنی تحریر کے اندھے، سوکھے اور بدبودار کنویں میں ڈھکیل کر ہی رہوں گا۔ اے میرے ذلیل حافظے، بچپن سے تیرے شیطانی قدموں کی آہٹ میں اپنے پیچھے پیچھے سنتا رہا ہوں۔ اب میں تیرے اوپر ایک آسیب کی طرح مسلط ہوں۔ میں لکھوں گا، لکھوں گا، لکھوں گا۔

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ جو میں لکھ رہا ہوں اس میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، علامتیں، سبھی کچھ دندناتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ فیل مست کی طرح، مجھے معلوم ہے کہ کسی اپیل یا عرض داشت میں ان چیزوں کا آنا غلط اور قابل گرفت ہے۔ شاید کوئی ناول لکھ مارنے کی لاشعوری خواہش میری اپیل کو بگاڑ رہی ہو، مضحکہ خیز بنا رہی ہو، مگر آپ پروا نہ کریں۔ میں اپنی اپیل یا عرض داشت لکھنے کے بعد ایسی تمام مکروہات کو نشان زد کر دوں گا اور پھر سب کو کاٹ کر، اس طرح الگ پھینک دوں گا جیسے فاضل آنت کو، پیٹ سے کاٹ کر، کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یا پیٹ کی رسولیوں اور گردے کی پتھریوں کو۔

اور یہ بھی ہر پڑھنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نیلی کالی روشنائی سے لکھ رہا ہوں جو حساب کتاب کے کام کے لیے سب سے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر یہ عرضیاں لکھنے کے لیے

صرف کالی روشنائی استعمال کی جاتی تو شاید زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ وہ جلد ہی سوکھ جاتی ،مگر بات یہ ہے کہ اُس کالی روشنائی سے بڑی سڑاندھ نکلتی ہے وہ جم کر قلم کو بھی خراب کر دیتی ہے۔

میں جدید طرز کے کسی قلم کا استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو دوات میں اپنا کالا قلم ،جس کی ٹوپی سفید رنگ کی ہے، ڈبو ڈبو کر لکھ رہا ہوں کیونکہ میں خود کو ایک قدیم انسان بلکہ ازلی انسان سمجھتا ہوں۔ وحشی اور بھیانک انسان جہاں جرم اور گناہ کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ جہاں قتل صرف ہاتھ ہلانے کے مماثل ہے۔ یہ نیلی کالی روشنائی یوں بھی مناسب ہے کہ میرا بہی کھاتا ایک طرح سے، میرے مقدمے میں مستند شواہد اور ثبوتوں کے بطور کام آسکتا ہے۔

میرے پاس درد کی فہرستیں موجود ہیں۔ زندگی میں بغیر فہرستیں بنائے ہمارا کام نہیں چل پاتا مگر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی جسم اور روح کے نہاں خانوں تک رسائی کے لیے ہمیں فطرت کی ایک خفیہ زبان کو بھی سمجھنا ہوگا۔ میں اس زبان میں مہارت حاصل کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں اگرچہ ان سطروں میں، میں اس خفیہ زبان کو جو ہر قسم کے صنائع و بدائع سے یکسر خالی ہے، اول جلول طریقے سے ہی استعمال کر سکتا ہوں مجھے لکھنا تو ہے ہی کیونکہ نہ لکھنا حقیقت میں اُس رو کی گئی چھینک کی طرح ہوگا جس کی وجہ سے آنکھ، ناک اور کان سے خون کی لکیریں بہنے لگتی ہیں اور پھر موت واقع ہو جاتی ہے۔

میں مرنا نہیں چاہتا، میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔

وقت ہر شے کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے وہ ایل.ایل.بی. کا آخری سال تھا جب کالج میں علاءالدین کی بڑی بہن نے بی۔اے میں داخلہ لیا۔ اُس کی تعلیم کا سلسلہ کسی وجہ سے برسوں تک منقطع رہا تھا۔ اب ادھر آکر اُس نے دوبارہ داخلہ لیا تھا۔

اب آپ اس پر چاہے کتنی ہی حیرت کریں یا یہ بات آپ کے لیے قطعی طور پر ناقابلِ یقین ہی کیوں نہ ہو، مگر حقیقت یہی ہے کہ اُس کا نام "انجم" تھا۔

خیر میں نے تو پہلی بار اُس کا نام معلوم ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس لڑکی (یا عورت؟) سے میرا کوئی نہ کوئی اُول جلول سا رشتہ بن کر ہی رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری زندگی میں کسی نہ کسی شکل میں

ایک ہزار عورتوں کا بھی دخل ہوتا تو ان میں سے ہر عورت کا نام ''انجم'' ہی ہوتا۔ مگر اس کی کوئی معقول وجہ بتانے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ یہ وجہ بھی فطرت کی اُسی خفیہ زبان میں پوشیدہ ہے۔ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔

علاء الدین اُسے آپا کہتا تھا اور جیسا میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ قدرے اپنی بہن سے دبتا بھی تھا۔ مجھ میں اور علاء الدین میں بہت سی باتیں مختلف ہونے کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے تئیں مخلص تھے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اپنے تمام دوستوں میں، سب سے زیادہ علاء الدین مجھ پر ہی اعتماد کرتا تھا، احمق اور مطلب شناس چاہے وہ کتنا ہو۔

انجم کو گرلز ہوسٹل میں جگہ نہیں مل سکی تھی، اس لیے علاء الدین نے بھی ہوسٹل کا کمرہ چھوڑ کر، باہر ایک دو کمروں کا چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا اور دونوں بھائی بہن وہیں ساتھ ساتھ رہنے لگے تھے۔ علاء الدین کا تعلق مشرقی یوپی کے ایک قصبے کے ایک متمول خاندان سے تھا۔ اگر چاہتا تو اُس سے بھی بڑا مکان کرائے پر حاصل کرسکتا تھا۔

اکثر علاء الدین مجھے اپنے گھر چائے پلانے کے لیے لے جانے لگا۔ میں نے اُن دونوں کا باورچی خانہ دیکھا جہاں دالوں اور مسالوں سے زیادہ ہر طرف انواع واقسام کے اچار اور مربّوں کے ڈبے مجھے زیادہ نظر آئے۔

''ہو ہو... ہو ہو.... آپا کو اچار اور مربّوں کا بہت شوق ہے۔ یہ تقریباً ہر شے کا اچار ڈال دیتی ہیں۔ ہو.. ہو...''

مگر انجم بہت کم ہنستی تھی۔ وہ علاء الدین کے جملے پر تکلفاً بھی نہیں مسکرائی۔ اس کے چہرے پر ایک قسم کی خشونت تھی۔ رنگ سفید تھا مگر یہ سفیدی میرے اوپر کوئی خوشگوار تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی۔ مجھے یہ سفیدی پھٹے ہوئے دودھ کی سی سفیدی محسوس ہوئی۔ انجم جب چلتی تھی تو میں اُسے پیچھے سے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کا سبب یہ تھا کہ اچھا خاصا اونچا جمپر پہننے کے باوجود اُس کے کولہوں کی بلنت میں کوئی نسوانیت مجھے نظر نہیں آئی۔ دُبلی سے دُبلی عورت کے کولہوں میں بھی بہرحال یہ نسوانیت تو ہوتی ہی ہے اور مجھے ہمیشہ یہ شک رہا کہ شاید میں صحیح زاویے سے اُسے دیکھ نہیں پا رہا

ہوں۔ کئی بار اطمینان کر لینے کے بعد مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ انجم کے کولہے ابھی باہر کی طرف اُبھر کر نہیں آئے ہیں۔ اُن دانتوں کی مانند جو کبھی کبھی بالغ ہو جانے کے باوجود مسوڑھوں کی اندھی گہرائیوں میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ اور عمر کے کس پڑاؤ پر وہ باہر آئیں گے، اس کے بارے میں کچھ کہہ پانا مشکل ہوتا ہے۔

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ انجم اچھے خاصے فربہ بدن کی مالک تھی اور اُس کی چھاتیاں بھی بھاری اور بڑی تھیں۔ اُس کے جسم کا یہ غیر متوازی پن اُس کی شخصیت میں ایک پُر اسرار اور بے رحم عنصر کا اضافہ کرتا تھا۔ جس طرح معذور اشخاص یا اپنے جسم کے ایک آدھ اعضا سے محروم لوگوں میں بھی۔ اگر غور کیا جائے تو یہ عنصر صاف نظر آ جاتا ہے۔

مگر ایک دلچسپ اور قابلِ ذکر بات انجم کی آنکھوں میں بھی تھی۔ اُس کی آنکھیں یوں تو بہت چھوٹی چھوٹی نہیں تھیں۔ مگر وہ کسی بھی چیز کی طرف دیکھتے ہوئے اُنھیں اس طرح سکوڑے رکھتی تھی جیسے بینائی سے کمزور عورتیں دال چاول بینتے وقت یا سالن میں ڈالنے کے لیے مسالوں کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لیے یا پکتے ہوئے سالن میں سے گوشت کی ایک بوٹی نکال کر، آنکھیں سکوڑ کر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ گوشت گل گیا کہ نہیں۔

انجم کو اکثر میں نے اچار کا مرتبان اُٹھا کر اسی طرح آنکھیں چھوٹی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ انسانوں کی جانب بھی اسی طرح دیکھتی تھی جیسے یا تو وہ کوئی خوردنی اشیا ہیں یا اُن کے اندر کھانے کی کوئی ہانڈی پک رہی ہو اور وہ ابھی اُن کے جسم میں ڈوئی ڈال کر اُسے زور زور سے چلانا شروع کر دے گی۔

مگر ممکن ہے کہ یہ سب میرا وہم ہو۔ حالانکہ میرے ساتھ ستم ظریفی یہ رہی ہے کہ میرے وہم، دنیا کی حقیقی سے حقیقی شے سے زیادہ حقیقی رہے ہیں۔ میں نے تو اب حقیقی اور ٹھوس اشیا پر یقین کرنا تقریباً بند ہی کر دیا ہے۔ اس کے بجائے میں اپنے باطن میں سیاہ ناگوں کی طرح پلتے ہوئے وہموں پر ہی زیادہ ایمان و ایقان رکھتا ہوں۔

''آپا، حفیظ بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہو...ہو'' علاء الدین نے نہ جانے کیوں لجالت کے ساتھ کہا۔

انجم نے میری طرف آنکھیں چھوٹی کر کے دیکھا۔ کچھ اس طرح جیسے وہ کچے آم کی کسی ایسی قاش کی طرف دیکھ رہی ہو جس کا اچار تیار کرنے کے لیے وہ فوراً ہی اُسے گرم تیل اور مسالوں سے بھرے مرتبان میں ڈالنے والی ہو۔ مجھے اس کے یہ آنکھیں سکوڑنے کا انداز بالکل پسند نہیں تھا۔ جب بھی وہ میری طرف دیکھتی تو میں اپنا منھ پھیر لیا کرتا تھا۔

اُن دنوں وقت کو تو گویا پر ہی لگ گئے تھے۔ اُڑا چلا جا رہا تھا۔ ایل ایل بی کے فائنل امتحان شروع ہو گئے۔ میں نے قانون کی کتابوں کو رٹنا شروع کر دیا۔ سمجھ میں کچھ آئے یا نہیں، کسی قانون، کسی جرم اور اُس کی سزا سے آپ متفق ہوں یا نہیں مگر اگر آپ کو امتحان پاس کرنا ہے تو صرف حفظ کرنے پر بھروسہ کیجیے۔ اس ملک میں امتحان لینے کا طریقہ بے حد ناقص ہے۔

اپریل کا مہینہ تھا جس میں کبھی تو خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں اور کبھی بے حد حبس ہو جایا کرتا ہے۔ جس کے بعد ایک پیلی، غبار سے بھری آندھی کو آنا ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک اچھا اور قدرے نیک اور متوازن مزاج رکھنے والا مہینہ ہے۔ شدت پسندی کے کسی بھی عنصر سے پاک۔ اپریل میں امتحان دینا اچھا لگتا ہے۔

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ گذشتہ ایک دو سال سے ہمارا کالج خطرناک قسم کے بدمعاشوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ خاص طور سے رام گنگا کے کنارے بسے دو تین گاؤں کے ٹھاکروں کے لڑکے یہاں داخلہ لینے لگے تھے۔ یہ سب بدمعاش اور بہت مالدار، اور سیاسی رسوخ رکھنے والے لوگ تھے۔ مقامی الیکشنوں میں ان ٹھاکروں کا بہت بڑا رول تھا اور کسی بھی اُمیدوار کی جیت یا ہار اِن کی منشا اور خوشی پر ہی مبنی تھی۔

جتیندر کمار راٹھور، ننھے سنگھ، رجّو چودھری یہ سب بہت خطرناک لوگ تھے اور اِن کے ساتھ درجنوں کی تعداد میں ان کے گروہ کے غنڈے اور بدمعاش ہمہ وقت ساتھ رہتے تھے۔ ان سب بدمعاشوں نے ایل ایل بی میں ہی داخلہ لے رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن سے ہی مجرموں کے ساتھ رہتے رہتے اور قتل وخون وغارت گری کا تماشہ دیکھتے دیکھتے ان کے لیے اس سے عمدہ اور کوئی

کیریئر نہیں ہو سکتا تھا۔

ان بدمعاش لڑکوں سے کالج کا انتظامیہ تو کیا، پورا شہر کانپتا تھا۔ یہاں تک کہ مقامی حکام کو بھی ان کے نام پر سانپ سونگھ جایا کرتا تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اکثر ننھے سنگھ گھوڑے پر سوار ہو کر کالج میں آتا تھا۔ کالج کے کیمپس تک میں وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا اور اُس کی ٹاپوں کی آواز سے ہی ہم سب کے دہل جاتے۔

یہ سب امتحان گاہ میں منھ میں سگریٹ دبائے اور پان چباتے ہوئے داخل ہوتے۔ آپس میں گندا فحش مذاق کرتے ہوئے۔ کسی بھی کرسی پر بیٹھ کر سامنے کی میز پر اپنا چاقو اور بھرا ہوا ریوالور رکھتے اور پھر کتابیں نکال کر کھلم کھلا نقل کرنے لگتے۔

ان لوگوں کو دیکھ کر امتحان گاہ میں ڈیوٹیاں کرنے والے پروفیسروں کا پیشاب خطا ہو جاتا اور وہ وہاں سے کھسک جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے۔

امتحان گاہ میں ان لوگوں کے ہونے سے کچھ فائدہ میں بھی اُٹھالیتا۔ میں بھی اپنے انڈرویئر میں چھپی اگروال سیریز کی پتلی سی کنجی نکال کر دفعات وغیرہ کے نمبر لکھنے لگتا۔ بلکہ بعض بعض پیپروں میں تو میں نے پوری کی پوری نقل ہی ماری تھی۔ میرے دوسرے دوست بھی کچھ نہ کچھ ٹیپ لیتے۔ سوائے علاءالدین کے جس کو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ وہ تو شاید ماں کے پیٹ سے سارا قانون پڑھ پڑھا کر اور دفعات وغیرہ رٹ رٹا کر اطمینان سے پیدا ہوا تھا۔

اب ایک پل کو ٹھہر جایئے۔ یادداشت میں بہت سی چیزیں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میں ذرا اسے ایک نقطے پر مرکوز کرلوں تو آگے بڑھوں، مگر نہیں، یاد آ گیا۔ سب کچھ یاد آ گیا۔

اُس دن پورے کالج میں آخری امتحان تھا۔ ہم لوگوں کے پرچے دوسری میٹنگ میں ہوا کرتے تھے۔ یعنی دن میں تین بجے سے شام چھ بجے کے درمیان۔

دوپہر تک تو اپریل کی خوشگوار ہوا کے جھونکے آتے رہے تھے مگر شام ہوتے ہوتے ہوا بالکل رُک گئی تھی۔ چھ بجے امتحان ختم ہوا۔ ہم سب نے طے کیا کہ امتحان ختم ہونے کی خوشی میں کینٹین میں چل کر جشن منایا جائے۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ ایوننگ شو میں کوئی فلم دیکھی جائے۔ امپیریل ٹاکیز تو

تقریباً کالج کی بغل میں ہی تھا مگر سب کی مرضی کے آگے میں مجبور ہو گیا۔

ہم سب کینٹین کی طرف باتیں کرتے ہوئے اور امتحان کے پرچے پر گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کینٹین کالج کے ایک دور افتادہ کونے میں واقع تھی۔ جس کے آس پاس بڑی بڑی جھاڑیاں اور اونچے درخت تھے۔ سامنے سوئمنگ پول تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا بس اُس کے اوپر کوؤں کا جھنڈ بیٹھا کائیں کائیں کرتا رہتا تھا یا پھر بندر ادھر اُدھر کودتے پھاندتے نظر آتے تھے۔ اس سوئمنگ پول کی سیڑھیوں پر چڑھ کر دیکھو تو کالج کی قدیم گوتھک طرز کی عمارت بہت پُر اسرار اور قدرے افسردہ سی نظر آتی تھی۔

ہم کینٹین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی، کوئی تپائی خالی نہیں ہے۔ آج آخری امتحان ہونے کی وجہ سے کینٹین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا، ایک میز پر انجم بھی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ مینارانی، ششی اور سُمن سوری بھی بیٹھی تھیں۔ انگاروں کی ایک بھٹی پر چائے بن رہی تھی اور دوسری پر ایک بڑے سے کڑھاؤ میں، سموسے تلے جا رہے تھے۔ کینٹین کے کاؤنٹر پر شیشے کے مرتبانوں میں ناریل کے بسکٹ، کریم رول، مٹریاں اور ٹافیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہم لوگوں نے طے کیا کہ کھڑے ہو کر چائے پئیں گے اور سموسے کھائیں گے۔

اچانک پیچھے سے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آئیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میں سہم کر رہ گیا۔

وہ سارے غنڈے اِدھر کو ہی چلے آ رہے تھے۔ جتیندر کمار راٹھور، ننھے سنگھ اور رجو چودھری، اپنے پورے جتھے کے ساتھ دندناتے ہوئے کینٹین میں داخل ہوئے۔

بہت سے لڑکے اُنھیں دیکھ کر اپنی میزیں خالی کر کے اُٹھ گئے۔

کینٹین کا مالک ایک سکھ تھا۔ وہ گھبرا کر ان بدمعاشوں کی آؤ بھگت کرنے کے لیے دوڑا، مگر میں نے یہ واضح طور پر محسوس کیا کہ اُن سب کی توجہ صرف لڑکیوں کی طرف مرکوز تھی۔ لڑکیاں شاید اُٹھنا چاہتی تھیں۔ مگر خوف کے باعث گویا وہی جمی رہ گئی تھیں۔

اُسی وقت، باہر آسمان بالکل زرد ہو گیا۔ میں نے نظریں اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ دور اونچائی پر چیلیں اُڑ رہی تھیں۔ ہوا بالکل بند تھی مگر ایک گھنا پیلا غبار شمال مغرب کی جانب سے اُڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

''آندھی آ گئی۔'' میں نے سوچا۔

اور پھر واقعی وہ آ گئی۔ ایک پیلی آندھی جس میں مٹی کی بارش ہو رہی تھی۔ اندھیرا چھا گیا۔

ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ آندھی کے تیز جھکڑوں میں درخت کاغذ کے بنے ہوئے جھنڈوں کی طرح لہرانے اور پھڑ پھڑانے لگے۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ ہوا کا اتنا شور تھا کہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پورے کالج بلکہ شہر کی بجلی بھی اُسی وقت فیل ہو گئی۔ تاریکی اور گھنی ہو گئی مگر کچھ ہی دیر بعد، مجھے یہ صاف احساس ہونے لگا کہ آندھی کے اِس خوفناک شور کے ساتھ، ایک دبا دبا مگر دل دہلا دینے والا ایک دُوسرا شور بھی ہے؟ کڑھاؤ گرنے کا شور، برتن لڑھکنے کا شور، مرتبان ٹوٹنے کا شور؟ نہیں اس کی بھی زیریں سطح پر ایک بین کرتا ہوا مدھم شور! میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ ایک دوسرا شور بھی ہے کینٹین کے اندر۔ اندھیرے میں ایک قطعی مختلف شور، ایک دوسری آندھی۔

آندھی کے تیز جھکڑوں میں دھول اور غبار کے ساتھ ساتھ ہمارے سروں پر اور ہمارے چاروں طرف سموسے اور کریم رول اُڑتے پھر رہے تھے اور ہمارے چہروں پر طمانچے مار رہے تھے۔ بھٹی کے جلتے بجھتے انگارے بھی ہوا میں ناچ رہے تھے۔

پھر نہ جانے کب وہ آندھی رُکی۔ کینٹین کے اندر سے بہت سے طویل القامت سائے باہر آئے اور بھاگتے ہوئے باہر کی تاریکی میں گم ہو گئے۔

ہم سب دھول غبار اور مٹی میں اٹے ہوئے، مٹی ہی کی مورتیوں کی مانند اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے تھے۔ بجلی آ گئی— کاش اُس وقت بجلی نہ آتی۔

کینٹین کی چھت سے لٹکتے ہوئے بلب کی تیز روشنی میں میں نے دیکھا۔

وہ سب تقریباً عریاں تھیں۔ اُن کی شلواریں اُڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ ان کے چہروں پر جگہ جگہ خراشیں تھیں اور خون نکل رہا تھا۔ اُن سب کے بال کھل کر بکھر گئے تھے۔ وہ ان کھلے ہوئے بالوں میں اپنے چہرے ڈھانپ کر اپنے جسموں کو سکوڑتے اور سمیٹتے ہوئے زمین پر اُکڑوں بیٹھی تھیں۔

اس کے بعد کالج کا پراکٹر آیا ہوگا۔ پولیس آئی ہوگی۔ چاروں لڑکیوں کو کہیں لے جایا گیا ہوگا۔ ہم سب کالج سے باہر آئے ہوں گے۔ ہمارا اور نہ جانے کس کس کا بیان لیا گیا ہوگا۔ مگر علاء الدین ہمارے ساتھ نہ ہوگا۔ وہ نہ جانے کب، اُس تاریکی میں خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر چل دیا ہوگا اور رات میں اپریل کی وہی خوشگوار اور خنک ہوا بھی چلنے لگی ہوگی۔ مگر مجھے ان تفصیلات کو یاد کرنے میں اس وقت کوئی دلچسپی نہیں۔

دوسرے دن کے مقامی اخباروں نے اس بھیانک خبر کو بڑے زور وشور سے شائع کیا۔

''شہر کے سب سے بڑے اور باوقار کالج میں چار لڑکیوں کی ایک ساتھ اجتماعی عصمت دری...''

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ حقائق اور تفصیلات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ پولیس کے بیان کے مطابق عصمت دری کالج کی کینٹین میں نہیں بلکہ سوئمنگ پول میں کی گئی تھی، جہاں یہ چاروں لڑکیاں نہانے گئی تھیں۔ ملزموں کے اصل نام تو کہیں ظاہر ہی نہ تھے اور نہ ہی رام گنگا کی کھادر کے جرائم پیشہ ٹھاکروں کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ تھا۔ بہرحال جیسا کہ ان معاملات میں ہمیشہ ہوتا ہے کالج کے انتظامیہ اور پولیس نے مل کر اس معاملے کو بالکل ہی دبا دیا۔ چاروں لڑکیاں کیونکہ عزت دار گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے بات اور بھی نہ پھیلی۔ یہ بھیانک حقیقت صرف ایک افواہ بن کر رہ گئی۔

ہاں! اتنا مجھے معلوم تھا کہ بدنامی کے ڈر سے مینارانی، ششی، سمن سوری اور انجم نے نہ صرف کالج چھوڑ دیا تھا بلکہ اپنے گھر والوں سمیت شہر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہوگئی تھیں۔

علاء الدین نے اُس شام کے بعد کبھی شکل نہیں دکھائی۔ شاید اُس نے بھی فی الحال شہر چھوڑ دیا تھا۔

مگر میں ایک بات بار بار سوچتا تھا۔ اتنا خوفناک حادثہ تھا مگر آخر اُس دن میری چھٹی حس کہاں غائب ہوگئی تھی۔ میری وہ خطرناک صلاحیت کہاں سو رہی تھی؟ کیا آندھی کی وجہ سے ایسا ہوا؟ یا ہوا بند ہو جانے کی وجہ سے؟ یا میری اُس صلاحیت کو کسی کھانے کی بُو کا انتظار تھا۔ اور وہ بُو۔۔۔ مثلاً سموسوں کے

تلے جانے کی بُو اُس وقت میری ناک کے نتھنوں تک نہ پہنچ سکی۔

کہیں میری ناک تو بند نہ تھی؟ اور اتفاق یہ تھا کہ کسی کے منھ سے میں نے ''سموسے'' کا لفظ بھی نہیں سنا تھا، ورنہ دیکھنے یا سننے یا سونگھنے، کسی بھی حس سے میرے اندر یہ جادوئی کھیل شروع ہو جاتا تھا۔ اس سے، بگر کم از کم یہ نتیجہ تو ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ کوئی ایک اَن دیکھی طاقت اور ہے جس کی مرضی کے آگے کچھ نہیں چلتا۔ سب محض کٹھ پتلیاں ہیں، ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

تو پھر جرم اور سزا کے معنی کیا رہ جاتے ہیں؟ جو ہوتا ہے وہ اگر پہلے سے ہی لکھ دیا گیا ہے تو پھر کسی شے کے کوئی معنی نہیں، پھر تو زندگی اور موت دونوں بے معنی ہیں۔ مقدر کے لکھے ان پلندوں کا ایک ایک کاغذ، ایک نادیدہ اُنگلی کا محکوم ہے۔ کاغذ پر سب کچھ لکھا ہے۔ انسان کی روح اور اُس کے مصائب کا پورا جغرافیہ اور مسالے والی بریانی کا نسخہ بھی، بگر یہ ''لکھا'' اپنے ہو جانے کے ساتھ ہی نظر آتا ہے۔ مقدر کی تحریر لفظوں سے نہیں 'واقعات' سے بنتی ہے۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد اب چھٹیاں تھیں۔ ہوسٹل خالی ہونے لگے۔ سب اپنا اپنا بستر بند باندھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔ انیل سنگھ، مقیم علی، اسلام صابری سبھی تو جا رہے تھے۔ اور اب کسی کا یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کون دوبارہ واپس آئے گا اور کون نہیں۔ سب سے آخر میں، میں نے بھی اپنا بستر بند باندھا۔ شام کے چار بجے ٹرین یہاں سے میرے چھوٹے سے شہر کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ وہ شہر جہاں قلعے کی ندی بہتی تھی اور جہاں میرا گھر تھا۔ گھر جس میں چھوٹے ماموں رہتے تھے۔ (ممانی کا انتقال ہو چکا تھا) بھری دوپہر میں میں اسٹیشن کی جانب چل دیا۔

天

کیا کچھ بھول رہا ہوں؟ بھول بھی سکتا ہوں اور جو بھولوں گا وہ بہت اہم ہوگا۔ اسی لیے بہت سے حساب کتاب اس بہی کھاتے میں درج ہونے سے رہ جائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں اپنی عدالت کو، اپنے صحیح مقام پر اور اپنی سزا کو اپنے بالکل صحیح وقت پر پانے میں ناکام رہوں گا۔

کیا پتہ وہ کتنی بڑی عدالت ہوگی۔ سپریم کورٹ سے بھی بڑی۔ یہ میں نے اب سمجھ لیا ہے کہ بڑی عدالتوں میں ساری لڑائیاں زبان کی ہوتی ہیں۔ غلط لفظ اور غلط صرف ونحو کا استعمال آپ کے حق میں بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ غلط تلفظ تو خیر ہر شے کو مضحکہ خیز بنا کر رکھ ہی دیتا ہے۔ اس سے تو بہت بچنا ہوگا۔ محض الفاظ کی غلطی، غلط ہجے اور غلط تلفظ، مجھے جہنم رسید کر سکتے ہیں اور تب ایک بیگانی اور قطعاً اجنبی عدالت میرے لیے ہوگی اور جس کا کوئی تعلق میرے دکھ، سکھ اور مصائب سے نہ ہوگا۔ پھر مجھے انصاف کیسے ملے گا۔— آخر لفظوں کو ہندسے بنانے کی تحریک کیوں نہیں شروع کی جاتی؟ جب تک یہ نہیں ہوگا تب تک کبھی دنیا کو یہ علم نہیں ہوگا کہ کس کا قلب بے گناہ ہے اور کس کا نہیں — صرف خدا ہی یہ جانتا ہے مگر محض خدا کے جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

صبح ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہوگا۔ ایک جانی پہچانی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ٹرین نے قلعے کی ندی کا چھوٹا سا پل پار کیا۔

گھر آ گیا۔ اپنے آبائی شہر کے اسٹیشن پر اتر کر جب میں نے گھر کے لیے رکشہ لی تو عجب انہدام کا منظر نظر آیا۔ پورا شہر گویا کھدا پڑا تھا۔ ہر طرف دھول اور خاک اُڑ رہی تھی۔ سڑکیں، گلیاں، فٹ پاتھ سب کھدے پڑے تھے اور رکشہ کو مٹی اور پتھروں کے ملبے سے بچ بچ کر نکلنا پڑا تھا۔ ان

گڈھوں میں رکشہ کے پہیوں کے بار بار چلے جانے کے باعث اتنی زور زور سے جھٹکے لگ رہے تھے کہ میرے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا۔

تمام راستے، ویرانی اور مسماری کے اس افسردہ منظر کو دیکھتے رہنے کے بعد، تھک کر میں نے رکشہ والے سے پوچھا، ''بھائی! یہ ساری سڑکیں کیوں کھود دی گئی ہیں!''

''ارے بابو جی! دیکھ نہیں رہے ہو، سیور لائن پڑ رہی ہے۔''

''سیور لائن!'' اب میرا دھیان سیمنٹ کے بڑے بڑے پائپوں کی طرف گیا جو جگہ جگہ بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے تھے۔

''اب بابو جی کسی گھر میں میلے کا سنڈاس نہیں ہوگا... لو آ گیا آپ کا محلّہ۔ اس سے آگے ہم نہیں جا سکتے۔'' رکشہ والے نے رکشہ روک دی۔ یہ جگہ پہلوان صاحب کا اکھاڑہ کہلاتی تھی۔ یہاں سے میرا گھر کئی گلیوں کے بعد تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد آتا تھا۔

رکشہ والے کو پیسے دے کر میں نے اُسے رخصت کیا اور اپنا بستر بند کندھے پر اُٹھا کر اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلنے لگا۔

پو پھٹ رہی تھی، ایک عجیب سی مُردہ سفیدی میں نے آسمان پر پھیلتی دیکھی۔ آس پاس کچھ بھی جانا پہچانا نہیں لگ رہا تھا۔ جیسے میں کسی اجنبی سیارے پر آ گیا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک سیور لائن کے پائپوں کو پھلانگتا، لڑکھڑاتا، ٹھوکریں کھاتا ان اُجاڑ کھدی ہوئی گلیوں میں سے گزرتا رہا۔ دھول اور خاک سے میرے جوتے اٹے پڑے تھے۔ جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو خاصا اُجالا پھیل چکا تھا۔ کواڑ پہلے سے زیادہ خستہ حال نظر آئے۔ بستر بند زمین پر رکھ دیا، میری سانس پھول گئی تھی اور پسینہ آ رہا تھا۔

میں نے دروازے پر لگی بہت پرانی زنگ سے چور چور لوہے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ ایک بندر دروازے کی منڈیر سے کودتا ہوا گلی میں غائب ہو گیا۔ ایک بہت کمزور سے، بوڑھے آدمی نے جس کے منہ سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی، کواڑ کے پٹ کھول دیے۔ یہ چھوٹے ماموں تھے۔

کسی نے نہیں کہا، ''گڈو میاں آ گئے... گڈو میاں آ گئے۔''

کسی نے نہیں کہا۔

داسہ خالی پڑا تھا اور اُس کی لکڑی خستہ حال ہو کر جگہ جگہ سے جھول رہی تھی۔

مجھے اپنے اوپر نیند کا ایک زبردست غلبہ طاری ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں برسوں کا جاگا ہوا تھا۔ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں، آنکھیں سوجنے لگیں۔ اُن میں پانی بھرنے لگا۔ ہاتھ پیر شل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا اور باہری دالان میں پڑے بانِدوں کے ایک جھلنگے سے چھپر کھٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

لُو کے تیز اور جلتے ہوئے جھکڑوں سے میری آنکھ کھلی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ سارے آنگن میں سخت قسم کی دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں گھر کے ایک ایک گوشے میں گیا۔ دونوں کوٹھریوں میں، کمروں میں، آم کے درخت کو چھوا، نل کا ہتھا اُس وقت تک چلاتا رہا جب تک کہ اُس میں سے گرم پانی کی جگہ ٹھنڈا پانی نہ آنے لگا اور بھڑیں پانی کی دھار پر آ آ کر اکٹھا ہو گئیں۔ نل کی حوضیہ میں پیر ڈال کر میں نے باہری دالان میں اندر کی طرف رکھے ہوئے نعمت خانے کو دیکھا۔ اُس میں آلو اور پیاز سڑ رہے تھے۔ اُس کی جالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں۔

اور تب سب سے آخر میں، میں وہاں گیا۔

وہ اب پہلے سے زیادہ خستہ حال بلکہ تقریباً کھنڈر ہی نظر آیا۔ اب اُس کی دیواریں بالکل سیاہ تھیں۔ اُجلے پن کے کسی موہوم سے امکان سے بھی یکسر خالی۔

چولہے کی اینٹیں جگہ جگہ سے باہر نکل آئی تھیں۔ اونلہ تو ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا تھا۔ چھت کی کڑیوں پر ڈوری میں لٹکتا ہوا بلب مکڑی کے جالوں میں پھنسا پڑا تھا۔ وہ ساری چیزیں بہت بے ترتیبی کے ساتھ ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ چمٹا، توا، پھکنی، ہانڈیاں، سینیاں، پیالے اور کفگیریں۔ نہ جانے کب کے پکے ہوئے کھانے سالن سڑ رہے تھے۔ اور اُن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ دو بالکل کالی اور زہریلی چھپکلیاں روشندان میں چمٹی ہوئی مجھے تاکے جا رہی تھیں۔

مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جب یہ گھر کا سب سے رونق افزا حصہ تھا اور عورتوں کی آپسی گفتگو، ہنسی ٹھٹے

کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھیانک لڑائی کا اڈہ بھی۔ مگر اب تو سب مر گئے۔ کھاتے پکاتے ایک دن سب مر گئے۔

تب بڑی ہمت کر کے، میں نے اُس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ پہلی بار میں وہ مجھے نظر ہی نہیں آئی۔ اُسی وقت روشندان پر چمٹی ہوئی ایک چھپکلی ٹپ کی آواز کے ساتھ فرش پر گری۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹا— میں نے دیکھا فرش پر جہاں وہ کالی چھپکلی دم سادھے پڑی تھی، وہیں وہ بھی رکھی ہوئی تھی۔

وہ— یعنی پتھر کی بھاری سل۔ وہ اب بالکل زرد اور چکنی ہو چکی تھی۔ اس کے دانتے غائب ہو چکے تھے۔ نہ جانے کب سے اُسے اورایا نہیں گیا تھا۔

میں باورچی خانے کے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور جھک کر، سل کو دیکھنے لگا۔ خون کے دھبے اور بھیجے کے سفید ریشے— وہ تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ یقیناً وہاں موجود ہیں۔ ہلدی، مرچ اور دھنیے کی ہزار ہا پرتوں کے نیچے۔ میں اور نیچے جھکا اور پتھر کی اُس پرانی سل پر بہت پرانے خون کی بُو سونگھنے لگا۔

میرے ہاتھ کے بالکل قریب فرش پر پڑی چھپکلی اچانک بہت تیزی کے ساتھ کہیں رینگ گئی۔ اُس وقت میرے کانوں کو نہیں، دل کو ایک خوفناک آہٹ محسوس ہوئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ میں ہزار ہا کاکروچوں میں سے اُس ایک کو پہچان سکتا ہوں۔ وہ کاکروچ میرے پیچھے بیٹھا ہنس رہا تھا۔

''سب مر گئے۔ گڈو میاں، سب مر گئے۔'' چھوٹے ماموں سنک گئے تھے۔ وہ ہر جگہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔

''سب مر گئے سب مر گئے۔ تمہاری ممانی بھی مر گئی۔'' بس ریحانہ زندہ ہے، دور دور کے رشتہ دار مر گئے، سارا کنبہ ہی ختم ہو گیا۔''

''نہیں ماموں— رشتے داروں کے بچے تو موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی نہیں آتا، کوئی یہاں نہیں آتا۔ نہ کوئی بلاتا ہے، نیاز، نذر، شادی بیاہ، کسی کا بھی بلاوا نہیں

آتا ہے۔ خون سفید ہو گئے ہیں۔ کتنے سال گزر گئے۔ رحمت میاں کے یہاں سے رساول کی ہانڈی نہیں آئی۔ چھمّن کے یہاں ہر سال گیارہویں کی نذر ہوتی ہے۔ سارا محلہ، سارے رشتے دار، بڑے کے گوشت کا قورمہ اور تندور کی خمیری روٹیاں کھاتے ہیں، مگر نہ تو وہ ہمیں دعوت دیتا ہے اور نہ ہی کھانا بھیجتا ہے۔ وہ تو ریحانہ تک کو بھول گیا جو اُس کی چچازاد بہن کی منھ بولی بہن ہے۔'' چھوٹے ماموں کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والی شکایتوں کا ایک خزانہ موجود تھا۔

اُسی وقت ریحانہ پھوپھی بھی ہانپتی کانپتی آکر بیٹھ گئیں۔ جب وہ بیٹھیں تو لگا جیسے کوئی زنجیر کھڑکھڑائی۔

''حفیظ، بیٹا— شام کو اُرد گوشت پکا لوں؟''

''ہاں پکا لو۔''

''تو چلوں دروازے پر کھڑی ہو جاؤں۔''

''کیوں؟''

''محلے کے کسی لڑکے سے خوشامد کروں گی کہ پاؤ بھر گوشت لا کر دے دے۔''

''کیوں؟ بھورا قصائی خود گوشت دینے نہیں آتا۔''

''بھورا... وہ تو جانے کب کا مر گیا۔ کم بخت کو ہمیشہ کچی کلیجی کھانے کی لت تھی۔ آخر دل بڑھنے لگا۔ بڑھتا بڑھتا گیا اور ایک دن پھٹ گیا۔'' ریحانہ پھوپھی بیزاری کے ساتھ بولیں۔

''ریحانہ پھوپھی! یہ آپ اُٹھتی بیٹھتی ہیں تو بولتا کیا ہے؟''

''میری ہڈیاں۔''

''ہڈیاں؟''

''ہاں بیٹا! وہ کیا ہوتا ہے خون میں... پتہ نہیں کیا نام ہے۔ وہی بہت بڑھ گیا ہے اور جسم کے ہر جوڑ کی ہڈیاں گھس گھس کر گالے دے رہا ہے۔ نماز تک پڑھنا دوبھر ہو گیا ہے۔ رکوع سے سجدے میں جاؤ تو پورے بدن میں کھڑکھڑاہٹ سی ہوتی ہے۔ جیسے کوڑے دان میں چوہے دوڑ رہے ہوں۔ کبھی زنجیر کی سی چھن چھن ہوتی ہے۔ ہڈیوں کا لعاب ختم ہو چکا ہے۔ کیا بتاؤں جینا مشکل ہو گیا ہے۔ پیٹ

کا تندور بھرنے کے لیے باورچی خانے میں جانا اور کام کرنا دوزخ میں جانے کے برابر ہو گیا ہے۔ خیر اب تو کٹ گئی، بس اللہ کسی بھی دن اُٹھا لے۔'' وہ لگاتار کہتی رہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یورک ایسڈ کے لگاتار بڑھتے رہنے کی وجہ سے ریحانہ پھوپھی کی ہڈیاں ضائع ہو رہی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہ سب لاعلاج ہے۔ ریحانہ پھوپھی کے دُبلے پتلے جسم میں کھال اور گوشت کے نیچے ہڈیاں زنجیروں کی طرح چھن چھن بولتی ہیں۔ بہت جلد یہ زنجیریں ٹوٹ کر بکھرنے والی ہیں۔ اور ریحانہ پھوپھی کو ایک دائمی آزادی ملنے والی ہے۔

مگر میں نے یہ سب کہا نہیں۔ اس کے بجائے عقلمند بنتے ہوئے میں نے یہ مشورہ دیا۔

''آپ لوگ کوئی نوکر کیوں نہیں رکھ لیتے۔ جو کھانا بھی پکا دیا کرے اور گھر کی صفائی بھی کرے۔ باہر کے سب کام بھی کرے۔ میرا خیال ہے کہ اتنا آپ لوگ کر سکتے ہیں۔ دو آدمیوں کا کھانا ہی کتنا ہوتا ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' چھوٹے ماموں اور ریحانہ پھوپھی دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

''کیوں؟''

''توبہ کر، حفیظ توبہ کر۔ تجھے یہاں کے حالات کا علم نہیں۔ نوکر یا نوکرانی جو بھی رکھا، کسی بھی دن، رات میں دونوں کے گلے کاٹ کر رکھ دے گا اور جو بھی ہے وہ لوٹ لاٹ کر لے جائے گا۔''

''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ماموں۔ ہمارے گھر کوئی سونا چاندی نہیں ہے۔ کوئی زیور نہیں ہے۔ ہمارا خاندان تو پہلے ہی سب بیچ کر کھا چکا ہے۔ کون سی دولت دھری ہے یہاں۔'' میرا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔

''میں اپنی پنشن سے کچھ پس انداز کرتا رہتا ہوں۔ اسی سے تو تیری تعلیم کا سلسلہ چل رہا ہے۔''

''اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ میری وکالت مکمل ہو گئی۔ اب میں مقدمے لڑوں گا۔''

''مقدمہ۔'' چھوٹے ماموں کی آنکھیں اچانک ویران ہو کر خلا میں تاکنے لگیں۔

''کیا ہوا ماموں؟''

''سنگرام پور میں، ہم لوگوں کی خاصی بڑی اراضی تھی جس پر رحیم بخش نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔

ساٹھ سال گزر گئے۔ اب اُسی کی اولادیں اُس پر قابض ہیں۔ کتنی بار ہم لوگوں نے اُس کے خلاف مقدمہ لڑا، مگر ہار گئے۔ مگر اب، اب تم حفیظ! ماشاءاللہ خود اتنے بڑے وکیل۔۔۔!'' چھوٹے ماموں کی آنکھوں کی ویرانی اب معدوم ہوگئی اور وہ اُمید اور مسرت سے چمکنے لگیں۔

''بولو حفیظ۔۔۔ بولو گڈ و میاں لڑو گے یہ مقدمہ۔ بات زمین کی نہیں، بات عزّت کی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ پھر ہم یہ مقدمہ جیتیں گے، ہمیں ہماری زمین واپس مل جائے گی۔ وہاں سے گیہوں آئے گا، چاول آئے گا۔ دالیں آئیں گی۔ ہم وہاں باسمتی چاول بوائیں گے۔ ہاں باسمتی چاول کے پلاؤ کی بات ہی کیا ہے، مگر بکری کے گوشت میں پکنا چاہیے اور... ارہر کی دال، اُس پر دیسی گھی کے ساتھ لہسن اور مرچ کا بگھار اور... کیوں ریحانہ، پکانا آتی ہے ارہر کی دال۔''

میں حیران و پریشان چھوٹے ماموں کو دیکھے جا رہا تھا، کیا اُن کا دماغی توازن ٹھیک ہے؟ وہ غیر معمولی طور پر بوڑھے اور کمزور نظر آ رہے ہیں۔ آنکھیں تو حلقوں کے اندر بالکل ہی دھنس گئی ہیں۔ کلائیاں، پتلی پتلی، سوکھی ہوئی لکڑیاں نظر آتی ہیں۔ گردن کی کھال لٹک کر سینے پر آتی محسوس ہوتی ہے۔

چھوٹے ماموں کہے جا رہے تھے۔

''چنے کی دال گوشت کا کیا کہنا۔ محرّم میں سات تاریخ کو پکائیں گے۔''

''ماموں کھانا کھانا کھانا۔ اور کچھ نہیں سوجھتا آپ کو۔''

اچانک چھوٹے ماموں کا چہرہ بالکل سیاہ پڑ گیا۔

''حفیظ۔۔۔ میں بہت بیمار ہوں، مجھے کھایا پیا بالکل نہیں لگتا۔ دو سال ہو گئے۔ میں لگاتار سوکھتا جا رہا ہوں۔ مجھے 'کھانوں' کی باتیں تو کر لینے دو۔'' ان کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو؟'' مجھے اپنے اوپر تاسّف ہوا۔ اور چھوٹے ماموں کے تمام احسانات مجھے یاد آ گئے۔ آج میں جو کچھ بھی تھا اُن ہی کی وجہ سے تھا۔

''ماموں۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' میں نے اُنھیں جھنجھوڑا۔

''میرے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ بے شمار کیڑے۔ اتنے کیڑے کہ کبھی پورا پاخانہ اُن سے بھر

جاتا ہے۔ اور کبھی یہ اُلٹی کے ساتھ منھ سے باہر نکلتے ہیں تو نالی میں انھیں بہانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں ان سفید کینچوؤں کی تھیلیاں بنتی جا رہی ہیں۔ یہ کیڑے میرے پیٹ کا سارا کھانا کھا جاتے ہیں۔ سارا کھانا۔'' اچانک چھوٹے ماموں زار و قطار رونے لگے۔

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھبراہٹ میں، میری سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا، بس میں چھوٹے ماموں کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ جیسے بچّوں کو تسلّی دی جاتی ہے۔

چھوٹے ماموں کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ اُدھر ریحانہ پھوپھی بھی رونے لگیں۔ ہلتے اور روتے میں اُن کی ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں۔

''چپ ہو جاؤ۔ چھوٹے ماموں، چپ ہو جاؤ۔'' میں نے احمقوں کی طرح کہا، مگر وہ اُسی طرح روتے رہے۔

پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر کو دکھایا ہوگا، وہ کیا کہتے ہیں؟''

ماموں تھوڑی دیر تک یوں ہی سسکتے رہے پھر انھوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''سارے ڈاکٹر آپریشن کرانے کے لیے کہتے ہیں، مگر وہ یہ شک بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کینچوئے پھر میرے پیٹ میں پیدا ہونے لگیں کیونکہ یہ میرے ہی خون سے بن رہے ہیں... نہیں حفیظ! میں آپریشن نہیں کراؤں گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے آپریشن نہیں کرایا۔ یہ کوئی منحوس بلا ہے، جو میرے اوپر سوار ہے، کوئی عذاب ہے، پتہ نہیں کیوں؟''

''ڈاکٹر کہتے ہیں کھاتے رہو۔ کھاتے رہو۔ پیٹ خالی نہ رہے۔ اس لیے میں ہر وقت کچھ نہ کچھ ٹھونستا رہتا ہوں۔ مگر یہ سفید، منحوس کیڑے سارا کھانا کھا جاتے ہیں۔ میرا دل ہر وقت مالش کرتا رہتا ہے۔ دن بھر اُلٹیاں کرتا رہتا ہوں اور یہ کیڑے میرے منھ سے نکلتے رہتے ہیں۔ آسیب کی طرح، میرے منھ کا سارا ذائقہ ختم ہو چکا ہے۔ نہ نمک محسوس ہوتا ہے، نہ مرچ۔ نہ کڑوا نہ کھٹا۔ بس منھ میں ایک ہوا سی ناچتی رہتی ہے جس کا کوئی مزہ نہیں، کوئی ذائقہ نہیں۔''

''ماموں! پریشان مت ہو۔ میں تمھیں شہر لے جا کر بڑے اسپتال میں دکھاؤں گا، تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' میں نے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

مگر اُسی وقت ماموں اُبکائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور حواس باختہ ہو کر آنگن سے لگی ہوئی نالی پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں اُن کی پیٹھ سہلانے لگا تو میں نے دیکھا، ماموں کے منھ سے زرد زرد سا رقیق مادّہ نکل رہا تھا اور اُس کے ساتھ بے شمار چھوٹے بڑے سفید کیچوئے بل کھاتے ہوئے نالی میں بھرتے جا رہے تھے۔

میں نے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُلٹی کرنے کے بعد ماموں کی طبیعت بحال نظر آنے لگی اور وہ ریحانہ پھوپھی سے دودھ ڈبل روٹی لانے کے لیے کہنے لگے۔ ریحانہ پھوپھی بڑبڑاتی جاتی تھیں۔

''کچھ نہیں —انھوں نے ایک بار کوے کا گوشت کھایا تھا، وہیں سے یہ بیماری لگی ہے۔''

آہستہ آہستہ میں چھوٹے ماموں کے مرض اور اُن کی الٹیوں کا عادی ہوتا چلا گیا۔ یہ سب اب روزمرّہ میں شامل تھا۔ میں زیادہ تر گھر میں ہی رہتا۔ کبھی زینے کی چوتھی سیڑھی پر جا کر بیٹھتا، کبھی چھت پر گھومتا۔ کبھی باورچی خانے میں، کبھی پام کے درخت کے نیچے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ مجھے لُو کے تھپیڑے اچھے لگتے تھے۔ کم از کم اس موسم میں وہ کینہ پرور اُمس تو نہیں ہوتی جس میں پسینہ نہیں سوکھتا ہے اور پورا بدن گرمی دانوں سے بھر کر رہ جاتا ہے۔

میں بھری دوپہر میں آنگن میں اس طرح گھومتا جیسے کوئی بگولا۔ ہر طرف لُو ہوکتی پھرتی۔ دھوپ جسم کے خون تک کو جلائے ڈالنے کے درپے نظر آتی تھی۔

جب زبان اور حلق میں کانٹے پڑنے لگتے تو دالان میں گھڑونچی پر رکھی صراحی سے پانی نکال کر پینے لگتا۔

میں اس ویران ہوتے ہوئے گھر میں ایک بھوت کی مانند بے چین اور آوارہ گھومتا۔ جہاں تک چھوٹے ماموں اور ریحانہ پھوپھی کا سوال ہے تو وہ بھی تو بھوت ہی تھے۔

阴

یہ بالکل سچ ہے کہ میں زیادہ تر گھر میں ہی رہتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ باہر سیور لائن ڈالی جا رہی تھی اور سڑکیں گہرے گڈھوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور پھر یہ بھی تھا کہ اب اس شہر میں ایسا تھا ہی کون جس سے میں ملنے جاتا۔ محلّے میں کہیں میرا اُٹھنا بیٹھنا پہلے بھی نہیں تھا۔

تو پھر آخر میں بس قبرستان رہ جاتا تھا جہاں جا کر میں مُردوں کی قبر پر فاتحہ پڑھ سکتا تھا، مگر فاتحہ پڑھنا مجھے آتا نہیں تھا اور قبرستان کی مٹی اپنے جوتوں میں لگائے ہوئے میں گھر میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر قبرستان کی مٹی گھر میں آجائے تو گھر میں کسی نہ کسی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں توہم پرست نہیں ہوں بلکہ بہت ہی سائنسی مزاج رکھنے والا آدمی ہوں۔ بے حد چالاک اور ذہین، مگر مجھ سے زیادہ یہ بھلا کس کو معلوم ہوگا کہ علّت و معلول کے درمیان جو رشتہ ہے وہ اکثر اتنا باریک ہوتا ہے کہ محض عقلِ سلیم کے ذریعے اُسے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ پُر اسرار سا دھاگہ جو کبھی صاف نظر آتا ہے اور کبھی اتنا دھندلا ہوتا ہے کہ اُسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں قبرستان نہیں گیا۔ مجھے یہ اندیشہ ستانے لگا کہ چھوٹے ماموں اب کسی بھی دن مر سکتے ہیں، تو اُس دن تو قبرستان جانا ہی پڑے گا اگرچہ میں یہ بھی سوچتا تھا کہ کون کس کے جنازے کے ساتھ قبرستان جائے گا اور کون نہیں۔ اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مئی کا پورا ماہ گزر گیا اور جون کا کینہ پرور اور بغض سے بھرا مہینہ آپہنچا۔ گیلی، لجلجی گرمی کی بارش سے بھرا ہوا، ہر وقت پسینہ اور سڑاندھ۔ گھر میں مچھروں اور کھٹملوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہو رہا تھا۔ چھوٹے ماموں اور ریحانہ پھوپھی رات رات بھر باندوں کے چھپر کھٹ کو ڈنڈوں سے پیٹتے

رہتے۔ پلنگ کے نیچے چھوٹے بڑے کھٹملوں کا ڈھیر لگتا رہتا۔ وہ انھیں چپلوں سے مسلتے اور کھرنجے کے فرش پر خون کے دھبے بڑھتے جاتے۔ خون جو اُن کا اپنا تھا اور کھٹمل اور مچھر ہی اُن کی معنوی اولاد تھے۔ میں بھی تمام رات سارا بدن کھجاتا رہتا اور کروٹیں بدلتا رہتا۔ گھر میں نہ جانے کب سے چونے کی قلعی نہیں ہوئی تھی۔ پرانا چونا سیل کھا کھا کر دیواروں سے فرش پر جھڑ رہا تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ سیلن اور نمی کے سبب عجیب سی اشکال بن گئی تھیں۔ جیسے دیواروں سے مُردوں کے چہرے جھانک رہے ہوں۔ اس گھر کے پرانے مکینوں کے چہرے۔ اُن سب کے چہرے جو اَب اس دنیا میں نہیں۔

جون کے اس مہینے کا پہلا جمعہ آیا۔ عجب ویران اور سنسان سا جمعہ۔ گھر میں کوئی رونق ہی نہ تھی۔ مردوں میں تنہا چھوٹے ماموں رہ گئے تھے۔ تو اب اُن کا یہ بس نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اس حالت میں جمعے کی نماز کے لیے مسجد جائیں۔ وہ گھر میں ہی اُلٹا سیدھا وضو کر کے اور شاید غلط سلط سی ہی نماز ادا کرلیا کرتے تھے۔ خیر اللہ نیت دیکھتا ہے۔

مجھے اپنے بچپن کی، جمعے کی رونقیں یاد آئیں اور میں اُداس ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ آج اس گھر سے، اور کوئی نہیں میں، حفیظ الدین بابر عرف گڈو میاں نماز کو جائیں گے دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جماعت میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے غسل کی تیاری شروع کردی۔ تیاری کیا، بس نل کی حوضیہ میں ایک جانگھیہ پہن کر بیٹھ گیا اور نل کا ہتھا چلا چلا کر اپنے جسم پر پانی ڈالنے لگا۔ پانی کی دھار پر پیلی پیلی بھڑیں آ کر اُڑنے لگیں۔ میں بے فکری سے نہاتا رہا، مجھے علم ہے کہ وہ مجھے نہیں کاٹیں گی۔

جب میں سفید کرتا پاجامہ پہن کر اور کالی ٹوپی لگا کر نماز کے لیے گھر سے نکل رہا تھا تو باورچی خانے سے کسی پکتے ہوئے کھانے کی ایک تیز مہک میری ناک میں آئی۔ کیا پک رہا ہے، میں نے سوچا۔

اُسی وقت ریحانہ پھوپھی نے باورچی خانے کے اندر سے چیخ کر کہا۔ ''گڈو میاں نماز پڑھ کر سیدھے گھر آنا۔ آج میں نے گوشت کی طاہری بنائی ہے۔''

میرے پاؤں میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہوئی۔

''گوشت کی طاہری۔'' میں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دہرایا۔ اگر چہ گوشت کی طاہری میں بچپن میں بہت شوق سے کھاتا تھا۔ مگر اس وقت، دن کے کھانے میں، مجھے گوشت کی طاہری کے خیال سے وحشت سی ہوئی۔ میرا دل بیٹھنے سا لگا۔ نہیں ٹھیک نہیں ہے۔ اس وقت گوشت کی طاہری پکنا ٹھیک نہیں ہے۔ مگر وہ تو پک چکی تھی۔ چاول دم پر آرہے تھے۔ میں اپنے پیروں کی کپکپی پر قابو پاتے ہوئے گھر سے باہر آگیا۔ اذان ہو چکی تھی۔ اگر اور دیر کرتا تو مسجد میں جگہ نہ ملتی۔

مجھے مسجد کے اندر جگہ نہ مل کر مسجد کی چھت پر ملی۔ دھوپ سے بچانے کے لیے نمازیوں کے سر کے اوپر شامیانہ تان دیا گیا تھا۔ یہاں سے مسجد کے بُرج بالکل صاف نظر آتے تھے۔ وہ سامنے ہی تو تھے۔ لکھیا اینٹوں کے بُرج جن میں جگہ جگہ دراڑیں پیدا ہو گئی تھیں اور اُن میں سے خودرو گھاس پودے اُداسی کے ساتھ باہر جھانک رہے تھے۔ بُرجوں کے اوپر بجلی کے ننگے تاروں کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا جال لٹک رہا تھا۔ اس مسجد میں، بچپن سے اب تک، میں نے کتنی بار عید اور بقرعید کی نمازیں پڑھی ہوں گی۔ مجھے یاد نہیں۔ میں اُن نمازوں کو اور اُن کی رونقوں کو یاد کرتے کرتے اُداس ہو گیا۔

اُسی وقت میں نے غور کیا کہ آج جمعے کی نماز میں بچّوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اُس عمر کے بچے جن پر ابھی نماز فرض نہیں ہوئی تھی۔ عید بقرعید کی نماز میں تو بڑے لوگ اپنے ساتھ شوق میں ناسمجھ بچّوں کو لے آیا کرتے تھے اور وہ بھی بس اکا دُکا ہی۔ لیکن جمعے کی نماز میں ایک ساتھ، اتنے ناسمجھ بچے؟ ٹوپیاں لگائے ہوئے، کرتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر ان کو گھر میں نماز پڑھنا کیوں نہیں سکھایا جاتا۔

جماعت کھڑی ہو گئی۔

جماعت میں ان بچّوں نے نماز پڑھنا دوبھر کر دیا۔ کوئی ادھر سے کھلکھلا کر ہنستا، کوئی اُدھر سے۔ کوئی ایک کو دھکّہ دیتا کوئی دوسرے کو۔ وہ بیچ بیچ میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ نمازیوں کا دھیان بٹنے لگا۔ وہ رکوع بھول کر سجدے میں جانے لگے۔ زیادہ لوگوں کی نماز غلط ہو رہی تھی۔ خود میں بھی بھلا نماز کہاں ادا کر رہا تھا۔ میں تو غصّے میں جل بھُن رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ ان بدتمیز شیطان بچّوں کا مار مار کر بھرتہ بنا دوں۔ ان بچوں سے زیادہ مجھے اُن بڑوں پر غصہ آرہا تھا جو انھیں

ساتھ لے کر آئے تھے یا انھیں ٹوک نہیں رہے تھے۔ ممکن ہے کہ سب یہ سمجھتے ہوں کہ کچھ دنوں بعد یہ بچّے ہی تو اسلام کا جھنڈا لے کر آگے بڑھیں گے۔ اسی لیے انھیں نماز کی اور مسجد کی عادت پڑنی چاہیے۔ بچّوں اور نئی نسل سے یہ اُمید لگانا بہر حال غلط بھی نہ تھا۔

آخر نماز ختم ہوئی۔ جون کی سخت ترین دوپہر کا سورج تقریباً سر کے اوپر ہی اپنا قہر اُگل رہا تھا۔ سب بری طرح پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ مسجد کا دروازہ تھوڑا تنگ تھا، وہاں اپنی اپنی چپلیں ڈھونڈنے کے چکر میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ کوئی کسی کی چپل پہن رہا تھا اور کوئی کسی کی۔ گرمی کے مارے سب بے حال ہو رہے تھے۔ اور بے حد بدمزاجی اور چڑچڑے پن سے کام لے رہے تھے۔ اوپر سے یہ بچّے شور مچاتے، بدتمیزیاں کرتے اور لوگوں کے پیروں کو کچلتے ہوئے بھیڑ میں گھسے جا رہے تھے۔

میں کسی نہ کسی طرح مسجد سے باہر آیا اور سیور لائن کے پائپ سے بچتے ہوئے گڈھوں سے بھری سڑک پر چلنے لگا۔ تبھی پنڈت چورن والا اپنی صندوقچی لیے ہوئے وہاں سے گزرا۔ پنڈت بڑا سا تلک ماتھے پر لگاتا تھا اور سفید براق کرتا دھوتی پہن کر نکلا کرتا تھا۔ بچپن میں، میں نے اُس سے بہت چورن خریدے تھے۔ محلے کے سب لوگ اُس سے مانوس تھے۔ پنڈت کا چورن انار دانہ بہت ہی مزے کا ہوتا تھا۔ اکثر وہ مجھے مفت میں بھی دے دیا کرتا تھا۔ محلے کے تمام بچّوں سے وہ محبت سے پیش آتا۔ مشہور تھا کہ حلق تک کھانا ٹھونس کر کھانے والے اُس کا چورن پابندی سے پھانکا کرتے تھے۔

میں نے پنڈت کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ مگر اس کے سرخ و سپید ماتھے پر وہ لال تلک ابھی بھی اُسی طرح لگا ہوا تھا... اچانک میں نے دیکھا کہ ایک گھر کی دیوار سے لگے دو بچّے ہاتھ میں چھوٹا سا پتھر لیے کھڑے تھے۔ میں نے ان بچّوں کو پہچان لیا۔ یہ بہت شرارتی بچّے تھے اور جماعت میں میرے نزدیک ہی تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا۔ اُن بچّوں نے پنڈت کی طرف تاک کر زور سے پتھر پھینکے۔ پنڈت کے ہاتھ سے اس کی صندوقچی گر کر کھل گئی، کھٹے میٹھے چورن کی رنگ برنگی گولیاں سڑک پر دور تک بکھرتی چلی گئیں۔ پنڈت اپنا ماتھا پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اُس کے ماتھے کا تلک اُس کے ماتھے سے نکلے خون میں چھپ کر رہ گیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے بدمعاش بچے، ہنستے اور منھ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے ہوئے بھاگ گئے۔

پنڈت کے زیادہ چوٹ آگئی تھی۔ کچھ تو دھوپ اور گرمی کا اثر اور کچھ خون زائل ہونے کی وجہ سے اُس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ پتھر سر میں پتہ نہیں کس جگہ لگا تھا۔

کچھ لوگ اُسے اُٹھا کر ڈاکٹر اقبال کے مطب میں لے گئے۔ میں غصّے کے مارے کانپنے سا لگا۔ میرا بس چلتا تو ان بچّوں کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیتا۔ اس طرح غصّے اور افسوس کی حالت میں، میں اپنے گھر آ گیا۔

ریحانہ پھوپھی نے گوشت کی پیلی طاہری سے بھری ہوئی تام چینی کی رکابی میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے بمشکل تمام دو ہی لقمے کھائے ہوں گے کہ اچانک باہر بہت زور کا شور سنائی دیا۔

میں کھانا چھوڑ کر دروازے کی جانب لپکا۔

معلوم ہوا کہ پنڈت چورن والے نے ڈاکٹر اقبال کے مطب پر دم توڑ دیا۔ چوٹ دماغ کے کسی نازک حصّے پر لگی تھی اور اب، سامنے مالیوں کی پلیہ کی طرف سے ہندو مل کر ادھر پتھراؤ کر رہے تھے۔

میں نے دروازہ اچھی طرح بند کیا۔

میں جانتا تھا، جانتا تھا آج گوشت کی پیلی طاہری پکنا ایک بُرا شگون تھا۔ ممکن ہے کہ شہر میں فساد پھیل جائے۔

اور وہی ہوا، شام کے چار بجتے بجتے پورے شہر میں خطرناک قسم کا فساد پھیل گیا۔ پولیس کی گاڑیاں سائرن دیتی ہوئی نکلنے لگیں۔ رات کے بارہ بجے سے کرفیو بھی نافذ کر دیا گیا۔ پورا شہر تاریک سناٹے میں ڈوب کر رہ گیا۔

میں نے چھوٹے ماموں سے کہا، ''یہ سب اُن ناہنجار بچّوں کا کیا دھرا ہے۔''

''بچّے؟''

''ہاں، آج جمعے کی نماز میں پوری مسجد ان بچّوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُودھم کاٹ کر رکھ دیا۔ انھیں بچّوں نے پنڈت پر پتھر چلائے۔''

''میں تو اس مسجد میں نہ جانے کب سے نہیں گیا۔ جب صحت ٹھیک تھی تو بدھ والی مسجد میں جایا کرتا تھا۔'' ماموں بولے۔

'مگر اس مسجد کے متولی اور امام کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے، آخر اتنی زیادہ تعداد میں بچے جن پر نماز فرض نہیں ہے، وہ کیوں مسجد میں گھسے جا رہے ہیں۔ مسجد ہے کوئی کھیل کا میدان نہیں۔ ماموں یقین کیجیے! صفیں باندھنا مشکل پڑ گیا اور پھر یہ مسجد تو ہمارے ہی آباؤ اجداد کی بنوائی ہوئی ہے۔ آپ کو جواب طلب کرنا چاہیے۔ آخر منتظمین اس بات پر توجہ کیوں نہیں دے رہے ہیں؟''

''گڈو میاں! نئی نسل آ گئی ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنتی۔ پرانے لوگ اب رہے نہیں۔ دوسری جگہوں سے بھی آ آ کر لوگ یہاں بس گئے ہیں۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ مذہبی کٹر پن بڑھتا جا رہا ہے۔'' ماموں نے بے چینی سے اپنا سینہ سہلاتے ہوئے کہا۔ اُنھیں شاید اُبکائی آ رہی تھی۔ اُن کے پیٹ میں کیڑے اُن کے کھانے پر حملہ بول رہے تھے۔

''نہیں—'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں، کیا آپ کٹر نہیں۔ ہمارا پورا خاندان ہی مذہبی اعتبار سے کٹر رہا ہے۔ یہ تو آدمی کا نجی معاملہ ہے۔ اُس کا عقیدہ ہے۔ یہ سب مذہبی کٹر پن نہیں۔ یہ کچھ اور ہے۔ کوئی خطرناک شے۔ جب مذہب نابالغوں کے ہاتھ میں آ جائے گا تو یہی انجام ہوگا۔ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔''

باہر گلی میں پولیس گشت کر رہی تھی۔ وزنی بوٹوں کی دھمک سے فضا میں وحشت سی پھیلنے لگی۔

''مگر... مگر گڈو میاں! شہر کی فضا بہت پہلے سے خراب ہو رہی ہے۔ تعصب بہت بڑھ گیا ہے۔ محض ان بچوں کو کیوں بُرا بھلا کہہ رہے ہو۔ بچے بھلا کیا کر سکتے ہیں؟''

''اوں—اوں'' اُبکائی شاید ماموں کے حلق تک آ پہنچی تھی۔ وہ اُٹھ کر جلدی سے نالی کی طرف لپکے۔

میرے اندر ایک زہریلی ہنسی گونجی۔ آپ کو کیا معلوم، بچے کیا نہیں کر سکتے۔ بچے سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔ بچے دو دو قتل کر ڈالتے ہیں اور کسی کو پتہ نہیں چلتا۔

بچوں سے ہوشیار، چھوٹے ماموں ہوشیار—

بچّوں سے خطرناک مخلوق اور کوئی نہیں۔

میرے اندر کوئی اسی طرح زہریلی ہنسی ہنستا رہا اور چھوٹے ماموں کی اُبکائیوں کے ساتھ سفید سفید کیڑے نکل کر نالی میں بہتے رہے۔

کبھی کسی کو کچھ نہیں پتہ چلے گا۔ کوئی کبھی نہیں جان سکے گا۔ بھیانک سے بھیانک واقعہ، وقت کی موری میں سے ہو کر قابلِ رحم انداز میں یوں ہی بہہ جائے گا۔ جیسے یہ حقیر کینچوے بہتے جا رہے ہیں۔

کرفیو کرفیو میں ہی کئی دن اور راتیں گزر گئیں۔ گھر میں آلو بھرے پڑے تھے اور دال، مسالے، تیل، گھی ان کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ بس دودھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ افواہ تھی کہ دودھ میں مالیوں کی پلیہ کے پار والوں نے زہر ملا دیا ہے یا ایسی دوا جس سے مسلمانوں کی نس بندی ہو جائے۔ ورنہ دودھ والا تو کرفیو میں بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتا ہے۔ فسادات کے موقعوں پر افواہوں کا بازار گرم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ان افواہوں کی اپنی ایک نفسیات اور سماجیات ہوتی ہے۔ ایک افواہ، فساد کے موقع پر بڑے بڑے حقائق پر بھاری پڑتی ہے۔ افواہ اچانک ایک ''مطلق سچ'' کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس سے مفر ممکن نہیں اور جو ہر ٹھوس حقیقت کو ایک خواب یا سراب میں بدل کر رکھ دیتی ہے۔ فساد میں لوگ افواہ کو ایک نشے کے بطور استعمال کرتے ہیں، جس طرح نشیلی دواؤں کا عادی بغیر نشیلی دوا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُسی طرح فساد میں کوئی بھی انسان بغیر افواہوں کے نہیں جی سکتا۔

ایک دن محلّے میں یہ افواہ اُڑی کہ آج رات پولیس گھروں کی تلاشی لینے آئے گی۔ دروازہ کھلوا کر نہیں، بلکہ سیڑھی لگا کر چھتوں پر سے پولیس گھروں میں کودے گی۔ اور ہتھیار تلاش کرے گی۔ محلّہ کے سارے لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے کئی لوگوں نے گھر میں پھل کاٹنے والے چاقو تک باہر چپکے سے سیور لائن کے پائپ میں ڈال دیے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ جس کے گھر کوئی جوان لڑکا مل جائے گا پولیس اُسے دھر کر لے جائے گی۔

اپنے گھر میں جوان لڑکا میں ہی تھا۔ میں نے سوچا اور یہ بھی کہ کاش! یہ افواہ ٹھیک ہو۔ پولیس مجھے فساد کرانے کے جرم میں ہی پکڑ لے جائے۔ میں کسی نہ کسی جرم کا مرتکب تو ٹھہرایا جاؤں۔ ایک

احمقانہ سا احساسِ جرم مجھ پر سوار ہونے لگا۔

اُس رات سوتے میں، میں نے خواب دیکھا۔ خواب میں نہ جانے کتنی مسجدیں دیکھیں، بارہ دری کی مسجد، تاڑ والی مسجد، بدھ والی مسجد، نو میلے کی مسجد، مرزائی مسجد، ڈومنی والی مسجد، لال مسجد، بی بی جی کی مسجد اور یہاں تک کہ قبرستان والی مسجد۔ ہر مسجد میں صرف بچّے ہی بچّے بھرے ہوئے۔ سفید کرتہ پاجامہ اور ٹوپیاں لگائے تقریباً چار پانچ سال کے بچّے۔ ان بچّوں کے علاوہ مسجد میں اور کوئی بھی نہ تھا۔ یہ بڑا ڈراؤنا سا منظر محسوس ہوا۔ آخر سارے لوگ کہاں گئے۔ سارے نمازی کہاں گئے۔ صرف چھوٹے چھوٹے بچّے مسجدوں میں بھرے ہوئے تھے اور عالم ہو کا سا سماں تھا۔

تبھی ٹوپی لگائے ایک بچّے نے، جس کے چہرے پر معصومیت اور بھولے پن کا نام نہ تھا۔ میرا کندھا پکڑ کر جھولنا شروع کر دیا۔ کیا وہ میری گود میں آنا چاہتا تھا۔

میں نے اُسے زور سے دور جھٹکنے کی کوشش کی مگر وہ باقاعدہ میرا کندھا پکڑ کر اس طرح جھول گیا کہ اُس کے پاؤں زمین پر نہ لگ کر تھوڑا اوپر لٹکنے لگے۔

میرے کندھے میں سخت دُکھن ہونے لگی۔ اور تبھی اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹے ماموں میرا کندھا پکڑ کر زور زور سے ہلا رہے تھے۔

''حفیظ۔ حفیظ۔ اُٹھو۔ جاگو۔''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا، کیا پولیس ہے؟''

''نہیں مگر کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ ابھی ابھی گلی سے گزری ہے۔ سنو میرے ساتھ آؤ...''

چھوٹے ماموں دالان سے ملحق بڑی کوٹھری کی طرف بڑھنے لگے۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے لپکا۔

چاروں طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہم کوٹھری کے اندر داخل ہوئے۔

''لو حفیظ! ذرا موم بتی روشن کرو'' انھوں نے ماچس میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

میں نے طاق میں رکھی موم بتی روشن کی۔ کوٹھری میں چاروں طرف صندوق اور پرانی کتابیں

بھری ہوئی تھیں۔ کتابوں کو اندر ہی اندر دیمک چاٹ رہی تھی۔ سیلن اور دیمک کی مٹی کی بو سے میرا جی متلانے لگا۔

تب ماموں نے ایک چھوٹا سا پھاوڑا، ایک بکسے کے پیچھے سے نکالا اور مجھے دے دیا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ۔'' میں زچ ہو گیا تھا۔

''حفیظ کھودو — یہاں اس جگہ۔'' چھوٹے ماموں کھر بجے کے بوسیدہ اور سیلن زدہ فرش پر اُکڑوں بیٹھ کر ایک بڑے سے کالے صندوق کے نیچے اشارہ کرنے لگے۔

''ہاں یہیں — ذرا سا صندوق طاقت لگا کر آگے بڑھاؤ۔ بس ذرا سا۔''

میں نے تعمیل کی۔ صندوق ہلکا تھا۔ آسانی سے آگے کھسک گیا۔ ایک چھوٹا سا مٹیالے رنگ کا سانپ تیزی سے صندوق کے نیچے سے نکلا اور کسی دوسرے صندوق کے نیچے غائب ہو گیا۔

ماموں نے سانپ کی پروا نہ کی، وہ دل ہی دل میں کچھ یاد کر رہے تھے۔''

''حفیظ... اس جگہ کھودو۔ یہ چار اینٹیں نکالو۔'' انھوں نے فرش کی اُن چار اینٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ میری بات انھوں نے نہیں سنی۔

''نہیں پہلے مجھے اس سب کا مقصد بتائیے۔''

'سنو، اچھا سنو۔'' انھوں نے بولنا شروع کیا۔

''آج سے تیس سال پہلے بھی یہاں بھیانک فساد ہوا تھا۔ اور مسلمانوں کے ساتھ پولیس نے بڑی زیادتی کی تھی، وہ گھر میں آتی اور ہتھیار کے نام پر چمٹا، پھکنی اور توا تک ضبط کر کے لے جاتی اور گھر کے تمام افراد کو، عورتوں کو چھوڑ کر گرفتار کر کے لے جاتی۔ پولیس نے بہت مظالم ڈھائے تھے۔ اُن دنوں ہمارے گھر میں بہت سے شکاری چاقو اور شکار کا جانور ذبح کرنے والی، بڑی بڑی چھریاں بھی تھیں۔ پولیس کے ڈر سے بھائی میاں اور تمھارے بڑے ماموں نے ان چھریوں کو اس جگہ گڈھا کھود کر دفن کر دیا تھا اور گڈھے پر بکس رکھ دیا تھا۔ تب سے اب تک وہ یہیں دفن ہیں۔ مگر آج لوگ کہہ رہے تھے کہ پولیس گھروں میں زمین کھدوا کھدوا کر دیکھ رہی ہے۔ حفیظ — حفیظ! مجھے تمھاری فکر ہے۔ کاش تم چھٹیوں میں گھر نہ آتے۔ اگر اُنھوں نے اس جگہ کو کھودا تو... تو قیامت آ جائے گی۔''

''تو اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ چار اینٹیں نکالو — یہ چار، ان پر کوئلے سے لکیریں بنی ہوئی ہوں گی۔'' انھوں نے جھک کر دیکھنے کی کوشش کی، پھر مایوسی سے کہا۔ ''لکیریں شاید مٹ گئیں۔''

''حفیظ! یہ جگہ کھود کر وہ چھریاں اور چاقو نکال لو۔ میں چپکے سے چھت پر جاؤں گا اور انھیں سیور لائن کے پائپ میں پھینک دوں گا۔ کھودو — دیکھو چار تو بڑی چھریاں ہوں گی۔ بغیر مڈھوں والی اور ایک بہت بڑا سا شکاری چاقو ہوگا۔ ہاتھی دانت کے دستے والا — یعنی دیکھ لینا، کل پانچ عدد ہوں گے۔'' چھوٹے ماموں ایک دبے دبے جوش سے کپکپا رہے تھے۔

باہر، دور کہیں کسی چھت پر کوئی اذان دے رہا تھا، جس کے جواب میں ادھر اُدھر سے اذانوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

''یہ اذانیں کیسی؟ ابھی تو رات کے ڈھائی بجے ہیں۔''

''یا تو مالیوں کی پلیہ کے پار والے ہندوؤں نے چڑھائی کی ہے۔ یہ اذانیں حوصلہ بڑھانے اور جوش پیدا کرنے کے لیے اور سلامتی کے لیے دی جاتی ہیں۔ یا پھر یہ اِجنّا کی اذانیں ہیں۔ مگر تم پھاوڑا تو چلاؤ۔''

میں نے بے دلی کے ساتھ فرش کی اینٹیں اُکھاڑنا شروع کر دیں۔ دیکھنے میں کمزور اور خستہ حال ہونے کے باوجود وہ بڑی مشکل سے اپنی جگہ چھوڑ پائیں۔

اب یہاں مٹی تھی — گیلی مٹی جس میں سے نکل نکل کر چیونٹیاں اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔

''کھودو۔ اسی جگہ۔ پھاوڑا چلاتے رہو۔ یہیں وہ چھریاں دفن ہیں ابھی مل جائیں گی۔ مگر ہوشیاری سے یہاں سانپ ہو سکتے ہیں۔ کسی سانپ پر پھاوڑا نہ پڑ جائے۔''

''کیوں؟'' میں نے پھاوڑا چلانا روک دیا۔ میری سانس پھول آئی تھی اور میں پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

''ابھی ابھی سانپ نکلا تھا۔ مجھے تو اس موذی کو اُسی وقت ختم کر دینا چاہیے تھا۔''

''کیا غضب کرتے ہو، معلوم نہیں کہ آج جمعرات ہے۔ جمعرات کو کسی سانپ یا چھپکلی کو نہیں

مارنا چاہیے۔ وہ دراصل بھیس میں ہوتے ہیں۔ اماں بتاتی ہیں کہ ایک بار دادا میاں نے جمعرات کو ایک سانپ مار دیا تھا۔ اس سانپ کے اندر سے اتنا خون نکلا۔ اتنا خون نکلا کہ سارے گھر میں خون ہی خون بھر گیا۔ اسی رات دادا میاں کو خواب میں نظر آیا کہ انھوں نے جنوں کے شہزادے کو مار دیا ہے جو سانپ کے بھیس میں ہمارے گھریوں ہی چہل قدمی کے لیے چلا آیا تھا۔ دادا میاں نے اُس خوبصورت شہزادے کی لاش کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھا تھا۔ کفن تک خون سے تربتر تھا۔ لاش سے خون کسی طرح رُک ہی نہیں رہا تھا۔ یہ شہید کی علامت ہوتی ہے اور پھر جانتے ہو کیا ہوا۔ دادا جان کو اُسی وقت تیز بخار نے اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے پاگل ہو گئے۔ مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہ ہوا۔'' چھوٹے ماموں کی بات سن کر، چند لمحوں کے لیے میں واقعی ڈر گیا۔ پھر پھاوڑا اُٹھا کر زمین کھودنا شروع کر دی۔

میں زمین کھودتا جاتا تھا۔ گڈھے کے چاروں طرف سیلن زدہ مٹی کا ڈھیر اونچا ہوتا جاتا تھا۔

گڈھا گہرا ہوا، اور گہرا — اور گہرا۔ مگر چھریوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔

''چھوٹے ماموں نہیں ہیں یہاں چھریاں'' میں نے تھک کر جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا اور پھاوڑا پھینک کر وہیں فرش پر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ میری سانس بری طرح پھول رہی تھی اور پیاس کے مارے گلے میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔

''ہونی تو یہیں چاہیے تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، بالکل اسی جگہ۔ اس نیلے صندوق کے نیچے۔'' چھوٹے ماموں نے اپنا منھ گڈھے کے اندر کیا اور اس طرح جھانکنے لگے جیسے پاتال میں جھانک رہے ہوں۔

طاق میں رکھی موم بتی کی لو آہستہ آہستہ کپکپانے لگی تھی۔ اس لو کی مٹیالی روشنی میں، ہم دونوں کی اُکڑوں بیٹھی ہوئی پرچھائیاں سیلن سے بھری، بدرنگ دیواروں پر المناک حد تک مضحکہ خیز نظر آئیں۔

پھر ایک گہری، لمبی مایوس سانس لے کر چھوٹے ماموں نے اپنا منھ گڈھے سے باہر نکالا اور کہا۔

''چھریاں یہاں سے چلی گئیں۔''

''کیا مطلب؟''

''لوہے کے ہتھیار اگر زمین میں دفن کر دیے جائیں تو وہ کچھ عرصے تک تو اپنے مالکوں کا انتظار کرتے ہیں پھر زمین کے اندر ہی اندر، اپنی جگہ بدل کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مٹی میں تیرتے ہوئے۔ پھر کبھی زمین ہی اُنھیں خود اُگل دے تو اُگل دے ورنہ وہ کبھی نہیں ملتے۔ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتے ہیں۔''

میں اس بکواس پر یقین نہیں کر سکتا تھا، اس لیے خاموش رہا۔

''حفیظ ــ بالکل یہی مایا کی دیگ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تانبے کی دیگ میں سونا چاندی اشرفیاں بھر کر زمین میں گاڑ دو اور اگر لمبے عرصے تک اُس دیگ کو زمین سے نہ نکالا جائے تو مایا کے پیر بننے لگتے ہیں اور ایک دن خود بخود اپنے پیروں سے چلتی ہوئی دیگ وہاں سے کہیں اور چلی جاتی ہے۔ کسی دوسرے کا مقدر سنوارنے کے لیے۔''

''چھوٹے ماموں آپ مجھے عجیب عجیب باتیں بتا رہے ہیں۔'' جھنجھلاہٹ کے عالم میں بھی مجھے ایک کمزوری ہنسی آگئی۔

''ہش۔ گڈ ومیاں! ہنستے نہیں۔ یہ سچ ہے، یقین کرو۔ تم نے باورچی خانے کی عقبی دیوار کو دیکھا ہے، جو اکبر علی کے گھر سے ملی ہوئی ہے؟''

''ہاں۔''

''تم نے اُس دیوار پر چولہے کے قریب چار فٹ اوپر ایک بڑا سا گول نشان دیکھا ہے؟''

میں نے ذہن پر زور دیا۔ مجھے یاد نہیں آیا۔

ماموں لگاتار کہے جا رہے تھے۔

باورچی خانے میں مایا کی دیگ دفن تھی۔ پورے بارہ سیر کی تانبے کی دیگ۔ ہمارے نامعلوم پرکھوں کا خزانہ۔ سینکڑوں سال انتظار کیا، اس بے چاری دیگ نے، آخر جاڑوں کی ایک بے حد سرد، تاریک اور مہاوٹوں سے بھری رات میں، جب بارش اور اولوں کے ساتھ ساتھ، آسمان پر بجلی کڑک رہی تھی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں، وہ باورچی خانے کی عقبی دیوار کو توڑتی ہوئی ہمارے گھر سے نکل گئی۔ دیوار میں بارہ سیر پلاؤ والی دیگ کے برابر کا جیسے گومبل سا لگ گیا۔ بجلی کی کڑک اور بارش کے شور میں کسی کو دیوار ٹوٹنے کی آواز نہ آئی۔ صبح ہوئی تو سب نے دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا، مگر اب کیا ہو سکتا

تھا۔ بعد میں اینٹوں سے اُس خلا کو بھرا گیا۔ وہ دائرہ نما نشان اُسی خلا کا ہے۔ ہمارا وقت اُس دن سے بگڑ گیا۔ کہتے ہیں کہ اکبر علی کا دادا رکشہ چلاتا تھا۔ مگر اس واقعے کے بعد حیرت انگیز طور پر اُس کے پاس دولت آتی گئی۔ اکبر علی آج محلّے کا سب سے زیادہ مالدار آدمی ہے۔'' کہتے کہتے اچانک ماموں کو اُبکائیاں آنے لگیں۔

پھر اُن کے پیٹ میں ذلیل کیچوؤں نے، اُن کا کھانا ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا، اور بددل ہو کر گڈھے کو پاٹنے لگا۔

چھوٹے ماموں نالی پر جا کر بیٹھ گئے، باہر گلی میں ایک ساتھ نہ جانے کتنے کتّے بھونک رہے تھے۔ دور کہیں سے بھیانک اور غیر انسانی آوازوں میں مذہبی نعرے سنائی دے جاتے تھے۔

کبھی کبھی اکا دکا فائر یا گولہ چھوٹنے کی آواز بھی آتی اور آسمان کے مغربی گوشے میں ایک چمکدار سی روشنی پھیل جاتی۔ پھر ایک ساتھ کئی پولیس کی گاڑیاں سائرن دیتی ہوئی گزر گئیں۔

''ماحول بگڑ رہا ہے، اللہ خیر۔'' ریحانہ پھوپھی پلنگ پر لیٹے لیٹے بڑبڑائیں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ رات گزر چکی تھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ میرا سر درد کر رہا تھا اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں دالان میں پڑے چھپر کھٹ پر جا کر لیٹ گیا۔ بدن پر گرمی دانے نکل آئے تھے اور کھٹمل بھی کاٹ رہے تھے مگر نیند آ رہی تھی۔ چھوٹے ماموں کی اُبکائیوں کا میں عادی ہو گیا تھا۔ اُبکائیوں کی آوازیں کچھ دیر تک تو میرے کانوں میں آئیں۔ پھر میں گہری نیند سو گیا۔

اور یہ حقیقت تھی کہ میرے اندر ہر شے کے تئیں ایک قسم کی بے حسی پیدا ہو گئی تھی۔ میرا دل پتھر کا ہو گیا تھا یہی وہ گھر تھا جہاں میری نال گڑی تھی۔ یہ گھر جہاں اتنے افراد اور رشتے دار ایک ساتھ رہا کرتے تھے کہ اُن کے نام بھی ٹھیک ٹھیک یاد کرنا مشکل تھا۔ یہ گھر سے زیادہ ایک انجمن تھی۔ آج جب اس گھر کے تمام افراد منوں مٹی کے نیچے دفن تھے اور فقط دو انسان باقی بچے تھے، جن کی طرف موت لگاتار بڑھتی آ رہی تھی تو مجھے خود حیرت تھی کہ میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس گھر میں میری دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ میں اُکتایا اُکتایا سا تھا۔ شہر میں فساد پھیلا ہوا تھا۔ لوگوں کے ہلاک ہونے کی خبریں آ رہی تھیں۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ مگر میں اندر ہی اندر ان تمام واقعات سے لاتعلق تھا۔ ممکن ہے کہ یہ میری عمر

کا تقاضہ ہو یا میرے خوفناک بچپن کے سائے مجھے اس گھر میں سکون کے ساتھ نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔ میں اپنے گھر سے اب نکلنا چاہتا تھا۔

مگر ایک امر اور بھی تھا، کچھ نا قابلِ فہم سا اور پریشان کُن بھی۔

اکثر مجھے یہ احساس ہوتا کہ ایک دن میں یہاں شان وشوکت کے ساتھ آؤں گا۔ اُس دن یہ گھر پھر سے پوری طرح بھرا پڑا ہوگا۔ تمام افراد جو اب یہاں نہیں ہیں، وہ سب گھر میں ہوں گے۔ باورچی خانہ پھر سے آباد ہوگا۔ یہاں تک کہ میرا طوطا، سنبل اور میرا کن کٹا خرگوش بھی گھر میں موجود ہوں گے۔ تب یہاں آؤں گا۔ تب میرے یہاں آنے کے کوئی معنی ہوں گے۔ یہ میرا خود سے وعدہ تھا۔

بھلا، موت کی گھڑیاں گنتے ہوئے دو بوڑھوں کے ساتھ اس گھر میں رہتے رہنے کے کیا معنی؟

پھر ایک دن ایسا آیا جب فساد رُک گیا۔ کرفیو اُٹھا لیا گیا۔ ہر کرفیو کو ایک نہ ایک دن اُٹھنا ہی پڑتا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ امن کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے گیت گائے گئے۔ مقامی سیاسی لیڈروں کی چاندی ہوگئی۔ شہر کی فضا بحال ہوگئی، اگرچہ بہت دنوں تک سیور لائن کے پائپوں اور گڈھوں میں سے بدبو اور سڑاندھ اُٹھتی رہی۔ وہاں لاشیں سڑ رہی تھی۔ جو کئی روز تک برآمد کی جاتی رہیں۔

بڑے پیانے پر گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں، مگر وہ بچے ہی رہے۔

وہ یعنی، نابالغ مگر خطرناک بچے جن سے مسجدیں بھری رہتی تھیں۔

ایسا ہی ہوتا ہے۔ بچے ہمیشہ بچ جاتے ہیں۔ اُن پر خدا کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ چاہے وہ اصل میں خوفناک شیطان ہی کیوں نہ ہوں۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اس حقیقت کو مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔

جون کا مہینہ ختم ہوا۔ جولائی آپہنچا۔ مانسون کے بادل آتے اور بغیر برسے گزر جاتے۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل چلنے کا زمانہ آگیا تھا۔ اُنھیں دنوں مجھے معلوم ہوا کہ میرا نتیجہ آگیا ہے۔ میں نے اخبار میں اپنا رول نمبر دیکھا۔

میں نے تھرڈ ڈیوژن سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کرلیا تھا۔

اب میں نے واپس شہر جانے کی تیاریاں شروع کردیں، پہلے مجھے کالج جاکر اپنی ڈگری حاصل کرنا تھی اور اُس کے بعد۔

اس کے بعد؟

یہ تو طے تھا کہ مجھے وکالت کرنا ہے۔ فی الحال دوسروں کے مقدمے لڑنا ہیں۔ تاکہ ایک دن خود اپنی عدالت تک جانے والے دھندلے اور پُراسرار راستوں پر چل سکوں۔ خود اپنے اوپر ایک مقدمہ دائر کرسکوں اور اُس مقدمے کے داؤں پیچ بھی سمجھ سکوں جو انسان کی آنتوں پر دائر کیا گیا ہے۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ انسان کی آنتوں پر دائر کیے گئے اس پُراسرار مقدمے میں میں کس کی جانب سے وکالت کروں گا؟ اور پھر کون جانے کہ مجھے اس مقدمے میں وکیل بنایا بھی جائے گا یا نہیں۔

ہر وکیل کا یہ مقدر نہیں کہ وہ اپنے پسند کے مقدمے میں اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کرسکے۔ اپنی پسند کے قاتلوں اور مجرموں کی طرف سے وکیل صفائی بن سکے — اور مقدمہ جیتنے کے بعد مٹھائی کے ڈبے گھر لاسکے یا ہارنے کے بعد روتی شکل میں گواہوں کے ٹوٹ جانے کی رٹ لگاکر بیٹھ جائے۔

میں نے اپنا سوٹ کیس تیار کر رکھا تھا۔ میری ٹرین رات کے ٹھیک بارہ بجے چلتی تھی۔

چھوٹے ماموں کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں اور ریحانہ پھوپھی تو صبح سے ہی آنسو بہا رہی تھیں۔

''حفیظ ۔۔۔!'' چھوٹے ماموں کی آواز میں نقاہت تھی۔

''جی۔''

''آج ہی جاؤ گے؟''

''ہاں چھوٹے ماموں۔''

''میرے ساتھ ذرا اُدھر باورچی خانے کے پیچھے، پام کے درخت کے پاس چلو۔'' مجھے اس وقت چھوٹے ماموں کا کہنا کھل گیا۔ پتہ نہیں اب کیا بے پر کی اُڑائیں گے۔ میں نے سوچا۔ یہ تو بالکل ہی سنک گئے ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا لحاظ کرتے ہوئے میں اُن کے ساتھ پام کے درخت کے پاس آ گیا۔ اُسی لمحے آسمان پر گھنا کالا بادل آیا اور درخت کے پتوں کا سبز رنگ کچھ کچھ کالا سا پڑتا نظر آیا۔ ہوا تیز تھی، اس لیے میں جانتا تھا کہ یہ بادل رُکے گا نہیں، اُڑتا ہوا نکل جائے گا۔

''دیکھو، ریحانہ تو اِدھر نہیں ہے۔'' چھوٹے ماموں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے دیکھا، ریحانہ پھوپھی، اندر والے دالان میں چٹائی بچھا کر لیٹی ہوئی اونگھ رہی تھیں۔

''نہیں۔ مگر بات کیا ہے؟''

چھوٹے ماموں نے ایک ہلکی سی اُبکائی لی۔ ڈکار جیسی (یقیناً اُن کے منھ میں کھٹا پانی بھر گیا ہوگا اور اُس میں دوپہر میں کھائے گئے کوفتوں کی خوشبو یا بدبُو شامل ہوگی۔)

اُنھوں نے اپنے پاخانے کے نیفے میں اُڑسا ہوا بوسیدہ کاغذوں کا ایک پلندہ سا نکالا، پھر وہیں کچی زمین پر بیٹھ گئے۔

میں بھی بیٹھ گیا اور جھک کر ان پیلے کاغذوں کو دیکھنے لگا۔

جگہ جگہ کچھ نام لکھے تھے۔ کچھ نقشے، کچھ اشکال سی بنی ہوئی تھیں۔ جو بھی لکھا تھا وہ خطِ شکستہ میں نیزے کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ تمھارے خاندان کا شجرہ ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے دیمک لگنے سے اور ضائع ہونے سے بچایا ہے۔'' چھوٹے ماموں کی آواز کانپ رہی تھی۔

''شجرہ...؟''

''ہاں شجرہ — میں اسے اب تمھیں سونپ رہا ہوں۔ تم اب ماشاءاللہ اتنے بڑے وکیل بن چکے ہو، تم اسے سمجھ سکتے ہو۔''

''میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔ اور میرے سمجھنے سے ہوگا بھی کیا؟''

''تم اگر سمجھ لوگے تو یہ صاف ہوسکتا ہے کہ قانونی طور پر اس گھر جائداد کا وارث کون ہے؟ حالانکہ یہ معاملہ بہت اُلجھا ہوا ہے۔ اسی گھر میں اتنے رشتہ دار مل کر رہتے تھے۔ مگر گھر کا اصل مالک کون تھا، یہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ یا پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر جائداد کا بٹوارہ کیا جاتا تو ہر ایک کو شاید سوئی سوئی بھر زمین ہی نصیب ہوتی اور کچھ تو جائداد سے بے دخل ہی ہوجاتے۔''

''کیوں؟''

''میں نہیں سمجھ سکا حفیظ۔ نہیں سمجھ سکا۔ پُرانے لوگوں کو معلوم ہوگا۔ مگر اتنا مجھے علم ہے کہ خاندان میں ہر ایک بزرگ نے کم از کم تین شادیاں ضرور کی تھیں۔ اُن میں سے اکثر ایسی عورتیں تھیں جو مطلقہ یا بیوہ تھیں اور اپنی اپنی اولادیں بھی ساتھ لائی تھیں۔ آج کل کی طرح اولاد پیدا کرنے پر تو کوئی پابندی تھی نہیں، چھ سات اولادیں تو سب کی ہوا ہی کرتی تھیں۔ بہر حال یہ ساری نسل اسی اس طرح آگے بڑھتی رہی اور رشتوں کی پہچان ایک کارے وارد بن کر رہ گئی...''

''میں سمجھ گیا چھوٹے ماموں —'' میں نے اُکتا کر اُن کی بات کاٹی۔

''مختصراً یہ کہ تم اس شجرے کو سمجھ کر، جائیداد کے کاغذات تیار کروالو۔ اب تم ہی وارث ہو اس گھر کے۔''

''کیسے معلوم کہ میں ہی وارث ہوں۔ اس کا کیا ثبوت ہے؟''

پام کے درخت پر ہلکی سی بوندیں پھینکتا ہوا کالا بادل اُڑتا ہوا نکل گیا۔

''کیونکہ — میں اب چراغ سحری ہوں۔ اور تم اللہ کرے کہ سو سال جیو۔ جو زندہ رہے گا وہی تو وارث ہوگا۔''

''مگر یہ تو حصے بخرے کے بعد معلوم ہوگا کہ کون کتنے حصے کا مالک یا وارث ہے۔ ممکن ہے اس گھر پر میرا کوئی حق نہ ہوا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اگر شجرے کے بارے میں کسی کو معلوم ہو گیا تو نہ جانے کون کون سے کونوں کھدروں سے نکل نکل کر دعویدار آ ٹپکیں گے۔ کہنے کو تو یہاں سب رہتے تھے اور سب کا چولہا بھی ایک تھا۔ مگر یہ باورچی خانہ، دراصل ہمیشہ سے ایک اکھاڑہ بنا رہا ہے۔ میں نے یہاں نمک مرچ کے مسئلے پر عورتوں کو ایک دوسرے کی چوٹیاں پکڑے دیکھا ہے۔ اس باورچی خانہ نے ہی دلوں میں فرق ڈالا اور ناخن سے ناخن جدا کروا دیا۔ میں نے تو ریحانہ کو بھی نہیں بتایا ہے۔ اس کے پہلے شوہر کا ایک بیٹا زندہ ہے اور نیپال میں تجارت کرتا ہے۔'' چھوٹے ماموں نے اپنا سینہ سہلایا، اُن کا جی مالش کر رہا ہوگا۔''

میں خاموشی سے اُنھیں دیکھے جا رہا تھا۔ چھوٹے ماموں نے بے چینی کے ساتھ پھر سینہ سہلایا اور حلق تک آئی اُبکائی کو زبردستی روک کر، گھرگھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''رکھو، گڈو میاں۔ اب میں تمھیں اسے سونپ رہا ہوں۔ اُسی رازداری سے جس کے ساتھ میرے بڑے تایا نے اسے تمھاری ہی عمر میں مجھے سونپا تھا اور بڑے تایا کو اُن کے منجھلے خالو نے اور....''

چھوٹے ماموں اس مضحکہ خیز ماضی کے سلسلے کو دراز کرتے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس کا آخری سرا شاید کسی بوڑھے جھبو بندر پر ختم ہو، مجھے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی ہوا کہ چند سالوں بعد یہ گھر ایک کھنڈر بن کر بندروں کا مسکن نہ بن جائے۔

''لو گڈو میاں۔ سنبھال کر، اور چھپا کر اسے اپنے بستر بند میں رکھ لو۔ اور شہر جا کر قانونی طور پر اپنے حق میں جائداد کے کاغذات تیار کرا لو — میری زندگی میں ہی اگر یہ ہو جائے تو اچھا ہے۔'' انھوں نے پلندہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور جلدی سے جا کر نالی پر بیٹھ کر قے کرنے لگے۔

میں نے ان کاغذوں کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھا، اُن میں سے مٹی کی بو آ رہی تھی۔

شام چار بجے کے قریب، پھر ایک بھورا سا بادل آیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ قدرے خنک اور خوشگوار ہوا بھی چل نکلی۔ شاید دوپہر کا کھانا مجھے ہضم نہیں ہوا تھا۔ میں کچھ کسلمندی محسوس کر رہا تھا۔ میں باہری دالان میں پڑے ایک پرانے تخت پر جا کر لیٹ گیا۔ پھوار سے بھیگی ہوئی ہوا سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

آدھی رات میں دروازے کی کنڈی کھٹکی ہے۔ گھر میں سب سو رہے ہیں مگر پھر جاگ گئے ہیں۔ اُن سب کی زبانیں اُن کے منھ میں، اپنے ہی دانتوں کے درمیان آ کر کٹ گئی ہیں۔ سب کی ٹھوریوں پر خون بہہ رہا ہے۔ کون آیا ہے؟ میں اُٹھ کر دروازہ کھولنے جاتا ہوں۔ کون آیا ہے؟

میں نے کنڈی کھولی۔

باہر چوک میں، چاندنی رات میں بڑے ماموں کھڑے ہیں۔

اُن کے ساتھ دو لوگ اور ہیں۔

''یہ تمھارے مہمان آئے ہیں۔'' بڑے ماموں کی لاتعلق سی آواز آتی ہے۔

''بہت دیر سے گھر تلاش کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔''

''آیئے، آیئے۔'' میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُنھیں گھر میں داخل ہونے کا راستہ دیتا ہوں۔ اب گھر کے سارے لوگ اُٹھ کر دروازے میں آ گئے ہیں۔

''آؤ بھئی آؤ۔ بہت دنوں میں آئے۔'' سب لوگ مل کر مہمانوں سے کہتے ہیں۔ مہمان مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں لال کاغذ میں لپٹی ہوئی رساول کی ہانڈیاں ہیں۔ بڑے ماموں یوں ہی لاتعلق سے باہر کھڑے رہتے ہیں۔ میں بے رُخی سے دروازہ بند کر دیتا ہوں۔

پتہ نہیں وہ چلے گئے یا نہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ گھر کا پتہ بتانے کے باوجود وہ اُس گھر سے اب بہت دور نظر آتے ہیں۔ وہ الگ ہیں۔ تقریباً اجنبی، اگرچہ، غصّے، شکایت اور کسی نامعلوم مجبوری کے دُکھ کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا۔ غبار، باہر چاندنی رات میں، کواڑوں کی جھریوں سے نظر آ رہا ہے۔ اس غبار میں اُن کا خاموش سایہ آہستہ آہستہ کانپتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں، مگر مجھے پروا نہیں۔

دروازے کی چوکھٹ پر جمی ہوئی مٹی میرے پیروں کے نیچے سِسکتی ہے۔ مجھے پروا نہیں — میں گھر کے اندر لوٹ جاتا ہوں۔

''گڈو میاں، گڈو میاں اُٹھو۔ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ چھوٹے ماموں تخت کے قریب کھڑے مجھے جگا رہے تھے۔ بارش کی رم جھم رُک چکی تھی۔ ہوا بند تھی۔ آسمان پر، بادل چھٹ گئے تھے بس مغرب کی جانب، جہاں سورج ڈوبتا ہے، ایک لال بادل پھیلا ہوا تھا۔ جیسے خون میں تر ایک چادر۔

مجھے اپنے گھر سے وحشت ہونے لگی۔ گیارہ بجے مجھے یہاں سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مگر چار گھنٹے مجھ سے کاٹے نہ کٹ رہے تھے۔ میں اب یہاں نہیں رُکنا چاہتا تھا۔ میں اُس گھر میں رُک کر کیا کروں جہاں دور کے رشتہ دار مہمانوں کو، گھر تک پہنچا کر اُسی گھر کا ایک فرد گھر کی چوکھٹ سے لوٹ جاتا ہے۔ لاتعلق، بیگانہ — اُسے کوئی اندر آنے کو نہیں کہتا۔ کون ہے جو اُسے دروازے کی چوکھٹ پار کرنے سے روک دیتا ہے۔ کیا ہر مرے ہوئے شخص کی یہی تقدیر ہے کہ وہ اُن لوگوں کو اپنے گھر تک پہنچا آئے جو گھر کا پتہ پوچھتے ہوئے گلیوں گلیوں بھٹک رہے ہوں۔ زندے مُردوں کو اندر نہیں آنے دیتے۔ یہ زندوں کی مجبوری ہے اور جب تک گھر میں ایک بھی زندہ آدمی ہے، مُردے آدھی رات میں اسی طرح دروازے کی چوکھٹ پر بھٹکے ہوئے لوگوں کو پہنچا کر واپس اپنے اندھیروں میں لوٹتے رہیں گے۔

میں اُس گھر میں رہ کر کیا کروں جہاں جائداد میں مُردوں کا حصّہ نہیں ہوتا؟

مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ جلد سے جلد بھاگ جانا چاہیے۔

رات کے دس بجے میں، وہ پیلے، گلتے ہوئے کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں دبا کر چپکے سے باہر آیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ ایک دو آوارہ کتوں نے مجھے منھ اُٹھا کر دیکھا پھر بے نیاز ہو گئے۔

میں نے ہوشیاری کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھا اور پھر تیزی کے ساتھ اُس خاندانی شجرے کو سیور لائن کے پائپ میں بہت اندر تک پھینک دیا۔

مجھے کسی نے نہیں دیکھا، مجھے کچھ بھی کرتے کوئی نہیں دیکھ پاتا ہے۔ مجھے ایک مجرمانہ قسم کے فخر کا احساس ہوا۔

اب یہ شجرہ سیور لائن کے گندے، بدبودار پانی میں اسی طرح بہتا ہوا ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے گا جس طرح چھوٹے ماموں کے فضلے سے لپٹے ہوئے سفید کینچوئے، وہ منحوس کیڑے جو اُن کی ساری خوراک کو چٹ کیے جا رہے ہیں۔

رات ٹھیک گیارہ بجے میں اپنا سامان لے کر گھر سے نکلا۔

چھوٹے ماموں اپنی اُبکائیوں کے ساتھ اور ریحانہ پھوپھی اپنی ہڈیوں کی بھیانک چھن چھن کے ساتھ، مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے۔

''اب کب آنا ہوگا، گڈو میاں؟'' چھوٹے ماموں کی آواز بھر آئی۔

''جلد ہی آؤں گا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''ہاں جلد آنا اور پھر مجھے بڑے شہر لے جا کر ڈاکٹر کو بھی دکھانا۔''

''ہاں ہاں، ضرور۔''

''اب جب آؤ تو مسالے والی بریانی کا نسخہ ضرور لیتے آنا۔ وہاں کی بریانی بہت مشہور ہے۔''

''ہاں ہاں، ضرور۔''

''اور... اور رساول کی ہانڈی بھی۔''

''ہاں ہاں، ضرور۔''

''خدا حافظ۔ اللہ تمھیں اپنی امان میں رکھے۔''

ایک بار پھر میں نے بستر بند کاندھے پر رکھے ہوئے۔ اُنھیں گڈھوں اور اوبڑ کھابڑ راستوں کو پار کیا۔ آگے چل کر مجھے رکشہ مل گئی۔

میری ٹرین ٹھیک بارہ بجے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ جب تک قلعے کی ندی پار نہ ہوئی۔ مجھے بے چینی ہوتی رہی۔ اور جب ہلکی سی، مانوس گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ، ریل کے پہیے قلعے کی ندی کے چھوٹے

ے، پرانے پل پر سے گزر گئے۔ تب مجھے سکون آ گیا۔ ایسا سکون جو کبھی صدیوں بعد ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

میرے چھوٹے سے شہر کی روشنیاں اور اندھیرے دونوں تیزی کے ساتھ پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے اور اُسی تیزی کے ساتھ میں دونوں کو فراموش کرتا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد، ٹرین کی آواز مجھے لوری بن کر سلانے لگی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

میں سو گیا۔

اپنی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں نے اُس بدنام، منحوس گوتھک طرزِ تعمیر پر بنائے گئے کالج کی لال عمارت کو آخری بار دیکھا اور وہاں سے نکل کر سڑکوں پر آوارہ ٹہلنے لگا۔ ساتھیوں میں بھی وہ گرم جوشی نہیں تھی۔ مقیم علی، انیل سنگھ، اسلام صابری — راجندر کمار مصرا سب ہی کبھی نہ کبھی آکر اپنی ڈگری لے کر اور ہوسٹل چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ مگر مجھے اتنا معلوم تھا کہ علاءالدین اپنی ڈگری لینے نہیں آیا۔ حالانکہ اُس نے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ شاید بدنامی کے ڈر سے وہ کالج آکر خود ڈگری لینے نہ آنا چاہتا ہو، میں نے پہلی بار علاءالدین کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کی۔

مگر پھر جلد ہی اُسے بھول بھی گیا۔

مجھے معلوم ہے کہ میں اسی قسم کا آدمی ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی نرم جذبہ، محبت، خلوص یا رحم اور ہمدردی کے جذبات بہت کم ہی پیدا ہوتے ہیں اور اگر کبھی شاذ و نادر، غلطی سے پیدا بھی ہو جاتے ہیں تو اُن کی حیثیت اُن الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتی جو لکھ کر فوراً ہی کاٹ دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں ابھی بھی اپنی یادداشتیں اور عرضیاں وغیرہ لکھنے میں لگاتار کرتا جا رہا ہوں۔

اگرچہ میں ہمیشہ سے ایسا نہ تھا مگر بچپن کے زخم ابھی بھرے نہیں ہیں اور نہ کبھی بھریں گے۔ ان زخموں میں سیاہ اور سخت کھرنڈ کا ڈھیر جما ہوا ہے۔ کسی بھی یاد کی تیز، مجرمانہ اور فحش نوک اس کھرنڈ کو کُھرچ سکتی ہے۔ زخموں کے سوتے سوکھے نہیں ہیں۔ وہاں ابھی بہت خون جمع ہے۔

اس لیے میں دانستہ طور پر فی الحال، اس مرحلے پر یہ خطرہ اُٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اس قسم کی

یاد کو آگے کبھی بھی لکھا جا سکتا ہے۔

میں نے ضلع کچہری کے قریب ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ جہاں میں صرف رات گئے سونے کے لیے آتا۔ ایک سستے اور گندے سے ہوٹل میں کھانا کھانا شروع کر دیا۔

دن بھر میں شہر کی سڑکیں ناپتا یا پھر کچہری جا کر وکیلوں سے گپ بازی کرتا۔ زیادہ تر وکیل مکھیاں مار رہے تھے۔ وہ کچہری کے سامنے کھلے میدان میں لکڑی کی ہلتی ہوئی کرسیاں اور ٹوٹی پھوٹی میزیں ڈالے بیٹھے رہتے اور گھٹیا قسم کی پیالیوں میں، بار بار چائے پیتے جاتے۔ ان وکیلوں کو کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ وہ نہ انگریزی جانتے تھے، نہ ہندی اور نہ اُردو۔ ان سب نے وکالت کی ڈگریاں، بازار میں بکنے والی بے حد سستی کُنجیوں اور گیس پیپروں کے بل پر حاصل کی تھیں۔ یہ وکیل سے زیادہ دلال نظر آتے تھے اور ہر وقت، ہر پل، کسی نہ کسی جرم یا حادثے کے ہوتے رہنے کی دل ہی دل میں دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ یہ بڑے قابل رحم لوگ تھے مگر کسی حد تک مضحکہ خیز بھی۔ اس مضحکہ خیزی میں اُس وقت اور اضافہ ہو جاتا تھا جب وہ کالا کوٹ یا گاؤن پہن کر ہلتی اور ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے آپس میں گندی گالیوں کا تبادلہ کرتے اور بے وجہ قہقہے لگاتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے دفتر (دفتر؟) کی میز کرسی، قدرے بہتر حالت میں ہوتی۔ ان کے پاس ایک منشی یا محرر بھی ہوتا جو ایک خستہ حال ٹائپ رائٹر پر بیٹھا، فرضی حلف نامے تیار کر کے اُن پر نوٹری ٹکٹ، تھوک لگا لگا کر چسپاں کرتا رہتا۔

اس قسم کے وکیلوں کے چہرے پر ایک گھاگ قسم کی جھوٹی رعونت ہوتی اور یہ اپنی کرسی سے بار بار ادھر اُدھر اُٹھ کر جاتے اور انتہائی مصروف نظر آنے کی ناکام اداکاری کرتے۔

ساری کچہری، دیہاتیوں سے بھری ہوتی جو زمین جائداد کے بے سر پیر کے مقدمے ایک دوسرے پر نہ جانے کب سے دائر کرتے جا رہے تھے۔ مقدموں کا یہ سلسلہ کسی شیطانی آنت سے کم نہ تھا۔ یہ عجیب جگہ تھی۔ یہاں جرم اور سزا کے درمیان ایک مضبوط دیوار حائل تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دیوار کو، وکیل، منصف، گواہ یا کوئی بھی شے توڑنے سے قاصر تھی اور یہ دیوار مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے ایک دو وکیلوں سے دوستی بھی کر لی تھی۔ اور اُنہوں نے مجھے وکالت شروع کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ اُن کے خیال میں مجھے فوراً کسی پرانے اور تجربہ کار وکیل کے ساتھ بیٹھ کر وکالت کے اصل داؤں پیچ سیکھنا چاہئیں۔ یہ داؤں پیچ کالج میں نہیں سکھائے گئے تھے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کیا کروں۔ آخر مجھے اپنا پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔ بلکہ یوں کہوں تو زیادہ بہتر ہے کہ مجھے طرح طرح کے کھانے تو کھانا ہی تھے، رنگ برنگے کھانے۔ بھوک نے میری آنتوں پر بھی مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک چلتے رہنے والا مقدمہ۔

دو تین مہینے اسی چکر میں گزر گئے۔ اچانک ایک دن، مجھے علاء الدین کا ایک مختصر سا خط ملا۔ پتہ نہیں اُسے میرا پتہ کس طرح معلوم ہو گیا تھا۔ خط میں لکھا تھا:

''پیارے حفیظ!

جہاں ہو، جیسے بھی ہو، مجھے تمہارے بارے میں علم ہے۔ میں فی الحال ''آباد پور'' میں مقیم ہوں۔ میری مجبوری تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ ہر کام چھوڑ کر جلد سے جلد اس خط کے ملتے ہی فوراً آباد پور چلے آؤ۔ یہ ہم دونوں کے لیے اشد ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم پرانی دوستی کا پاس رکھو گے۔ باقی باتیں ملنے پر۔

تمہارا

علاء الدین''

میرے پاس کوئی خاص کام تو تھا نہیں، آوارہ گردی ہی کرتا پھر رہا تھا، اس لیے میں فوراً ہی آباد پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ ٹرین سے آٹھ گھنٹے کا سفر تھا۔ درمیان میں میرا اپنا شہر بھی آتا تھا۔ جہاں سے آباد پور کا فاصلہ ساڑھے چار سو کلو میٹر تھا۔ میں نے تیز گام کا ٹکٹ لیا تھا۔ یہ ٹرین میرے شہر کے اسٹیشن پر رُکتی نہیں تھی۔ تقریباً، رات ڈھائی بجے ٹرین میرے اسٹیشن سے گزر گئی۔ میں نے کھڑکی سے صرف اسٹیشن کی کچھ مدھم سی روشنیاں دیکھیں جو چھلاوے کی طرح گھنے اندھیرے میں گم ہو گئیں۔

مجھے علاء الدین کا پتہ ڈھونڈنے میں کوئی دِقت نہیں ہوئی۔ وہ ایک قیمتی فلیٹ تھا — دستک دینے پر دروازہ علاء الدین نے ہی کھولا، وہ گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے لپٹ گیا اگرچہ یہ گرم جوشی مجھے کچھ

بناوٹی سی بھی محسوس ہوئی۔

''تم آباد پور میں کیسے مقیم ہو گئے؟''

''یہی سب بتانے کے لیے تمھیں بلایا ہے حفیظ۔'' علاء الدین نے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ علاء الدین کی وہ احمقانہ ''ہو ہو، ہو ہو'' اب غائب ہو چکی ہے اور وہ کچھ معمر سا نظر آنے لگا ہے۔

پھر اُس نے کہنا شروع کیا۔

''حفیظ — اُس واقعے کی خبر نہ صرف کالج میں بلکہ آس پاس اور یہاں تک کہ میرے قصبے میں، تمام لوگوں کو لگ گئی تھی۔ ہم لوگوں کا وہاں رہنا دو بھر ہو گیا۔ تم تو جانتے ہی ہو، چھوٹے شہر کا مزاج، آخر ابّو نے اُس مکان کو فروخت کیا۔ اور یہاں آ کر اُس کی قیمت سے تین فلیٹ خرید لیے۔ ابو امی اور آپا الگ فلیٹ میں رہتے ہیں اور میں اور میرا ایک چھوٹا بھائی اس میں۔ حفیظ! اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ آبائی مکان کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ آبائی مکان میں دفن ہماری نالیں، دراصل ہمیں اپنی طرف بلاتی نہیں بلکہ ہمیں دھتکارتی ہیں۔ زمانہ بدل چکا ہے۔''

علاء الدین ایک پل کو رُکا اور مجھے یقین نہ آیا کہ یہ جملہ علاء الدین جیسے ٹھس اور بدمذاق آدمی کے منھ سے نکلا ہے۔

وہ ہلکے سے کھانسا، پھر کہا۔

''یہ بہت بڑا شہر ہے، صوبے کی راجدھانی ہے۔ یہاں ہندوستان کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی ہے، پبلک سروس کمیشن ہے اور سب سے بڑھ کر یہاں ملک کی سب سے باوقار ہائی کورٹ ہے۔ یہ شہر بہت تیزی کے ساتھ جدید طرز پر ترقی کرتا جا رہا ہے۔ یہاں زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے اور اپنا کیریئر بنانے کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ یہاں کے باشندے سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہیں۔ وہ کسی کے نجی معاملے میں دلچسپی نہیں لیتے...'' علاء الدین کہتے کہتے رُک گیا۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے، بس اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

''سگریٹ پیو گے۔'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں— کیا ہے تمھارے پاس!''

''بالکل ہے پیارے حفیظ، اب میں بھی پیتا ہوں۔'' علاء الدین نے جیب سے گولڈ فلیک کا پیکٹ نکالا۔

میں کبھی کبھار سگریٹ پی لیا کرتا ہوں۔ اس لیے کبھی پیکٹ نہیں رکھتا مگر یہ علاء الدین کیا اب باقاعدگی سے سگریٹ پینے لگا ہے؟ میں نے سوچا مگر اس سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ آخر علاء الدین کی وہ ہنسی وہ ''ہوہو، ہوہو'' کہاں چلی گئی ہے۔

جب علاء الدین سگریٹ سلگا رہا تھا، تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس معاملے میں کچا اور ناتجربہ کار ہے۔ اس پر کھانسی کا زبردست دورہ پڑا۔ اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''سوری۔'' اس نے کھانستے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، مگر مجھے کس کام سے بلایا ہے۔'' میں نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لیتے ہوئے کہا اور پھر اُس کے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

علاء الدین کچھ پل مجھے دیکھتا رہا، پھر کہا:

''حفیظ، پتہ نہیں کیوں میں نے ہمیشہ تمھاری عزت کی ہے، حالانکہ طالب علمی کے دور میں، اوپری دل سے میں نے بعض معاملات میں تمھاری مخالفت کی اور مضحکہ بھی اُڑایا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں کے مزاج اور فطرت میں کوئی ہم آہنگی بھی نہیں ہے مگر اس کے باوجود بطور ایک دوست، میں تم پر اور صرف تم پر بھروسہ کرنے اور تم سے کچھ اُمید لگانے پر مجبور ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں مگر ایسا ہی ہے۔''

''صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟'' میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''میں، میری خواہش ہے بلکہ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ میری بات ٹالو گے نہیں۔'' علاء الدین کا چہرہ کچھ سیاہ سا پڑ گیا۔

''بولو۔''

''تم، آپا سے شادی کرلو۔'' اس نے بہت تیزی سے یہ جملہ ادا کیا اور پھر اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

میں کچھ دیر تک حیرت سے گنگ رہا۔ مگر میری فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ بہت دیر تک کوئی بھی جذبہ مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا اور حیرت تو مجھے اب کسی بھی بات پر، بہت کم اور ذرا سی دیر کے لیے ہی ہوتی ہے۔ میں خود کو تاش کے ایک پتے کی مانند، سمجھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ ادھر سے اُدھر جاتا ہوا، کہیں جیت اور کہیں ہار کا ایک وسیلۂ محض۔ آسمان میں گردش کرتے ہوئے ستاروں کی چال پر، ایک بے معنی اور مضحکہ خیز سا رقص کرتا ہوا، تاش کا پتہ۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''حفیظ، میرے دوست! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' علاء الدین کی آواز بھرا گئی۔ ''یہ مجھ پر تمھارا احسانِ عظیم ہے، جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھیں ایک سے ایک لڑکی مل سکتی ہے۔ مگر ایک ایسی لڑکی سے شادی کرکے جس کی عزت لٹ چکی ہو تم ایک ایسا نیک کام کروگے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اللہ تمھیں اس کا اجر دے گا۔'' علاء الدین رو رہا تھا۔ مگر مجھے ایسی باتوں سے اُکتاہٹ ہونے لگی۔ ہمیشہ ہوتی ہے، سستی قسم کی جذباتیت میرے حواس و اعصاب کو سن کرکے رکھ دیتی ہے اور میرا دل پتھر کا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں چپ چاپ سامنے والی دیوار کو تکتا رہا جہاں ہری ترکاریوں کی تصویر والا ایک کلینڈر ٹنگا تھا اور نیچے اس کے فوائد لکھے ہوئے تھے۔

''بدلے میں تمھیں میں یا کوئی بھی کیا دے سکتا ہے مگر یہ ہے کہ اگر تم قبول کرو تو!'' علاء الدین رُک گیا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''تمھیں اپنا کیریئر بنانا ہے۔ اس چھوٹے شہر کی کچہری میں پھٹیچر قسم کے وکلا کے ساتھ پریکٹس کرنے سے لاکھ گنا بہتر رہے کہ تم یہاں، آباد پور میں، ہائی کورٹ میں پریکٹس کرو۔''

میں چپ رہا۔

''اس شہر میں ابو کی بہت بات ہے، سیاسی رسوخ بھی ہیں۔ تمھیں ایک سے بڑھ کر ایک اور اہم

ترین کیس مل سکتے ہیں— تم بہت ذہین ہو حفیظ، یہاں ذہانت کی قدر ہے۔ تم جلد ہی جج کے عہدے تک بھی پہنچ جاؤ گے اور... اور اگر تم پسند کرو تو رہنے کے لیے، یہ فلیٹ تمھارے نام لکھ دیا جائے۔''

اب علاء الدین کی باتوں سے کچھ کمینے پن کی بو آنے لگی مگر میں نے اُسے نظر انداز کر دیا۔ بلکہ معاف کر دیا۔ وہ ایک عام آدمی تھا۔

مگر میں...؟

یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ میں کیا تھا۔

وہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ میں نے شاید دوستی کی خاطر بہت بڑی قربانی دی ہے مگر دراصل ایسا تھا نہیں۔ میرے اوپر کسی بات کا کوئی اثر پڑتا ہی نہ تھا۔ میں تو اس ذلیل دنیا میں جیئے جانے کا کوئی جواز حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کھیل کو سمجھ سکوں جس نے بچپن سے ہی میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور اس طرح اپنی عدالت کی تلاش میں ایک جاسوس کتے کی طرح ہر اُس جگہ پہنچ جاؤں جہاں اُس کے ہونے کے امکانات نظر آئیں۔

میں اپنے جرم کے چہرے پر آفاقی سزا کا مکھوٹا لگا کر، اُس نادیدہ عدالت میں ایک پیچیدہ رقص کرنا چاہتا تھا۔ ایسا رقص جس کے بھاؤ اور مدرائیں انسانوں کے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔ مگر ان میں جو گہرے معنی پوشیدہ ہیں وہ اپنے آپ میں خود مکتفی ہیں انھیں انسانوں کی ضرورت نہیں۔ انھیں ضرورت ہے تو صرف میری اور اس بات کی کہ ابھی میں جیئے جاؤں۔ میری موت ٹلتی رہے۔

سو اس بات سے کیا فرق پڑتا تھا کہ میں جس سے شادی کر رہا ہوں وہ کنواری ہے یا نہیں؟ صاف بات تو یہ ہے کہ جسمانی تقاضے مجھے بھی پریشان کرتے تھے۔ ایک عورت کے جسم کی ضرورت مجھے بھی تھی، اُس عورت کے جسم سے اپنا جسم ملا کر، میں بچے پیدا کر سکتا تھا۔ گھر بسا سکتا تھا اور جیئے جانے کا جواز حاصل کر سکتا تھا۔ لمبی عمر کی توقع کر سکتا تھا ورنہ جو میرا مزاج تھا اُس کے مطابق، یہ بہت مشکل تھا کہ میں باقاعدہ طور پر منصوبہ بندی کے ساتھ کہیں شادی کرتا۔ میں تو شاید سڑکوں پر بھٹکتے بھٹکتے اور آوارہ گردی کرتے کرتے جلد ہی کہیں کُچل کر مر جاتا۔ ایک کتے کی موت۔

بہت جلد شادی ہوگئی۔ میں شادی کی تفصیلات اپنی یادداشتوں میں شامل کرنے سے کترا رہا ہوں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں اور میری انگلیاں لکھتے لکھتے تھکنے لگی ہیں۔ اگر میں واقعتاً کوئی ناول (تفریحی قسم کا سستا ناول؟) لکھ رہا ہوتا تو سب سے پہلے یہی تفصیلات لکھتا مگر میں اپنی یادداشت کی چھلنی میں کچھ کچرا بھی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ سند رہے کہ میں نے کچھ چھوڑ بھی دیا تھا جسے میں مرتے وقت اپنے ساتھ ایک راز کی مانند لے جا رہا ہوں۔ جو بھی بات میرے مقدمے سے متعلق نہیں، اس کو لکھ کر یا سنا کر میں آپ کو پریشان اور خود کو شرمندہ کیوں کروں؟

میں نے کہیں لکھا تھا کہ انجم کا رنگ پھٹے ہوئے دودھ جیسا تھا۔ اور اب آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اُس کے جسم میں سے باسی دہی کی سی بُو آتی تھی۔ وہ بہت کم ہنستی تھی۔ مگر جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بے شمار شہد کی مکھیاں بھنبھنانے لگی ہوں، ویسے بھی وہ ناک سے بولتی تھی جس کی وجہ سے اُس کے رویے میں ہر شے کے تئیں ایک لاپرواہی سی محسوس ہوتی تھی۔ میں تو یہ بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کو اپنے ساتھ ہوئے اُس بھیانک حادثے کی بھی پروا نہ تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ تو علاء الدین پریشان نظر آتا تھا۔

انجم کسی بھی قسم کی شرمندگی سے کوسوں دور تھی۔ ایسے لوگ اس دنیا میں بہتر اور کامیاب طریقے سے زندگی بسر کر جاتے ہیں، شاید اُس کی وجہ یہ ہو کہ اُن کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے، انسان کے اندر بعض چیزیں کمزور ہونے کے باعث، اُس میں دوسری بہت سی طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مجھے انجم

سے کوئی محبت نہ پہلے تھی اور نہ ہی شادی کے بعد پیدا ہو سکی۔ اگر چہ پرانے زمانے کے سادہ لوح لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اصل محبت شادی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور اُس کی انتہا یہ ہے کہ بڑھاپے میں، میاں بیوی ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایک غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہوگی کہ آخری عمر میں جب ساری دنیا، نظروں نظروں میں ہی اُن کے بڑھاپے کو دھتکارتی رہتی ہے تو ایک دوسرے کا سہارا بن جانے کے سوا اُن کے پاس اور چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے؟ یہ بس ایک فطری خود غرضی ہے۔ اس کو رومانی قالب میں ڈھالنا ایک بنیادی حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میرے حصے میں کبھی محبت آئی ہی نہیں مگر وہ جس قسم کی تھی اس کے بارے میں فی الحال گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔

پھر بھی میں اعتراف کروں گا کہ میرے دل میں کہیں دبی دبی سی یہ خواہش بھی تھی کہ کاش انجم کو مجھ سے بے پناہ محبت ہوتی اور پھر یہ بھی کہ انجم کو کم از کم میرا احسان مند ہونا چاہیے تھا۔ لیکن پھر یہ بھی سوچتا کہ میں نے اُس کے لیے کوئی "قتل" تو کیا نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ میرے لیے قتل کرنا اور احسان کرنا دونوں ہم معنی ہیں۔

وہ جن کے لیے قتل کیے گئے، انھیں کبھی اس احسان کا پتہ تک نہ چل سکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں لاپتہ ہو گیا—

مگر میری بیوی، انجم کو مجھ سے کبھی محبت نہ ہوئی۔ اس لیئے مجھے ایک قسم کی بے گھری کا احساس ہمیشہ بنا رہا۔ اُس شاندار فلیٹ میں رہنے کے باوجود، مجھے آج تک یہی لگتا رہا ہے جیسے میں، بس سڑکیں ناپتا پھر رہا ہوں یا سیور لائن کے کھلے ہوئے پائپوں سے ٹھوکریں کھا کھا کر گزر رہا ہوں، اُٹھ رہا ہوں، پھر گر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ میرا گھٹیا پن ہے۔ جب مجھے انجم سے نہ محبت تھی اور نہ اُس کے لیے کوئی رحم اور ہمدردی اور نہ ہی احترام کا جذبہ، پھر اُس سے اپنے لیے محبت کی توقع رکھنا ایک بہت ہی گھٹیا قسم کی ناانصافی تھی مگر میں اُن ناانصافیوں کے لیے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا جو میں نے دوسروں کے ساتھ کی ہیں بلکہ اُن ناانصافیوں کے لیے شرمندہ اور افسردہ رہتا ہوں جو میں نے خاموشی سے برداشت کی

ہیں۔ وکالت کی ڈگری لے کر اور قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں انصاف، سزا اور جرم وغیرہ کے بارے میں بے شمار تھیوریاں پڑھنے کے بعد بھی میرا آج تک تو اسی بات پر ایمان اور ایقان ہے کہ ناانصافی کرنے والے کو شرمندہ کرنے کے لیے پھانسی کا پھندا نہیں دینا چاہیے بلکہ اُس کے ساتھ بھی وہی ناانصافی کرنی چاہیے جو اُس نے دوسروں کے ساتھ کی۔

تو اتنا تو اطمینان بخش ہی کہا جائے گا کہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرکے ہم دونوں، بہر حال ایمانداری برت رہے تھے۔ مگر یہ دنیا ایماندار لوگوں کے خلاف ایک سازش کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ ایمانداروں کی زندگی کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیتی ہے۔ انجم کا تو مجھے پتہ نہیں، مگر میں کم از کم یہی سمجھتا ہوں کہ میری ایمانداریوں نے میری مٹی پلید کر رکھی تھی۔ دنیا کی اس کمینی سازش کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اُس نے کاکروچ پیدا کیا ہے۔ کاکروچ جو کبھی نہیں مرتا۔ کاکروچ جس میں خون نہیں ہوتا۔ کاکروچ جو ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد بھی زندہ اور صحیح و سلامت رہے گا۔ میں ایک ایسے کاکروچ کو جانتا ہوں جو پتھر کی ایک سل سے کچلے گئے سر سے نکلے خون اور بھیجے کے ریشوں کو دیکھتا ہے۔ دھڑ ادھڑ جلتے ہوئے، ایک اسٹوو پر اوپر سے گرتی ہوئی مٹی کے تیل کی دھار کو دیکھتا ہے، پھر مجھے دیکھتا ہے، میری ایمانداری پر مسکراتا ہے، مجھ پر ہنستا ہے— ہاں— یقین کیجیے، وہ مجھ پر ہنستا ہے، میرے کانوں میں اُس کی ہنسی کی آواز محفوظ ہے۔ اس ہنسی کو سن کر میں ایک وحشی گھوڑے کی مانند، بھڑک بھڑک کر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا ہوں، ہائی کورٹ میں مارا مارا پھرتا ہوں تا کہ میرے یہ بھٹکتے ڈگمگاتے ہوئے قدم مجھے اس غار تک لے جائیں جہاں میرے لیے ایک اندھیری عدالت منتظر ہے۔

میری ایمانداری، میرے احسان، میرے قتل مجھے وہاں کب لے جائیں گے؟

شادی کو چھ ماہ گزر گئے تھے مگر وقت کے گزرنے کو کاغذ پر نہیں لکھا جا سکتا۔ وقت سب سے بڑا آرٹ ہے، دنیا کے بہروپ کا بھیانک آرٹ، ہر آرٹ کو کاغذ پر اُتارا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ موسیقی تک کو لکھا جا سکتا ہے مگر وقت کو نہیں۔ وقت ایک ایسا سکہ ہے جس کے دوسری طرف دوری کا لفظ لکھا ہوا ہے مگر میرے لفظوں اور سطروں کے آپسی فاصلے سے اس دوری کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

یہاں میرا حافظہ مجبور ہے۔ وہ چاہ کر بھی یہاں اپنے آپ کو مکمل طور پر نہیں اُگل سکتا۔ کچھ بھی نہ چھپانے کے باوجود، میں وقت کے گزرنے کے احساس کو کاغذ پر نہیں لکھ سکتا۔ جس طرح نزلے جیسی عام اور معمولی بیماری کی اذیت کو نزلے کی گرفت میں آیا شخص کبھی بیان نہیں کر سکتا اور نہ ہی انسان وقت کے گزرنے کے احساس سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ نزلے کا کوئی ٹیکہ آج تک ایجاد نہ ہو سکا۔

اُس شام علاء الدین ہم لوگوں سے ملنے گھر آیا۔ انجم نے اُسے رات کے کھانے کے لیے روک لیا۔

انجم بہت پھیکا سیٹا کھانا پکاتی تھی۔ مرچ مصالے کے بغیر کسی بھی کھانے کی کوئی اوقات نہیں ہوتی ہے۔ تام چینی کے سفید پیالوں میں انجم کے ہاتھ کا پکایا ہوا شوربہ اتنا بدرنگ اور خوشبوؤں سے عاری ہوتا کہ آنتیں ناراض ہو کر، اپنا کام پہلے سے ہی کرنا بند کر دیتیں۔ منھ میں پانی تو دور، زبان اور تالو اتنے خشک ہو جاتے کہ میں اپنے آپ کو ایک ایسا چور سمجھنے لگتا، جس کو اپنی چوری کا پردہ فاش ہو جانے کا خوف ہوا اور اُس کے منھ کا لعاب سوکھ گیا ہو، جبکہ اُس سے سوکھا آٹا نگلنے کو کہا جا رہا ہو۔

انجم جب بھی باورچی خانے میں کھانا پکاتی تو وہاں سے کوئی بھی اچھی بری مہک، گھر کے کسی حصے میں نہ پھیل پاتی۔ مگر اُس رات، ایک مانوس سی مہک، نہ جانے کیسے باورچی خانے کی دیواروں سے چھن کر، میری ناک کے نتھنوں تک آ پہنچی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔

میں نے نتھنے سکوڑ کر زور سے سونگھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' علاء الدین ہنسا، ''ہو ہو، ہو ہو۔''

(میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ انجم سے میری شادی ہونے کے بعد فوراً علاء الدین کی پرانی حماقت آمیز ہنسی واپس آ گئی تھی)

''کسی چیز کی مہک ہے، کیا پک رہا ہے؟'' میں نے کہا۔

اُس وقت انجم کسی کام سے کمرے میں آئی۔

''کیا پک رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سب پک چکا ہے، بس انڈے تل رہی ہوں۔'' اُس نے ناک سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔

''انڈے؟ انڈے، انڈے۔'' میرا ذہن انڈے انڈے کی گردان کرنے لگا۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا، جیسے میری کلائیوں کے بال کھڑے ہو گئے ہوں۔ جسم کے تمام مساموں میں جیسے چیونٹیاں سی کاٹنے لگیں۔ پھر لگا جیسے میری پیٹھ پر کوئی کیڑا رینگ رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر، اپنا بایاں ہاتھ پیٹھ پر لے جا کر اُسے جھٹکنا چاہا مگر تب ہی مجھے زور کا پسینہ آنے لگا۔ مئی کا مہینہ تھا۔ چھت کا پنکھا اپنی پوری رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔ پھر یہ پسینہ کیوں—؟

مگر فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا، میری عرفان و آگہی کے کنارے خطرناک حدوں تک آ پہنچے۔ وہ حدیں جہاں، خطرے کے لال بلب جلتے ہیں۔

''آج انڈے تلنے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ تمھیں کیا پریشانی ہے، تم مت کھانا۔'' انجم بد دماغی کے ساتھ لچکتی ہوئی بولی اور اس لچکنے میں اُس کے کولہے اور بھی زیادہ اندر کی طرف چلے گئے۔ جیسے کچھوے نے اپنا سر بالکل ہی اندر کر لیا ہو۔

''بات کھانے کی نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ غلط ہونے والا ہے۔ بدشگونی۔''

''انڈے تلنے سے؟'' انجم نے میرا مضحکہ اُڑایا۔

''ہاں، مگر تم لوگ نہیں سمجھو گے۔'' میرا لہجہ بھی زہر خند ہو گیا۔

''کیوں کیا تم ولی اللہ ہو، تمھیں الہام ہوتا ہے۔'' انجم غصے میں بولی اور آنکھیں سکوڑ کر میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے کٹوری میں پسی ہوئی چٹنی کی مقدار کا اندازہ لگا رہی ہو۔

اُسی وقت باورچی خانے کی الماری میں سے ایک برتن دوسرے برتن پر گرا۔

''ارے، ارے تم لوگ کیوں لڑ رہے ہو..... ہو ہو..... یہ کوئی بات ہے؟'' علاء الدین گھبرا کر زبردستی ہنستا ہوا بولا۔

''اپنے دوست سے پوچھو— انڈے پکا لیے تو کیا گناہ کر دیا میں نے۔'' انجم بے وجہ آپے سے

باہر ہونے لگی۔

''چھوڑو آپا۔۔۔ حفیظ کو کوئی وہم ہو گیا ہو گا۔''

تھوڑی دیر بعد میز پر کھانا لگ گیا۔ میں نے تلے ہوئے انڈوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کھانا ہمیشہ کی طرح بدمزہ تھا۔ میں نے بمشکل دو لقمے کھائے اور ہاتھ کھینچ لیے۔

کھانے سے فارغ ہو کر علاء الدین رخصت ہو گیا۔

میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور بالکنی میں ٹہلنے لگا۔ میرا دل وسوسوں میں گھرا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ انجم نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

علاء الدین واپس آ گیا تھا مگر اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''حفیظ۔۔۔ حفیظ۔۔۔ کہاں ہو؟''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ریڈیو آن کرو۔'' وہ کانپتی آواز میں بولا۔

''ہوا کیا؟''

''باہر سڑک پر بھیڑ اکٹھا ہے۔ ریڈیو پر خبر آئی ہے۔''

''کیا؟''

''راجیو گاندھی کا قتل ہو گیا ہے۔''

میں شاید پہلے انجم کے حلیے کے بارے میں کچھ لکھ چکا ہوں۔ شادی کے بعد، جب میں نے اُسے پہلی بار حجلۂ عروسی میں دیکھا تو اُس کی شکل وصورت یا صحت میں کوئی تبدیلی نہیں پائی۔ مگر کچھ دیر گزرنے کے بعد، جب اُس نے کوئی بات کرنے کے لیے منھ کھولا (مجھے یاد نہیں کہ کیا بات تھی، ظاہر ہے کوئی معمولی بات ہی رہی ہوگی) تو مجھے اُس میں ایک بدنما تبدیلی کا احساس ہوا۔ جب میں نے غور کیا تو پایا کہ اُس کا، آگے کا ایک نچلا دانت آدھا ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ پہلے تو نہ تھا۔

ممکن ہے کہ یہ دانت اُس وقت ٹوٹا ہو جب کالج کی کینٹین میں اُس کی بھیانک عصمت دری کی گئی تھی۔

اس آدھے ٹوٹے دانت کی وجہ سے انجم کے چہرے کی بے رحمی کچھ اور بڑھ گئی ہے اور میں نے بارہا یہ سوچا ہے کہ اُس سے کہوں گا کہ یا تو وہ اس دانت کو پورا نکلوا دے یا پھر اس کی جگہ ایک نقلی دانت لگوالے۔ خالی جگہوں میں اتنا بھیانک پن نہیں ہوتا کیونکہ وہاں ہوا کا گزر رہتا ہے۔ مگر آدھی ادھوری اشیا اپنے آپ میں خوفناک حد تک پُراسرار ہوتی ہیں اور اُن کے بارے میں کچھ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ آدھی ادھوری ہونے میں ہی اس دنیا کی تمام ہولناکی اور سفاکی پوشیدہ ہے۔ اس کی جگہ، ایک خالی دنیا یقیناً بہتر اور کسی حد تک خوبصورت نظر آتی۔

مگر ان چیزوں سے جنسی شہوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شہوت ہر معاملے سے بے نیاز ہے۔ محبت سے بھی، اور نفرت سے بھی۔ کراہیت کا تو خیر اُس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے انجم کے

ساتھ مباشرت کرنے میں، اُس کا یہ آدھا ٹوٹا دانت کبھی میرے آڑے نہ آسکا۔ جبکہ ان مواقع پر۔ انجم کا منھ، پوری طرح کھل جاتا تھا اور یہ آدھا ٹوٹا دانت جس پر پیلے چونے کی ایک تہہ جم گئی تھی، اُس کے جسم پر جھکے، میرے بدمست چہرے کو لگاتار کینہ توز نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔

کچھ نہیں ہوتا، یقین کیجیے کچھ نہیں ہوتا، عورت کے جسم کے بارے میں جو لن ترانیاں کی جاتی ہیں اُن سب کی حیثیت بکواس کے سوا کچھ نہیں۔ عورت کے جسم کے نشیب وفراز، اُس کی گولائیاں، اُس کے لمس یہ سب، افواہوں کے سوا کچھ نہیں۔ جو سب سے زیادہ تو شاعروں اور ادیبوں نے پھیلائی ہیں تا کہ مرد عورت کے ذہن پر ہمیشہ حکمرانی کر سکے۔ شاعروں اور ادیبوں نے عورت کے خلاف زبردست سازش رچی ہے۔ جتنا زیادہ وہ عورت بلکہ عورت کے جسم کے بارے میں قصیدے پڑھتے جاتے ہیں، اتنا ہی عورت کی روح کی بوٹیاں بوٹیاں کرتے جاتے ہیں۔ آخر جوڑا تو خدانے کا کروچ تک کا بنایا ہے مگر یہ خطرناک سازش جو انسان نے اپنی مادہ کے ساتھ رچی ہے، اُس کی دوسری مثال دنیا کی کسی دوسری مخلوق میں نہیں ملے گی۔

عورت اور مرد کے جسم ایک دوسرے کے لیے دسترخوان پر سجے ہوئے کھانے ہیں، جنھیں دیکھ یا سونگھ کر محض اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ بھوک کا احساس ہونے لگتا ہے مگر بھوک یا اشتہا کا تعلق تو مرد یا عورت کے اپنے خون اور اپنی ہی آنتوں سے ہوتا ہے۔ ذائقہ بھی خود اُس کے ہی منھ میں یا زبان کا محتاج ہے اور خوشبو اُس کے اپنی ناک کے نتھنوں پر ہی منحصر ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر کھایا کیا جاتا ہے؟ دسترخوان پر پالتی مار کر، بیٹھا جاتا ہے یا اُکڑوں بیٹھ کر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پیٹ بھر کھا لینے کے بعد کی ڈکار میں ہی ساری جمالیات کی پول کھل جاتی ہے۔

عورت کے جسم وجلد کے لیے پھول، کلی، گندھا ہوا آٹا، مکھن ملائی جیسی تشبیہات کے بے معنی ہونے کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ میں نے لوگوں کو لوہے کے سخت وسیاہ کھمبے سے اپنے بدن کے نچلے حصے کو رگڑتے، لطف اُٹھاتے اور سیّال ہونے کی اُسی منزل تک پہنچتے دیکھا ہے جہاں وہ عورت کے جسم سے اپنے جسم کو رگڑتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں اور پھر مضحکہ خیز حد تک قابلِ رحم نظر آنے لگتے ہیں۔

پھر بے چاری عورت کے جسم کی حیثیت ہی کیا تھی۔ سب کچھ تو سراب تھا، یا محض ہوا۔ ٹھوس تو بس ایک نقطہ تھا اور وہاں تک پہنچنے میں نہ تو انجم کا آدھا ٹوٹا دانت روک سکتا تھا اور نہ اُس کے اندر کی جانب چھپے ہوئے کولہے اور نہ اُس کی شہد کی مکھی جیسی بھنبھنی ہنسی، کچھ نہیں۔۔۔ سب اپنی ہی ہوا میں جھومتے ہیں، اور اپنے ہی خون سے کشید کی ہوئی شراب پیتے ہیں۔

میں تو یقیناً یہی کر رہا تھا اور انجم بھی غالباً یہی کر رہی تھی۔

اور یہ سب تھا کیا؟

چوبیس گھنٹوں میں، کبھی ایک دیوانے مگر ناگزیر لمحے میں، دو لڑھکتے ہوئے وحشی اور خالی برتن ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور گھٹیا قسم کی تشدد آمیز آوازیں نکالتے ہوئے ایک دوسرے کو چوٹیں پہنچاتے ہوئے، رگڑتے ہوئے کسی نادیدہ سالن سے، اپنے آپ کو لبالب بھر لینا چاہتے ہیں اور انجام کار، تھک کر، اپنے اپنے خالی پن کو دوبارہ اپنا مقدر سمجھ کر، ایک کونے میں، اُداس اور اُکتائے ہوئے خاموش پڑ جاتے ہیں۔

انجم میری آنتوں کا سارا کھانا ہڑپ کر لینا چاہتی ہے اور میں اُس کی آنتوں میں ایک سانپ کی طرح داخل ہو کر، اپنی زبان سے وہاں سب کچھ چاٹ لینا چاہتا ہوں۔ انجم مجھ سے وہی سلوک کرتی ہے جو وہ باورچی خانے میں گندے برتن مانجھتے وقت کرتی ہے اور میں اُسے کھانے کی وہ رکابی سمجھتا ہوں جسے زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کیا جاتا ہے۔

یہ محبت نہیں۔۔۔ یہ مباشرت ہے۔ جس کی اپنی قواعد ہے اور اپنی ریاضی ہے۔ یہ محبت سے زیادہ ایماندار مگر ایک بھیانک مغالطے کی شکار ہے۔ محبت ایک خیال، ایک لفظ اور دھند میں لپٹا ہوا استعارہ ہے۔ محبت کے ہاتھ پاؤں اور پستان نہیں ہوتے اور اگر محبت کے گردے، کلیجی ہوتے ہیں تو وہ انھیں باہر نکال کر قربان کر دیتی ہے جبکہ مباشرت، ریاضی کا ایک ایماندارانہ ہندسہ ہے۔ مگر جس کا مغالطہ اُس کے حاصل پر مبنی ہے۔ حاصل جو ایک صفر محض کے سوا کچھ نہیں۔

مگر ٹھہریے اس سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک نہ ہوگا کہ میرے حصے میں کبھی محبت آئی ہی نہیں۔ میں نے

اپنے بہی کھاتے میں کہیں پر پھیکی روشنائی سے محبت کا اندراج بھی کیا ہے اور اب جبکہ آپ سب میرے بچپن کی اُلٹی سیدھی داستان پڑھ ہی چکے ہیں، تو آپ کو علم ہو چکا ہوگا کہ جب جب محبت میرے حصے میں آئی تو وہ ایک کرکری محبت تھی۔ چاولوں کے ساتھ ریت کے باریک ترین اجزا اور ننھے ننھے کنکر باہر سے اُڑ کر نہیں آئے تھے، بلکہ یہ تو اُس محبت کے اندر سے ہی پیدا ہوئے تھے، اُمس اور سیلن کے کسی مخصوص لمحے میں پیدا کسی پُراسرار جراثیم کے ذریعے۔

اب کچھ نہ ہو سکتا تھا، چاول پیٹ میں جا چکے تھے۔ دانت ریت کے ذرّات سے کرکراتے تھے اور ننھے ننھے کنکر دانتوں کے درمیان کی خالی جگہ میں بھر کر، اُنھیں سڑائے دیتے تھے۔ دانت دُکھتے تھے۔ بڑی طرح دُکھتے تھے

میرا دل دُکھنے لگا، زخم پر سے تھوڑا سا کھرنڈ کھرچ گیا۔ اتنے بڑے بڑے دھبے، اتنے بڑے بڑے دھبے۔

میری ذہنی رو بہک گئی، مجھے معروضیت سے کام لینا چاہیے، مگر کبھی کبھی، آدمی چاہ کر بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ میں یہ عریضے لکھتے ہوئے کبھی کبھی ایک نادیدہ دباؤ کا احساس کرنے لگتا ہوں اور میرے وجود میں سے ایک گاڑھا اندھیرا باہر آنے لگتا ہے۔ جس طرح ایک وزنی پیر کے بے رحم دباؤ سے کچھوئے کی گردن باہر نکل آتی ہے، آپ کو کچھوئے کو معاف کرنا پڑے گا۔

ایک دوسرے کے تئیں جنسی مباشرت میں ایماندار ہونے کے لیے باورچی خانے اور طرح طرح کے عجیب وغریب کھانوں کا وجود ہونا بھی ضروری تھا—

انجم باقاعدہ، منصوبہ بندی کے ساتھ، چند مخصوص اشیا مجھے کھلانے پلانے کا پورا اہتمام کرتی۔ اُسے میری پسند یا ناپسند کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ مجھے بھر پیٹ روٹی ملی یا نہیں، اُسے پتہ بھی نہ چلتا— میں ہائی کورٹ کے چکر لگا کر اور بے روزگاری سے تنگ آکر، کتنا پریشان، تھکا تھکا اور کمزور رہنے لگا تھا اُسے اس کی کبھی کوئی فکر نہ تھی۔ اُسے میرے لیے چائے بنانے میں بھی دِقّت ہوتی اور میرے سگریٹ

پینے پر تو وہ آفت ہی برپا کر دیتی تھی۔

مگر چند مخصوص اشیا ایسی تھیں جو وہ مجھے پابندی سے کھلانا نہ بھولتی۔ یہ چیزیں شادی سے پہلے میں نے کبھی چکھی بھی نہ تھیں۔ مثلاً رات کو چھوہارے، دودھ میں بھگو دیے جاتے اور صبح ناشتے میں مجھے انھیں کھانا پڑتا۔ چھوہاروں کے سخت ریشے میرے دانتوں کی خلا میں پھنس جاتے اور کئی گھنٹے تک دباں سخت درد رہتا۔ یا پھر اُرد کی دھلی دال پانی میں بھگوئی جاتی اور مجھے اُسے کچا کھانا پڑتا۔ دودھ اور بادام وغیرہ بھی مجھے زہر مار کرنا پڑتے اور چونکہ مجھے بچپن سے ہی دودھ کبھی ہضم نہیں ہوتا ہے اس لیے لگاتار میرا پیٹ خراب رہنے لگا۔

دراصل یہ کھانے مردانہ جنسی طاقت اور شہوت بڑھانے میں بہت کارگر ثابت ہوتے تھے۔ میرا دل تو کبھی کبھی بالکل نہ چاہتا مگر میری بیوی یعنی انجم، خوب لڑنے جھگڑنے کے باوجود اس معاملے میں بڑی فراخدل تھی اور خدا گواہ ہے کہ آج تک اُس نے اپنی کوئی بھی رات کالی نہ ہونے دی۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ میں رات کو دیر سے گھر آیا، سردیاں تھیں۔

''جب اتنی رات کو باہر سے گھوم کر آتے ہو تو کبھی کبھی وہ بھی لے آیا کرو۔'' انجم مصنوعی طور پر اِٹھلائی اور آنکھیں سکوڑ لیں۔

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے وہی جو بڑے بازار والی سڑک پر رات کو ٹھیلے پر بکتا ہے۔''

''کیا—؟ مجھے نہیں معلوم۔''

''شکیلہ بتا رہی تھی— اُس کا میاں تو روز کام سے لوٹتے وقت لے کر آتا ہے۔'' انجم نے اب اپنے ہونٹ بھی دائرے کی شکل میں گول گول کر لیے۔

''کیا لے کر آتا ہے؟ بتاؤ تو۔'' مجھے جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔

''مجھے شرم آتی ہے۔'' انجم میری طرف سے پیٹھ کر کے کھڑی ہوگئی۔ مجھے ذرا دیر سے سمجھ میں آیا مگر بہرحال میں سمجھ تو ہر بات جاتا ہوں۔

''حلوہ پلنگ توڑ؟'' میں نے سردمہری سے پوچھا۔

"ہاں۔" انجم یہ کہہ کر ہنسنے لگی اور ہر طرف شہد کی مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

"مجھے کیا ضرورت ہے اُس کی، ہاں مزے کے لیے کھایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔" اچانک انجم پلٹی اور میرے گالوں پر بڑھے ہوئے میرے شیو پر پیار سے اپنی انگلیاں پھیرنے لگی۔ "سب کہتے ہیں کہ اُس کے کھانے سے لڑکا پیدا ہوتا ہے۔"

"تمھیں پتہ نہیں، حفیظ! آج کل تم کمزور ہو گئے ہو۔" انجم میرے اوپر روغنِ قاز مل رہی تھی۔

پھر اُس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں چولہے پر رکھا کوئی برتن ہوں جس میں آہستہ آہستہ گوشت اُبل رہا ہو۔

میں خاموشی سے ہاتھ منھ دھونے غسل خانے کی طرف چل دیا۔ ادھر کچھ دنوں سے مجھے برابر یہ احساس ہو رہا تھا کہ انجم کی مجھ سے تشفی نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی لاوا ہے جو لگاتار بڑھ رہا ہے اور کھول رہا ہے، اس لاوے نے اُس کی کھال کو سُن کر دیا ہے یا یہ کہ اجتماعی عصمت دری کے بعد وہ نفسیاتی طور پر اذیت پسند ہو گئی ہے۔ اور میرے اندر، رام گنگا کی کھادر میں رہنے والے خطرناک بدمعاشوں اور اُن کے دوڑتے ہوئے وحشی گھوڑوں کو محسوس کرنا چاہتی ہے۔

مگر خود میرا یہ محسوس کرنا بھی ایک قسم کا کمینہ پن ہے۔ مجھے اپنے اس گھٹیا خیال پر اندر ہی اندر بے حد شرمندگی بھی ہوتی، جس سے بچنے کے لیے میں، اپنے آپ میں انجم کے تئیں محبت کی ایک رمق پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگتا۔ کاش کہ کھانے نہ ہوتے، تب شاید دنیا میں خالص محبت کا وجود ہوتا مگر یہ کم بخت کھانے، جو باورچی خانے میں تیار ہوتے ہیں اور باورچی خانہ جو گھر کا سب سے خطرناک مقام ہے۔ ان کھانوں کی تباہ کاریاں کوئی مجھ سے پوچھے۔ یہ کھانے جو زندگی جیسی گھٹیا شے کو پائیدار بنانے کا خطرناک فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ کھانے جو جنسی شہوت بڑھاتے ہیں۔ آدم اور حوا کو بہکاتے ہیں اور ہبوطِ آدم کا سبب بنتے ہیں۔ یہ کھانے جو لڑکا پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں، لڑکے جو بڑے ہو کر رام گنگا کی کھادروں سے گھوڑوں پر سوار نکل کر آتے ہیں اور اپنی ماں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت دری کرتے پھرتے ہیں۔ مگر انجم کچھ نہیں سمجھتی۔ کیوں نہیں سمجھتی؟ یہ کھانے جو پیٹ میں کیڑوں اور آنتوں میں گندے، بدبودار فضلے کی جڑ ہیں۔

اور — میں، میں خود ایک زہریلے دودھ کی چائے کا کیا دھرا بھگت رہا ہوں۔ میں خود زہریلا ہو چکا ہوں — میرے اندر وہ خطرناک صلاحیت ہے جس کے بارے میں انجم کچھ نہیں جانتی۔ میں ان کھانوں کی خطرناک علامتیں جانتا ہوں۔ انجم کچھ نہیں جانتی۔ وہ نہیں جانتی کہ میرے اندر رام گنگا کی کھادر میں روپوش بدمعاشوں اور اُن کے گھوڑوں سے کہیں زیادہ طاقت ہے۔ میں انجم کے ساتھ ایک ایسی مباشرت بھی کرسکتا ہوں جس سے اُس کا سر پاش پاش ہوکر، پتھر کی ایک سل پر بکھر جائے۔ انجم کچھ نہیں جانتی وہ صرف خواہش سے مغلوب ہے اور میں پرانے کالک زدہ باورچی خانے میں رہنے والے ایک کاکروچ ہے۔

شادی کے دوسال بعد انجم حاملہ ہوئی۔ پہلا مہینہ تھا۔ میں اپنے اندر ایک ناقابل فہم قسم کی نرمی محسوس کرنے لگا۔ انجم کا چہرہ، اچانک مجھے بہت معصوم اور پاکیزہ نظر آنے لگا۔ جس دن مجھے یہ خوش خبری ملی تھی، اُس دن پہلی بار مجھے شاید عورت مرد کے جسمانی ملاپ کی معنویت اور وقار کا بھی احساس ہوا تھا۔

وہ پورا دن میں نے ہائی کورٹ میں مٹھائیاں اور مٹریاں کھا کھا کر کاٹا۔ پتہ نہیں کیوں تمام دن میرے کان میں ایک بچّی کی توتلی آواز آتی رہی۔ پاپا۔ پاپا۔ میرے پاپا۔ میری روح پاک صاف ہونے لگی۔ مجھے جلدی سے گھر پہنچنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ شام کو گھر آتے ہی میں سیدھا باورچی خانے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ عام طور سے باورچی خانے میں ہی ہوتی تھی۔ حالانکہ اُسے باورچی خانہ نہ کہہ کر اگر ''کچن'' کہا جائے تو بہتر ہے، یہاں گیس کا چولہا تھا اور پانی کی سپلائی بھی۔ کھانا پکانے میں معاون جدید مشینی اشیا بھی تھیں۔ یہاں نہ کوئی کالک تھی اور نہ گندگی۔ نہ مسالہ پیسنے والی سل اور نہ ہاون دستہ۔ چوہے یا چھپکلی وغیرہ ہوں تو ہوں ورنہ مجھے کبھی کوئی کیڑا مکوڑا تک نہیں نظر آیا۔ ویسے بھی باورچی خانہ کسی ایک عورت سے مکمل نہیں ہوتا۔ انجم کو صفائی کا گویا خبط تھا۔ وہ پورے گھر میں صبح وشام پونچھا لگوایا کرتی تھی۔ مجال ہے کہ گھر کے کسی کونے میں دھول یا مکڑی کا معمولی سا جالا بھی نظر آجائے۔ باورچی خانے کی صفائی تو تقریباً ہر وقت ہوتی رہتی۔ صفائی پر اتنا زیادہ زور بھی ایک قسم کا تشدد ہی ہے۔ اس لیے اس کچن کا کوئی بھی تعلق باورچی خانے کی قدیم اور پُراسرار روایت سے قائم کر پانا مشکل تھا پھر بھی عادتاً اور کچھ ضرورتاً میں انجم کے کچن کو باورچی خانہ ہی لکھوں گا، تاکہ آگے چل کر

میرے مقدمے میں اس لفظ سے کوئی الجھاوا نہ پیدا ہو سکے، جس کا فائدہ کوئی دلال قسم کا وکیل اُٹھا سکے۔ آخر مجھے یہ تو ہر وقت یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، وہ یادداشت پر مبنی اپیلیں یا عرضیاں ہیں۔

میں باورچی خانے میں جا کر چپکے سے انجم کو پیچھے سے اپنے بازوؤں میں بھر لینا چاہتا تھا۔ آج تو میں اس کے آدھے ٹوٹے ہوئے دانت تک پر بوسہ ثبت کر سکتا تھا۔

مگر باورچی خانہ خالی تھا۔

میں واپس مڑا اور اندر والے کمرے میں آیا۔

انجم بستر پر چت لیٹی ہوئی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

میں مسکراتا ہوا وہیں پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

''اچھا ہے تم آرام کیا کرو اور دیکھو کوئی بوجھ وغیرہ مت اُٹھانا۔''

''بوجھ؟''

''ہاں جیسے پانی سے بھری بالٹی یا کوئی وزنی میز اور کرسی وغیرہ۔''

''کیوں؟''

اتنا بھی نہیں جانتیں۔ میں خوش دلی سے مسکرایا۔

''ہمارے آنے والے بچّے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

وہ کچھ نہ بولی اور میری طرف سے کروٹ لے لی۔

''کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں کمزوری محسوس کر رہی ہوں، اُٹھوں گی نہیں، تم چائے بنا کر خود پی لو۔''

''تم نے صفائی کرتے وقت کوئی بوجھ تو نہیں اُٹھالیا۔'' میں فکر مند ہو کر بولا۔

اچانک انجم ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ذرا سی دیر خاموش پڑے نہیں دیکھ سکتے۔ دماغ چاٹے جا رہے ہو۔ میں ڈاکٹر رنجنا کے یہاں

سے آرہی ہوں۔''

انجم نے بدمزاجی کے ساتھ جواب دیا۔

''کیوں؟ ابھی سے کیوں؟ خیریت تو ہے؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میں صفائی کرواکے آرہی ہوں۔'' وہ مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''صفائی؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''مطلب، ابارشن۔ سنا تم نے، میں نے ابارشن کروایا ہے۔''

وہ اچانک پھٹ پڑی۔ شہد کی مکھی کا چھتہ سا ٹوٹ کر گرا۔

اس کی ستواں بے رحم ناک سے پانی نکل رہا تھا اور اُس کا آدھا ٹوٹا ہوا دانت جھپٹ کر جیسے میرا خون پی جانے کے لیے تیار تھا۔

مغرب کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے شیشے اچانک لال ہوگئے۔ پورے کمرے میں ایک خوفناک سرخی رینگنے لگی۔

دور بہت دور آسمان میں، سورج خون خون ہوکر ڈوب گیا۔ مغرب کی اذان ہوئی۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

میں نے خود کو برسوں کا بیمار محسوس کیا۔ ایک بھیانک اور نامعلوم تھکن کے بوجھ سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میرے جسم میں میرے خون نے گردش کرنا بند کردیا۔

میرا سر چکرا رہا تھا؟ نہیں، شاید مجھے نیند آرہی تھی۔

یا میں مرنے والا تھا؟ میرے جسم کا ایک ٹکڑا مر چکا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالا۔ زبردستی آنکھیں کھولتے ہوئے میں نے آہستہ سے ایک ٹھنڈی اور مُردہ آواز میں پوچھا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟''

''کیونکہ بچہ لڑکی تھا۔ میں نے بچّے کی جنس کی شناخت کا ٹیسٹ کروایا تھا۔''

''مجھے لڑکی نہیں چاہیے، لڑکا چاہیے۔''

''کیوں؟'' میں اپنے جسم کی ساری بچی ہوئی طاقت کو اکٹھا کرتے ہوئے چیخا۔

''بس میری مرضی۔ لڑکوں کی ماں بننا فخر کی بات ہوتی ہے۔ میں کوئی چوہیا نہیں پیدا کرنا چاہتی۔'' وہ انتہائی بے رحم ہو کر بولی۔

''شرم نہیں آتی ذلیل عورت۔ میری اجازت کے بغیر...'' میں کانپتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''شرم تمھیں آنی چاہیے، نامرد۔ تمھاری کمی ہے، تم مجھے لڑکا نہ دے سکے۔''

''مگر مجھے بیٹی چاہیے تھی۔ ننھی منی، معصوم بیٹی۔ میرا خون، میرے جگر کا ٹکڑا۔''

نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد، آج میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''میں عورت ہوں، بچّہ پیدا کرنا یا نہ کرنا میرا حق ہے اور میرے اختیار میں ہے۔ اوّل تو میں ابھی اس جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتی، اور اگر پڑوں گی بھی تو لڑکے کے لیے۔ میں مضبوط، کڑیل جوان بیٹوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ میں نے یہ ٹیسٹ دو دن پہلے ہی کروالیا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ لڑکی ہے تو پہلے تو گھر میں، میں نے ڈھیر سی اجوائن پھانکی، چار کچے انڈے نگل گئی اور پانی سے بھری بالٹی بھی غسل خانے میں ادھر اُدھر رکھی، مگر — کچھ نہ ہوا۔ کم بخت بہت ڈھیٹ اور سخت جان تھی۔ آخر مجھے صفائی ہی کرانا پڑی۔''

ایک عرصے بعد، پھر میرے اندر وہ خطرناک، بے حد طاقت ور سایہ طویل القامت ہو کر میرے جسم کے کنارے سے باہر نکلنے کو تیار ہوا، میں انجم کا قتل کر دینا چاہتا تھا۔ میرے پیر قتل کے ارادے کو بھانپ گئے تھے اور کپکپانے لگے تھے۔ مگر ٹھیک اُسی وقت، میرے کان میں پھر وہی توتلی، معصوم آواز آئی۔ مگر اس بار بہت دور سے۔

''پاپا — پاپا — میرے پاپا۔''

باہر زور کی ہوا چل نکلی۔ پت جھڑ کا موسم تھا۔ میرے دل نے ایک ساتھ بہت سے پتّوں کے گرنے کی آواز سنی۔

اُس عورت کی بے شرمی سے، میرا اپنا سر جھک کر ینے پر ڈھلک آیا۔ وہ طویل القامت سایہ نقطے میں سمٹ کر میرے اندر کہیں گم ہو گیا۔

دور— کہیں تخت اُٹھ رہا تھا۔ میں نے ماتمی باجے سنے۔ محرم کی سات تاریخ تھی۔

میں شاید گھسٹتا ہوا کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر، میں نے بے وجہ ایک بار مڑ کر دیکھا۔ انجم اپنی سفید شلوار دُرست کر رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ پھر اس نے روئی کا ایک بڑا اور موٹا سا ٹکڑا اُٹھایا۔

میری بوجھل آنکھوں تک نے واضح طور پر دیکھ لیا۔ اُس کی شلوار پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔

''اتنے بڑے بڑے دھبے، اتنے بڑے بڑے دھبے۔''

میں سڑک پر نکل آیا۔ بجلی کے کھمبے روشن ہو گئے تھے۔ میرے جوتوں کے نیچے پتے کچل رہے تھے، پتوں کا زرد مُردہ خون جوتوں میں چپکنے لگا۔ یوں ہی بغیر کسی سمت اور ارادے کے، میں اپنے شل پیروں کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔

یوں ہی، بے وجہ میں نے آسمان کی جانب نظر اُٹھائی۔ اکا دکا تارے نکل آئے تھے۔ سورج ڈوبے بہت دیر نہ ہوئی تھی۔ ایک افسردہ سی، مدھم پڑتی ہوئی شفق نے چاند کے آدھے حصے کو ڈھک رکھا تھا۔

آدھے کٹے ہوئے چاند پر خون جم گیا تھا۔

محرم کے تخت اُٹھ رہے تھے۔ ماتمی باجوں کی دُھن پر دھول بھرے جوتوں میں بند میرے سُوجے ہوئے پیر نوحہ کرتے ہوئے، آگے بڑھ رہے تھے۔

چلتے چلتے میں شاہرہ پر نکل آیا۔

''یا حسین، یا حسین، یا حسین۔'' سامنے چھریوں سے ماتم کرتے ہوئے سیاہ کپڑوں میں ملبوس افراد کا ایک بھاری جلوس جا رہا تھا۔ وہ حسین کے غم میں گریہ وزاری کرتے ہوئے اور اپنے سینے پر

چھریاں مارتے ہوئے، ماتم کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے سینے خون سے تر بتر تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ ماتم دیکھا تھا۔ میں دیوانہ وار جھپٹ کر اس ماتمی جلوس میں شامل ہو گیا اور پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتے ہوئے بھیڑ میں چلنے لگا۔

زمانہ بہت تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا۔ ملک میں نئی معاشی پالیسیوں کا دور دورہ تھا۔ بازار کی معاشیات نے فلاحی معاشیات کو گزرے زمانے کا واقعہ بنا کر رکھ دیا۔ ملک میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اپنے برانڈ لے کر چیونٹیوں کی طرح گھس آئیں۔ سرکاری نوکریاں تقریباً ختم ہی ہو کر رہ گئیں۔ میڈیکل، انجینئرنگ اور مینجمنٹ کے پرائیویٹ کالج سینٹروں کی تعداد میں دکانوں کی صورت کھلنے لگے۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ امیر بے حد امیر ہوتے جا رہے تھے اور غریب بے حد غریب۔

ٹیلی ویژن کے نجی چینل کیا کھلے، متوسط طبقہ آپے سے باہر ہو گیا اور اُس کے احساس کمتری سے صارفیت، عریانی اور فحاشی کا گویا ایک سیلاب ہی اُمنڈ آیا۔ سب اس سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔

اسی زمانے میں بابری مسجد شہید ہوئی۔ ملک گیر فسادات کا سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ جب فسادات پر قابو پا لیا گیا تو ایک نیا مسئلہ درپیش تھا۔ مذہبی شدت پسندی اور کٹر پن نے نئی نسل کا دماغ خراب کر کے رکھ دیا۔ نئی نسل میں مذہبی دہشت گردوں کی تشکیل ہونے لگی۔ ٹانگ برابر کا لونڈا اپنے ماں باپ کو مذہبی یا شرعی احکام کے پورا نہ کرنے پر واجب القتل ٹھہرا رہا تھا۔ رہی سہی کسر نئی ٹیکنالوجی نے پوری کر دی۔ موبائل فون، انٹرنیٹ، فیس بک، ٹویٹر، سب پر نفرت کا بازار گرم ہونے لگا۔ دنیا چھوٹی ہو کر ایک گاؤں میں بدل گئی۔ ایک ایسا گاؤں جس میں ہمہ وقت نفرت، آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اور سب ماڈرن بننے کے شوق میں اس کھیل میں شریک تھے۔

دوسری طرف بھوک کے مارے ہوئے غریب کسان خودکشی کر رہے تھے اور ٹی وی پر ایک ملٹی نیشنل کاسمٹک کمپنی کا فیشن شو دکھایا جا رہا تھا۔ جس میں تقریباً عریاں لڑکیاں شہوانی انداز میں بلّی کی چال چلتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی تھیں اور واپس آتی تھیں۔

فلمیں بے ہودہ سے بے ہودہ ہوتی جاتی تھیں۔ راجیش کھنہ کا زمانہ تو نہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ امیتابھ بچن کا کچھ غنیمت زمانہ بھی ختم ہوا۔ موسیقی بے ہنگم شور میں بدل رہی تھی۔ ناچنا بلکہ کولہے مٹکانا گویا ایک مذہبی فریضہ بن گیا تھا۔ ٹی وی اور سنیما دیکھ دیکھ کر ہر شخص بلکہ دودھ پیتا بچہ بھی ناچنے کو تیار تھا۔ وہ سب اس طرح اُچھل کود کر رہے تھے، جیسے اُن کی پتلونوں میں بھڑیں گھس گئی ہوں۔

آرٹ پر تو اتنا برا وقت پہلے کبھی نہ پڑا تھا اور اتنے سہل پسند سطحی اور برے قاری اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے گئے تھے۔ انھیں ہر چیز پلیٹ میں رکھ کر دینا پڑتی تھی۔ وہ ننگے چاکلیٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ (ایک بچہ تک چاکلیٹ کا ریپر پھاڑنے کی زحمت کر کے اُس میں سے چاکلیٹ نکال کر کھاتا تھا) مگر اس زمانے کے قاری، آرٹ سے اُس کا لباس اُتروانے کے درپے تھے۔ جس طرح وہ ٹی وی سیریل کی فحاشیوں اور فیشن شو میں ننگی لڑکیوں کے جسم کے عادی تھے۔ انھیں کسی بھی قسم کے آرٹ میں ابہام پسند نہ تھا۔ وہ دراصل صرف گھٹیا اخباروں کی سنسنی خیز خبروں کے قاری تھے۔

ٹی وی چینلوں کے ذریعہ بازار گھر میں چلا آیا تھا اور بازاری زبان ''لنگوا فرینکا'' بن چکی تھی۔ مذہب تک اس بازار سے اچھوتا نہ رہ سکا تھا۔ مذہبی چینل کھل گئے تھے اور وظیفوں، استخاروں، تنتر منتر، جیوتش اور دعاؤں اور تعویذوں کی دوکانیں اپنا اپنا مال بیچ رہی تھیں۔ سیاسی قسم کے مذہبی مقرروں کو کسی مسجد، مندر یا پنڈال کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہر گھر میں چلے آئے تھے۔ ہر طرف سودا بک رہا تھا۔ دوسری طرف تہذیبوں کے تصادم کا نعرہ بلند ہو کر دنیا کا دل دہلائے دیتا تھا۔

بہت پہلے کبھی، 'خدا کی موت' کا اعلان ہوا تھا مگر اب ادیب کی موت، سرد جنگ کی موت اور یہاں تک کہ تاریخ کی موت کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا۔ بس 'انسان کی موت' کا اعلان ہونا ابھی باقی تھا۔ مگر وہ تو شاید بہت پہلے ہی واقع ہو چکی تھی اور انسان کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

مجھے اس پر کوئی حیرت نہ تھی کہ میں اتنی اموات کے بعد بھی بہر حال زندہ تھا۔ میں اور وہ سب جو ساٹھ کی دہائی میں پیدا ہوئے، وہ اس مضحکہ خیز تباہی کے عینی شاہد ہیں۔ اُن کا بچپن کسی دوسرے سیارے پر گزرا تھا اور اُن کی تقدیر میں جا کر مرنا تھا کسی دوسرے سیارے پر۔ ساٹھ کی دہائی کے سب لوگوں نے ان دونوں سیاروں کو ایک دوسرے سے ٹکراتے دیکھا ہے۔ وہ پرانے اور نئے دونوں کے گواہ

ہیں۔ کسی بھی دوسری نسل نے زمانے کو اتنی بھیانک تیز رفتاری کے ساتھ تبدیل ہوتے نہیں دیکھا ہوگا۔

ایک ٹرین میں آگ لگی اور ملک کے ایک صوبے میں ایک خاص فرقے کا قتل عام ہوتا رہا۔ قاتلوں کو ملک وقوم کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔

ایک زمانے میں، صرف اخبار ہوتے تھے، اب 'میڈیا' نام کی ایک شے پیدا ہوگئی تھی۔ پتہ نہیں میڈیا کس چڑیا کا نام ہے؟ بہرحال یہ شے، ہر سنجیدہ معاملے کو ایک ''پروڈکٹ'' ایک برانڈ میں بدل ڈالتی تھی۔ یہ کسی بھی چیز کے پیچھے اس قدر رفاشیت اور بے رحمی کے ساتھ پڑ جاتی تھی کہ اُس کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیتی تھی۔

مجھے تو خیر کبھی بھی محبت نام کی شے، خالص شکل میں نہ مل سکی تھی، مگر اس زمانے کے لوگ محبت کے نہیں، محبت بنانے یعنی Love Making کے قائل تھے۔ وہ محبت کو کھانے کی طرح پکاتے تھے اور پھر کھا جاتے تھے۔ اُن کے دل نے اُن کی آنتوں کے راستے، اُتر کر ان کے پوشیدہ اعضاء میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

گذشتہ بیس برسوں میں اتنی زہریلی ہوائیں چلی ہیں کہ سب انسان مجھے نیلے نیلے نظر آتے ہیں۔

میں ان زہریلی ہواؤں میں زندہ ہوں اور ہائی کورٹ میں ایک آدھ مقدمہ لڑ لیتا ہوں۔ اُسے بھی ہار جاتا ہوں، پھر یوں ہی اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہوں۔ میری وہ خطرناک صلاحیت اب کبھی کبھی ہی سامنے آتی ہے۔ مثلاً ریحانہ پھوپھی کی سنوائی آئی، مگر کسی کھانے نے مجھے خبردار نہیں کیا، محلے میں سامنے رہنے والے، بشیر احمد نے دوسرا خط لکھا۔ چھوٹے ماموں مر گئے۔ مگر کوئی کھانا پکتا دیکھ کر میں چونکا نہیں۔ مجھے اِن دونوں اموات کا کوئی افسوس نہیں ہوا، بلکہ ایک قسم کی بے فکری ہی محسوس کی۔

شاید، میری صلاحیت اس لیے سوگئی تھی کہ ان دو اموات کی اہمیت ہی میرے لیے کیا تھی۔ کہ شاید یہ میرے لیے حادثے نہ ہو کر، روزمرّہ کے واقعات تھے۔

مگر ریحانہ پھوپھی اور چھوٹے ماموں کی موت کے بعد، ایک تبدیلی ضرور میرے اندر آئی تھی۔ اب مجھے گھر کی یاد آنے لگی۔ کیونکہ اب وہاں کوئی بھی زندہ نہ بچا تھا۔ میں جو مذہبی آدمی کبھی نہ رہا، اور

نہ ہوں، مگر اپنے گھر کے بزرگوں کی روایات کو قائم رکھنے کا ایک بے تکا سا جذبہ میرے باطن میں پرورش پانے لگا۔

میں نے فاتحہ دینا سیکھ لیا۔ میں گھر میں، ہر جمعرات کو فاتحہ دینے لگا اور محرم، چہلم، گیارہویں، بارہ وفات اور شب برات کے موقعوں پر نیاز نذر بھی کرنے لگا۔ مجھے کچھ انجان سی چیزیں کھو جانے کا احساس ستانے لگا۔ نیاز، نذر اور فاتحہ وغیرہ سے، میں اپنی کھوئی ہوئی چیزیں دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

بشیر احمد کے خطوط بار بار مجھے ملتے رہتے تھے، جن میں یہ اصرار ہوتا تھا کہ میں ایک بار آکر اپنا گھر دیکھ جاؤں جو کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ یا تو اُس کی مرمت کروالوں اور اُسے کرائے پر اُٹھوادوں یا پھر اُسے فروخت کردوں، جس کے مجھے بہت اچھے پیسے مل سکتے تھے۔

مگر میں ہر بار بشیر احمد کے خط پڑھ کر پھاڑ دیتا۔ میں گھر تو گھر، بزرگوں کی قبر پر بھی کبھی فاتحہ پڑھنے نہیں گیا اور نہ ہی مجھے اس پر کوئی افسوس ہوا کہ میں چھوٹے ماموں تک کا منہ نہ دیکھ سکا اور نہ ہی اُن کے جنازے میں شرکت کر کے قبرستان تک نہ جا سکا۔

ایسا نہیں کہ میں گھر جانا نہیں چاہتا تھا مگر یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا۔

دیکھیے، مجھے احساس ہے کہ اوپر جو بھی میں نے لکھا ہے وہ بس ایک بیورے کی شکل میں ہے۔ زمانے کی تبدیلی اور خود اپنی تبدیلی کو میں بغیر کسی پیچیدگی کے لکھنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری اپیل میں ان چیزوں کی بہت اہمیت ہوگی۔ آخر زمانے کی تبدیلی اور خود میری تبدیلی کا نوٹس تو عدالت کو لینا ہی پڑے گا۔ جب اخلاقیات بدلتی ہے، قدریں بدلتی ہیں، لوگ بدلتے ہیں، دل بدلتا ہے تو جھولتے ہوئے پھانسی کے پھندے کا رُخ بھی بدلتا ہے۔ پھانسی کے پھندے کو بھی ہوا کے رُخ سے مفر ممکن نہیں۔

اگرچہ میں نے ایل.ایل.بی. تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا ہے مگر اپنی عدالت کے راستے پر میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ میں نے زمانے کی کمینگی اور خود اپنی کمینگی کو ایک دوسرے کے متوازی رکھ دیا ہے۔ دو متوازی لکیریں!

ہم دونوں اپنی اپنی زندگی جیئے جاتے ہیں۔

بس فرق یہ ہے کہ مجھے مرنے سے پہلے اپنی عدالت میں جانا ہے اور یہ نہ ہو سکا تو مرنے کے بعد بھی۔

اور زمانہ —؟

وہ تو روز اپنی عدالت لگاتا ہے، اور برخواست کرتا ہے۔ زمانہ ازلی اور ابدی ہے۔ اُسے موت کے ہجے تک نہیں معلوم جبکہ میری ساری جنگ ہی اپنی موت سے ہے۔ میں اگر ابدی نیند سو گیا تو میری عدالت ہمیشہ کے لیے مجھ سے گم ہو جائے گی۔

کسی نے کہا تھا ''تم ایک ہی ندی میں دو بار نہیں نہا سکتے۔'' سب کو پتہ ہے کہ انسان کے جسم کا خون چار مہینے میں بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ جسم کے اندر خون کے نئے خلیے بن رہے ہیں اور پرانے ٹوٹ کر غائب ہو رہے ہیں۔

زمانہ کیا، انسان کیا، چرند و پرند کیا، یہاں تک کہ بے جان اشیاء بھی کیا، سب تبدیلی کے پراسرار عمل سے سہمے ہوئے ہیں۔ اس لیئے لاکھ تہیہ کرنے کے باوجود کہ انجم سے اب میرا جسمانی ملاپ کبھی نہ ہوگا، پتہ نہیں کب، یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ ممکن ہے کہ ساتھ ساتھ رہتے رہنے کی وجہ سے یہ ہوا ہو۔ اگر اُس ابارشن کے بعد میں انجم کا ساتھ چھوڑ دیتا تو یہ ممکن بھی ہوتا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ ایسی بات نہیں کہ اس میں میری کسی غرض یا بزدلی کا ہاتھ تھا بلکہ میں تو اصل میں اُس نفرت کو اور گہرا کرنا چاہتا تھا جو مجھے انجم سے ہو گئی تھی۔ محبت ہو یا نفرت، اس معاملے میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ رہنے سے، اور قربت سے ہی بڑھتے ہیں۔ میں اپنی نفرت کو ببول کے ایک سوکھے کانٹے دار درخت میں بدل دینا چاہتا تھا۔ اس ببول کے کانٹوں کی خراشیں میں اپنے دل پر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ صرف نفرت کی ان خراشوں سے ہی مجھے کچھ سکون مل سکتا تھا، بس اسی لیے میں انجم کے ساتھ اُس گھر میں اسی طرح رہا، جیسے پہلے تھا۔

جب آپ کسی کام میں مشغول ہوں، مثلاً کچھ لکھ رہے ہوں یا پڑھ رہے ہوں یا ٹی وی ہی کیوں نہ دیکھ رہے ہوں اور آپ کے سامنے، میز پر یا بستر کے کنارے پر، ایک کٹوری میں مونگ پھلی میں دانے یا بھنے ہوئے چنے رکھے ہوں تو بغیر کسی منصوبہ بندی کے، یا ارادے کے، آپ بیچ بیچ میں انھیں ٹونگ

ہی لیتے ہیں، بالکل اسی طرح۔ ہاں، بالکل اسی طرح میں انجم سے کبھی کبھی مباشرت کرلیا کرتا۔ مگر یقین کیجیے کہ یہ ایک تبدیل شدہ مباشرت تھی۔ اس میں نہ محبت شامل تھی، نہ ہوس اور نہ شہوانیت۔ اس میں نہ کوئی جوش تھا اور نہ جذبہ۔ یہ تو مشت زنی سے بھی بدتر تھی۔ یہ محض ایک اضطراری فعل تھا۔ پلکیں جھپکانے کے مترادف یا یوں ہی بے وجہ پیر ہلانے کے مترادف۔ یہ مباشرت نہ ہوکر، مباشرت کی ایک بھونڈی نقل تھی۔

مگر ہوتا یہ تھا کہ ایسی ہر مباشرت کے بعد میرے سارے وجود پر نفرت کا غلیظ اور خطرناک سایہ چھا جاتا تھا۔ میرے دل پر ببول کے کانٹوں کی خراشیں اور گہری ہو جاتی تھیں۔ مجھے انجم سے ہی نہیں، خود سے بھی نفرت ہونے لگتی تھی اور سب سے زیادہ تو اپنے جسم کے پوشیدہ اعضا سے۔

میں خود پر لعنت بھیجتا تھا اور ہر لعنت کی گونج انجم کی بے رحم اندام نہانی میں جاکر غائب ہو جاتی تھی۔

انھیں اضطراری مباشرتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ انجم پھر حاملہ ہوئی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا اور اُس کے سوا سال بعد، دوسرے بیٹے کو۔

دوسرے بیٹے کے جنم کے بعد، انجم نے میری پروا کرنا قطعی بند کردیا۔ رسمی طور پر بھی وہ میری طرف بہت کم متوجہ ہوتی۔ دو دو بیٹوں کی ماں بننے کے بعد، اُس کا چہرہ گھٹیا قسم کی رعونت سے بھر گیا۔ اس کے کولہے اب جاکر کچھ باہر کو اُبھرے مگر اس کی چھاتیاں میلے کپڑوں کی دو دھجیوں کی طرح لٹکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اُس کی آواز کچھ بھاری ہوگئی، شہد کی مکھیوں کا پیٹ، پھولوں کے رس سے بھر گیا۔ اس کے آدھے ٹوٹے دانت پر، ایک کالا سا نقطہ نمایاں ہوگیا۔ اس نے مجھ سے مباشرت کرنی بند کردی۔ اچھا ہوا مجھے اس ذلیل کام سے نجات ملی۔

میرے بستر پر، اب مونگ پھلی کے دانوں سے بھری کوئی کٹوری نہیں تھی۔

مگر اس قدر لاتعلقی کے باوجود ہمارے آپسی جھگڑے ہونا بند نہ ہوئے۔

جہاں تک میرا سوال ہے، مجھے بدمزہ کھانوں سے نفرت ہے۔

انجم کے ہاتھ کے پکائے گئے کھانوں کو کوئی جہنم میں ہی بیٹھ کر زہر مار کر سکتا ہے۔ گرم مسالے تو وہ کسی چیز میں ڈالتی ہی نہیں اور شوربے کو خوبصورت بنانے کے لیے وہ ایسی سرخ مرچ، بازار سے ڈھونڈ کر لاتی تھی جن میں صرف رنگ ہی ہوتا — وہ محض مردہ مرچیں ہوتیں، نمائشی اور مصنوعی مرچیں۔

افسوس مجھے چٹ پٹے کھانوں کی لت تھی۔ انجم کی آنتوں میں تیزابیت رہی ہوگی مگر میری آنتیں قطعی طور پر صحت مند تھیں۔ اتنی صحت مند کہ اگر کبھی ان پر کوئی مقدمہ چلا اور میری آنتوں کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی تو یہ سزا پل بھر کے لیے بھی ٹل نہیں سکتی۔ کوئی ڈاکٹر ان کا معائنہ کر کے یہ رپورٹ نہیں دے سکتا کہ آنتیں فی الحال بیمار ہیں اس لیے ابھی انھیں پھانسی نہیں دی جا سکتی۔

میں بیماروں کے لیے پکائے گئے ان کھانوں سے چڑ کر اُسے خوب کھری کھوٹی سناتا اور وہ ترکی بہ ترکی مجھے جواب دیتی۔

یا پھر، یہ کہ میں ہر جمعرات کو پابندی کے ساتھ، نیاز، نذر اور فاتحہ وغیرہ دیتا اور جمعرات کو گھر میں گوشت پکائے جانے کی تاکید کرتا۔ انجم یہ سب پسند نہیں کرتی، وہ بھی مجبور ہے۔ وہ دوسرے مسلک کی ہے۔ انجم کو جانوروں کے گوشت سے کوئی دلچسپی نہیں، اُسے گوشت دھونا اچھا نہیں لگتا، کراہیت ہوتی ہے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ انجم کو صفائی کا خبط ہے۔ وہ کسی بھی چیز کی صفائی کر سکتی ہے۔ اور میں تھا کہ میرے جوتے، جب بھی باہر سے گھر میں آتے تو اُن کی گندگی کی شان دیکھتے ہی بنتی۔

یا تو مجھے سڑک پر چلنے کی تمیز ہی نہ تھی یا پھر میں لاشعوری طور پر گندے راستوں سے ہی ہو کر نکلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ میرے جوتوں کے تلے میں کیلے کے چھلکے، سڑی ہوئی سبزیوں کے ٹکڑے، کیچڑ، کوڑے کے ڈھیر میں بجبجاتے ہوئے کیڑے مکوڑے، سڑی ہوئی اوجھڑیاں، مٹھائیوں، بسکٹوں اور نمکینوں کے ریپر اور ردّی کاغذوں کے ٹکڑے چپک کر گھر میں آ جاتے۔

آپ کو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے، ہمارے ملک کے ہر بڑے شہر کی سڑکیں اسی قسم کی چیزوں سے پٹی رہتی ہیں۔

اور یہ بھی کہ میرے مقدمے کی سنوائی کے وقت ان تمام باتوں کو جو کچھ دیر پہلے میں نے لکھی

ہیں، یعنی دو تین صفحات پہلے، ہلکے پن سے مت لیجیے گا، ان باتوں کو اُکتاہٹ کی وجہ سے، میں نے سرسری طور پر لکھ دیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بہت سنجیدہ اور گمبھیر باتیں ہیں۔ انھیں اگر نظرانداز کر دیا جائے گا تو اس سے بڑی ناانصافی میرے ساتھ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

''جوتے باہر اُتارا کرو۔'' وہ چیخ کر کہتی۔ ''تب گھر میں آیا کرو۔''

''نہیں اُتاروں گا، جو جی چاہے کر لو۔'' میں اطمینان سے جواب دیتا۔

''گھر میں گندگی آتی ہے۔'' وہ اور زور سے گلا پھاڑتی۔

''وہ تو پہلے سے ہی ہے۔'' میں اور بھی اطمینان سے جواب دیتا۔

میرا اطمینان میری نفرت کا عطیہ ہے۔ اگر میری نفرت اتنی گھنی، دبیز اور دور اندیش نہ ہوتی تو غصے سے بے قابو ہو کر نہ جانے کب کا میں نے اُسے قتل کر دیا ہوتا۔ میرے لیے قتل کرنا اور مکھی اُڑانا برابر ہیں۔

میرے سکون اور اطمینان سے چڑ کر، وہ تقریباً پاگل ہی ہو جاتی اور اپنے سر کے بال نوچنے لگتی۔ اُس کے سر کے بال ویسے ہی اب گرنے لگے تھے۔ صفائی کرتے وقت گھر میں جگہ جگہ اُس کے بالوں کے گچھے نکل آتے۔ کونوں کھدروں میں ہوا کے ذریعہ پہنچے ہوئے، میں اُن بالوں کے گچھوں کو تھتھکارتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔

''دیکھنا، دیکھنا، بس میرے بیٹے بڑے ہو جائیں بس اُسی دن کی خاطر گزارہ کر رہی ہوں، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔'' وہ چیخ چیخ کر دھمکی دیتی۔

''کیا یہ صرف تمھارے بیٹے ہیں؟'' میں مصنوعی طور پر ہنستے ہوئے کہتا۔ وہ میرے اس ہنسنے پر، اور بھی زور زور سے چلّانے لگتی— دونوں بچے— اس شورِ قیامت سے سہم کر رونے لگتے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ میرے بیٹے تھے، میرے خون کی اُچھال۔

یہ ٹھیک ہے کہ انجم کا دیا ہوا وہ زخم بھرنے کے بجائے، بڑھ کر اب میری نفرت کے برابر کا ہو گیا تھا۔ انجم جس سے میری نفرت بڑھتے بڑھتے ببول کا کانٹے دار درخت بن چکی تھی۔ اور اگرچہ ببول کے

پیڑ کو پانی تک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے مگر پھر بھی، میں اپنے حافظے کے خون اور اپنی کمینگی کی زہریلی کھاد سے اگا تار اُسے سینچ رہا تھا۔

مگر یہ دونوں تو معصوم تھے اور اپنی مرضی سے دنیا میں نہیں آئے تھے۔ یہ بھی میرے بچّے تھے۔ میں اپنے زخم کا بدلہ ان سے کیا لوں؟ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ پھر بھی میں اُن سے بہت زیادہ محبت نہیں کر پایا۔ میں تو خود کو باپ بننے کی مسرت اور فخر سے بھی سرشار نہ کر سکا۔ اس کی کوئی وجہ ہوگی مگر ابھی فی الحال مجھے نہیں پتہ۔ ہاں! یہ احساس اکثر ان دونوں کو دیکھ کر مجھے ضرور ہوتا تھا کہ ان بچّوں میں ننانوے فی صد حصّہ انجم کا تھا اور محض ایک فی صد حصّہ میرا۔

کبھی کبھی اگر کسی بچّے کو میں گود میں لینے کی کوشش کرتا تو انجم ایسا نہ کرنے دیتی۔

''اُتارو گود سے۔ گود کی عادت مت ڈالو۔ اُتارو—'' وہ بدمزاجی کے ساتھ کہتی۔ ''ویسے بھی تمھارے ہاتھوں کا کوئی بھروسہ نہیں، پتہ نہیں، کیا کیا، اَلَم غلَم چھو کر آئے ہوگے۔''

میں بے دلی کے ساتھ بچّے کو گود سے اُتار دیتا۔ اور مزے کی بات یہ کہ دونوں بچّے بھی، میری گود میں آنے کو کبھی نہ ہمکے۔

وقت، ہاں پھر وہی وقت۔ وقت کا ذکر کیے بنا چارہ نہیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ بڑا بیٹا چھ سال کا ہو چکا تھا۔ دونوں اسکول جاتے تھے۔ علاء الدین اور انجم کے باپ کی وجہ سے مجھے کچھ کیس ملنے لگے، مگر میں ہر مقدمہ ہار جاتا۔ اس سے وکیل کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ تو اپنی فیس بہرحال پہلے ہی وصول کر چکا ہے۔

میرا دھندہ بھی چل رہا تھا۔ میں نے ایک منشی یعنی محرر بھی رکھ لیا تھا۔ جو اکثر مجھ سے میری ان یادداشتوں کے بارے میں سوال کرتا رہتا ہے اور مجھے یہ تجویز بھی دیتا رہتا ہے کہ کیوں نہ میں اُس سے یہ یادداشتیں لکھواؤں حالانکہ وہ خود زیادہ تر اونگھتا رہتا ہے۔ اتنا پیسہ مل جاتا تھا کہ اپنی زندگی بغیر کسی کا محتاج بنے بسر کر سکوں۔ انجم اور بچّوں کے خرچ کی مجھے پرواہ نہیں تھی۔ اُن دونوں کی کفالت تو علاء الدین یا انجم کے مائیکے والے کر رہے تھے۔ وہاں پیسے کی ریل پیل تھی۔ اور علاء الدین کا شمار تو شہر

کے سب سے بڑے وکلا میں ہونے لگا تھا۔ اس نے آج تک کوئی مقدمہ ہارا ہی نہیں۔ وہ اس فن کا ماہر ہے۔ وہ عدالت میں گرگٹ کی مانند رنگ بدلتا ہے۔ لہجہ تبدیل کرتا ہے۔ وہ جب چاہے ''ہوہو۔ ہوہو'' کی احمقانہ ہنسی ہنس سکتا ہے اور جب چاہے اُسے ترک کر سکتا ہے۔ علاء الدین مجسّم عقل ہے۔ اُس میں اضطراری حرکت جیسی کسی شے کا وجود نہیں۔ پہلے وہ جرم کو گز سے ناپتا ہے، پھر مجرم یا مؤکل کو۔۔۔ اُس کے بعد سزا کی ساری سرحدوں سے مجرم کی مقامی دوری کو ناپتا ہے۔ اور تب بڑے اطمینان کے ساتھ عدالت میں، بے گناہوں کا سر کچل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ بے گناہوں کو ایسی موت مارتا ہے کہ انھیں پانی بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔
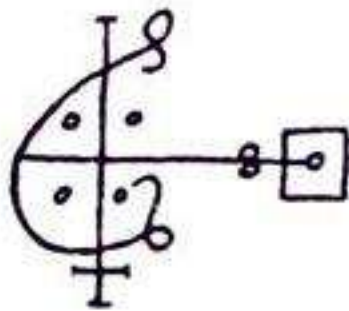
ایک شام علاء الدین میرے گھر آیا۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ ڈبلا پتلا اور زرد رنگت والا تقریباً میرا ہی ہم عمر۔ وہ ستمبر کا مہینہ تھا، جب نزلے زکام جیسی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔ اگر بارش ہوتی ہے تو سیلاب آجاتے ہیں۔ ورنہ نزلے۔ اُس شخص کو نزلہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک گندا سا رومال ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ بار بار اُس کی ناک سے شوں شوں کی آواز نکلتی اور وہ رومال سے ناک اور آنکھوں سے بہتے پانی کو صاف کرنے لگتا۔

''انھیں جانتے ہو؟'' علاء الدین نے زرد رنگت والے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے غور سے اُس شخص کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی پانی بھری، گدلی آنکھوں میں عجب وحشت تھی، جیسے وہاں کیکڑے تیر رہے ہوں۔

''ان کا نام نریندر کمار ہے۔ ھو۔ ھو۔''

میں کچھ نہ بولا۔

''تمھیں ان کا مقدمہ لڑنا ہے۔ میں کسی وجہ سے ان کا کیس نہیں لڑ سکتا۔ مگر تمھیں سارے داؤں پیچ سکھادوں گا۔ یقین کرو۔ ھو۔ ھو۔ حفیظ! انکار مت کرنا، یہ تمھیں منھ مانگی فیس دیں گے۔''

میں کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

''ان کا جرم کیا ہے؟''

'جرم — ھو۔ ھو۔ جرم انھوں نے ابھی کیا نہیں ہے، مگر جلد ہی کرنے والے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' مجھے حیرت زدہ ہونا پڑا۔
''نریندر صاحب آپ ہی وکیل صاحب کو بتایئے۔'' علاء الدین بولا۔
''میں ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔'' نریندر سرد آواز میں بولا۔
میں نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز اور لہجہ میری آواز اور میرے لہجے سے مماثل ہیں۔
''آپ کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟''
''اُس نے میری محبوبہ کی عصمت دری کی ہے ...شوں شوں۔'' نریندر نے رومال سے ناک پونچھی۔
مجھے اپنے اندر ایک زلزلہ سا آتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے کرسی کا ہتھا مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

''آپ کس طرح یہ قتل کریں گے۔'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔
''میں یا تو موقع پانے پر کہیں پتھر سے اُس کا سر کچل دوں گا یا اُس کے گھر میں آگ لگا دوں گا۔ گولی، چاقو یا زہر وغیرہ کا استعمال میں نہیں کرنا چاہتا۔ میں اُسے بے حد تشدد کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' نریندر کی آواز میں ایک جانی پہچانی سی بے رحمی تھی۔ اس نے اُسی بے رحمی کے ساتھ پھر کہا۔
''میں دو دن کے اندر اندر یہ کر گزروں گا۔ اس کے بعد موقع ملنا دشوار ہے۔ اب آپ بتایئے وکیل صاحب آپ مجھے کس طرح بچائیں گے؟ ممکن ہے کہ میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاؤں۔''
میرے جسم میں کھسکنے والی چٹانیں اپنی جگہ پر آگئیں اور میں نے بے حد اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔
''آپ کی جگہ عدالت میں، کٹہرے میں، میں کھڑا ہو جاؤں گا۔''
میری آواز ہو بہو اُس کی آواز کی نقل تھی۔ ویسے مجھے ہمزاد پر یقین نہیں لیکن یہ شخص اگر میرا ہمزاد نہیں تو اور کون تھا؟
''آپ میرا مضحکہ اُڑا رہے ہیں۔ وکیل صاحب۔ شوں شوں'' نریندر کی پانی بھری آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی۔

''نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کی جگہ پھانسی کا پھندا میں اپنے گلے میں ڈالوں گا۔''

''حفیظ — کیا کہہ رہے ہو۔ ھو۔ ھو۔ یہ مذاق کا وقت نہیں۔'' علاء الدین گھبرا گیا۔

''علاء الدین، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر سزا ہمیشہ لاوارثوں کی طرح خلا میں بھٹکتی پھرتی ہے، وہ کسی کو بھی مل جائے۔ کوئی بھی اُس کا وارث بن جائے۔ سزا کو اس سے کیا سروکار۔ اُسے تو کسی کے جسم میں رہنے کے لیے ایک ٹھکانہ چاہیے۔ وہ نریندر صاحب کا جسم ہو یا میرا۔ بے چاری، بے گھر سزا کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔''

اچانک نریندر شوں شوں کرتا ہوا کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور علاء الدین کی طرف دیکھتے ہوئے، غصّے کے ساتھ کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ میرا مذاق اُڑانے اور وقت برباد کرانے کے لیے مجھے یہاں لائے تھے۔ ایک پاگل وکیل کے پاس۔''

''سنیے تو — سنیے تو — نریندر جی! آپ جا کہاں رہے ہیں۔'' علاء الدین نریندر کی طرف تیزی سے جھپٹا جو اُٹھ کر باہر جا رہا تھا۔

''آپ کو اگر رقم کم لگ رہی تھی تو بتاتے۔'' نریندر کا لہجہ بلند ہو گیا۔

''ارے یہ بات نہیں۔ ھو۔ ھو۔ دراصل آپ سمجھے نہیں۔ ھو۔ ھو۔'' علاء الدین کچھ بات بنانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

نریندر نے غصّے اور ناراضگی کے ساتھ ہم دونوں کی جانب دیکھا۔

پھر اُس کا منھ آدھا کھل گیا۔ اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُسے ایک زبردست چھینک آئی، جس سے نکلی چند باریک بوندیں میرے منھ پر پڑیں۔

وہ زور زور سے پیر پٹکتا اور شوں شوں کی آوازیں نکالتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

علاء الدین احمقوں کی طرح انجم کو دیکھنے لگا جو ایک ٹرے میں چائے کی پیالیاں لیے ہوئی آ رہی تھی۔

پھر علاء الدین نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''حفیظ — تم نے جو تھوڑا بہت فلسفہ پڑھا ہے۔ وہ تمھیں برباد کر کے رکھ دے گا۔ تم اس سے فلسفہ بگھار رہے تھے یا واقعی سنجیدہ نہیں تھے؟''

''میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ سنجیدہ اور ہوش مند کبھی نہ تھا۔'' میں نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تمھارا دماغ واقعی چل گیا ہے۔ تمھیں پتہ نہیں نریندر کتنا بڑا اور دولت مند آدمی ہے۔ اس کا کیس لے کر تمھارے سارے دلدّر دور ہو جاتے۔''

''تم کیس کی بات کر رہے ہو، میں تو اُس کا جرم لے رہا تھا۔''

''تم پاگل ہو، دیکھو حفیظ! تمھارے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک میں نے تمھارے بیوی بچوں کو کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ وہ عیش کر رہے ہیں، مگر بیوی بچوں کو اصل خوشی اُسی وقت ملتی ہے جب مرد دولت کما کر گھر میں لائے۔''

''اب تم میں مجھ سے ایسی باتیں کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی علاء الدین؟''

میں نے علاء الدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سرد لہجے میں پوچھا۔

اچانک علاء الدین کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُسے میرا احسان یاد آ گیا۔

''ھو۔ھو۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ واقعی تمھاری مرضی ہے تم کوئی کیس لڑو یا نہیں۔ کوئی تمھیں مجبور نہیں کر سکتا۔ ھو۔ھو۔ مگر یار تم میں اتنی زبردست حسِ مزاح ہے، مجھے پہلے سے علم نہ تھا۔ خوب تفریح لی تم نے بے چارے کے ساتھ۔''

تب تو نہیں، مگر آج جب اپنی یادداشتوں کے سہارے، میں یہ بظاہر بے معنی سی عرض داشتیں لکھ رہا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ اگر اتنی سنجیدہ اور پُر معنی بات کو دنیا نے میری حسِ مزاح سمجھا تھا تو اِن اپیلوں کو کوئی یقیناً گھٹیا اور نا قابلِ یقین لطیفوں کا پلندہ سمجھ کر فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے، عدالت میں ان کے پرزے پرزے کر کے پھینک دے گا۔ میری تو ساری تحریر ہی اُس پوشیدہ، گہری سنجیدگی سے بھری ہوئی ہے جسے محض، ایک حسِ مزاح سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے، یا پھر اُس پر جی کھول

کر، ایک بار ہنس لیا جائے۔

مگر مجھے اس سے بددل نہ ہونا چاہیے، آخر کسی کو کیا معلوم؟

وہ کس نے دیکھا تھا؟

کس نے جانا تھا؟

علاءالدین کا کوئی قصور نہیں، زریندر کا بھی کوئی قصور نہیں۔ سوائے اس کے کہ اپنی چھینک کے ساتھ جاتے جاتے زریندر مجھے بھی شاید نزلہ لگا گیا تھا۔

سر اور آنکھوں میں درد ہو رہا تھا اور ناک میں خارش سی ہو رہی تھی۔

مجھے کمرے میں شدید گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں اتنی گرمی عام طور پر رات میں تو نہیں ہوتی۔ دیوار پر نہ جانے کہاں سے نکل نکل کر بہت سی چھپکلیاں چلی آئیں۔ ''آپا! تمھارے گھر میں بہت چھپکلیاں ہیں۔'' علاءالدین نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں آج کہاں سے نکل آئیں۔ ورنہ روز تو ایک آدھ ہی نظر آتی ہے۔'' انجم نے جواب دیا۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' علاءالدین اُٹھنے لگا۔

''نہیں— کھانا کھا کر جانا۔'' انجم نے روک دیا۔

''ھو۔ھو۔ کیا پکایا ہے؟''

''اُرد کی سفید خشکہ دال۔ زیرے کے آلو اور میتھی کے بگھار والے بیگن۔''

مجھے ایک بار پھر اپنے اندر زلزلہ سا آتا ہوا محسوس ہوا۔ دل، پھیپھڑے اور آنتیں بری طرح ہلنے لگیں۔ جسم کے اندر جیسے چٹانیں سی لڑھک رہی تھیں۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔

''آج میتھی کے بگھار والے بیگن نہ پکتے تو اچھا تھا۔'' میں نے سوچا۔

''کیا ہوا، بہت پسینہ آرہا ہے تمھیں، پنکھے کی رفتار بڑھاؤ۔ کھڑکی بھی کھول دو۔ ھو۔ھو۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا، میں کچھ بولتا تو یقیناً انجم سے جھڑپ ہو جاتی۔ اور علاءالدین کے سامنے میں اس وقت کوئی تماشہ نہیں چاہتا تھا۔

کھانا میز پر لگ گیا۔ میتھی سے بگھرے ہوئے اودے اودے مسالے دار بیگن۔ سفید چینی کی قاب میں رکھے بہت خوبصورت نظر آرہے تھے۔ مگر میں اُس خوبصورتی سے ڈر گیا۔ بیگنوں کا اُودا رنگ مجھے زہر میں ڈوبا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میرا جی مالش کر رہا تھا، پھر بھی ہمت کر کے میں نے روٹی کا ایک نوالہ توڑا ہی تھا کہ اچانک میں زور زور سے ہلنے لگا۔

نہیں، اس بار ہمیشہ کی طرح صرف میرا وجود ہی نہیں ہلا تھا، بلکہ سب ہل رہے تھے۔

انجم، علاء الدین، میز کرسیاں، برتن، صوفہ، پلنگ سب جیسے ناچ رہے تھے۔

''ارے زلزلہ ہے، زلزلہ۔'' علاء الدین وحشت زدہ ہو کر چیخا۔

''بھاگو۔ بھاگو۔'' باہر ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔

سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر کھلے میں بھاگتے جا رہے تھے۔ پلنگ کے بائیں طرف رکھی لوہے کی الماری آواز پیدا کرتے ہوئے زور زور سے ہلنے لگی۔ میز پر رکھے کھانے کے برتن ایک دوسرے سے چھن چھن کرتے ہوئے ٹکرانے لگے۔ اُرد کی سفید دال، زیرہ آلو اور مسالے دار بیگن سب آپس میں گڈمڈ ہو کر بکھر گئے۔

''بھاگو، آپا، بھاگو۔'' علاء الدین پھر چیخا اور اس طرح گھر سے نکل کر بھاگا جیسے ملک الموت اُس کے تعاقب میں ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے انجم بھی ہذیانی آوازیں نکالتی ہوئی بھاگی۔ اسی وقت بجلی فیل ہو گئی۔

فضا میں ایک عجیب شور تھا۔ ایک دل ہلا دینے والی گھڑگھڑاہٹ، باہر ملبہ سا گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ بری طرح چیخ رہے تھے۔ سب سے آخر میں، میں گھر سے باہر نکلا۔ سامنے کھلے میدان میں انسانوں کا جمِ غفیر تھا۔ میں نے کچھ فاصلے پر اپنی آنکھوں سے، گھروں کو گرتے دیکھا۔ ایک ہی پل میں، کھڑکیاں، دروازے، شیشے، شہتیر اور بلّیاں، دھڑام کی بھیانک آوازوں کے ساتھ زمین پر گر رہی تھیں۔ ملبہ گرنے کی آواز سے زیادہ ہولناک یا مہیب آواز اور کوئی نہیں ہوتی۔ مٹی، سیمنٹ اور ریت کے غبار میں، میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔

اس غبار میں کہیں، کوئی رو رو کر کہہ رہا تھا۔

''میرے بچّے! ہائے میرے بچّے۔ وہیں رہ گئے۔''

میں نے قیامت کے اس شور میں، میدان حشر میں بھی انجم کی آواز پہچان لی، حالانکہ میرے کان اب تقریباً بہرے ہو چکے تھے۔

اب مجھے اپنے بچّوں کا خیال آیا۔ وہ دوسرے کمرے میں کھیل رہے تھے۔ میرے اندر ایک بہت پرانی طاقت عود کر آئی۔ اُس بھیانک اور موت کے شور سے مقابلہ کرنے کے لیے، میرا جسم اس اس شور کے بوجھ سے کچل رہا تھا۔ دماغ کی رگیں پھٹنے والی تھیں۔

میں نے اپنی آنکھوں کی دھول اور خاک سے اَٹی پرزے پرزے ہوتی ہوئی بینائی کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

دُھند، ریت اور مٹی کے مہیب بادل کے پیچھے گھر تھا۔

میں نے ایک جست بھری اور دوبارہ گھر میں آ گیا۔ ایک ایسی اُڑتی ہوئی فٹ بال کی مانند جس پر کسی طاقت ور اور وزنی پیر نے زور سے ٹھوکر ماری ہو۔ میں بچّوں کے کمرے میں چکّر کھاتا، گرتا، اُٹھتا، لڑکھڑاتا پہنچا۔

چھت میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، سفید چونے سے پُتی ہوئی دیواریں ٹیڑھی ہو کر جھک رہی تھیں۔ چوکور کمرہ، ایک مثلث میں تبدیل ہو کر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

دونوں بچّے ہلتے ہوئے فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ میں نے جھک کر دونوں کو اُٹھایا اور کندھے پر لاد کر باہر نکلنے کو ہی تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ خوفناک گھرگھراہٹ رُک گئی ہے۔ میں نے دیواروں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اپنی پرانی جگہ واپس آ گئی تھیں۔ اب فرش نہیں ہل رہا تھا۔ چھت نہیں جھک رہی تھی — زلزلہ رُک گیا تھا۔ بھونچال چلا گیا صرف گھر کی دیواروں پر اور چھت پر اپنی عفریتی ناخنوں سے چند خراشیں ڈال کر — اب میں باہر نہیں گیا۔ میں وہیں بچّوں کے پاس فرش پر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ باہر شور کچھ مدھم ہو گیا — نہ جانے کتنی دیر بعد، اُن بچّوں کی ماں روتی پیٹتی کمرے میں آئی اور بچّوں کو صحیح وسلامت دیکھ کر، جیسے اُسے خوشی سے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ پھر وہ ہوش میں آئی اور بچّوں کو

اپنے سینے سے لپٹا کر دیوانہ وار پیار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد، اُس نے اپنا چہرہ اُٹھا کر، مجھے شکر گزار آنکھوں سے دیکھا، زندگی میں پہلی اور آخری بار۔

میں یوں ہی خاموش فرش پر اُکڑوں بیٹھا رہا۔ میرے حلق، ناک، کان سب بند ہو چکے تھے۔ اُن میں ریت بھری تھی۔ اچانک مجھے اپنے اندر ایک رطوبت سی بنتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پتہ نہیں کہاں سے، جسم کے ریشے ریشے میں سمائی خشک۔ جلتی ہوئی ریت میں، پانی آ رہا تھا۔ کہاں؟ جسم کے کون سے نہاں خانوں میں سے کون سی سرنگوں میں سے پانی کی ایک پتلی لکیر، میں نے رینگتی ہوئی محسوس کی۔

اور تب مجھے بے اختیار ایک زبردست چھینک آئی۔ پھر دوسری، تیسری، چوتھی — لگاتار وہ آتی ہی رہیں۔

میری ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ میرے حلق کے غدودد کھنے لگے۔ مجھے لگا جیسے بخار سا آ رہا ہو۔ میں نریندر کی طرح شوں شوں کرنے لگا۔

مجھے ایک عجیب سا نشہ چڑھتا محسوس ہوا۔ باہر کا شور، پولیس اور ملٹری کی گاڑیوں کے ہارن، بین کرتی ہوئی آوازیں، ملبہ بن گئے گھر، کچلی دبی لاشیں، سب اس نشے کے زیر اثر اپنی خوفناک اہمیت کو کھونے لگے۔ سب کچھ بہا جاتا تھا۔

ایک دریا تھا، ٹھاٹھیں مارتا ہوا اور اُس کے مہیب کنارے تھے۔ اس کنارے سے اُس کنارے، سب بہا جا رہا تھا۔ زلزلہ بھی بہہ گیا۔

مجھے پتہ چل گیا یہ کون سا نشہ تھا؟

میں ایک بھیانک نزلے کی گرفت میں تھا۔
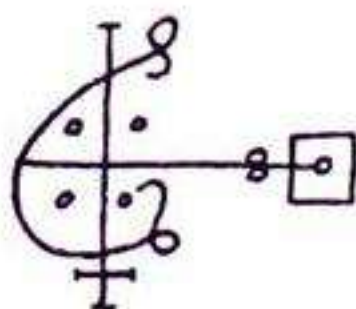
تیسرا حصّہ

نزلہ

پانی کا ایک ریلہ ہے جس میں وقت کے کنارے ٹوٹ ٹوٹ کر بہتے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا کیا گزر گیا اور کیا کیا گزرنے والا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب میرا حافظہ، میرے دماغ کے بائیں حصے سے نزلے کی رطوبت بن کر، ناک اور آنکھوں سے باہر بہتا جا رہا ہے۔ مجھے اسے سنبھالنا مشکل ہے۔

میں کون کون سے پانیوں کو سنبھالوں؟

باہر، سڑک پر سیور لائن خراب ہوگئی ہے۔ سیور لائن کا گندا پانی، گھر میں آنے والے پانی کے پائپ میں چلا آیا ہے۔ گھر میں آنے والا پانی کا پائپ، نہ جانے کہاں پر سیور لائن سے جڑ گیا ہے۔

گھر میں گندا پانی داخل ہوا، مگر انجم کو نظر نہیں آیا۔ وہ سمجھتی ہے کہ مجھے وہم ہو رہا ہے یا میرا دماغ چل گیا ہے۔ ادھر میں ہوں کہ ہر وقت، ہاتھ میں جھاڑو لیے کھڑا ہوں اور کونوں، کھدروں، فرش اور ہر جگہ سے اس گندے پانی کو جھاڑو سے کھینچ کھینچ کر موری میں بہاتا رہتا ہوں۔

یہ پانی مجھے ذلیل کر رہا ہے۔ مگر میں اتنا کمزور بھی نہیں کہ اس صورت حال کا سامنا نہ کرسکوں۔ ایک گھٹیا، گندے پانی سے لڑ بھی نہ سکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کوئی بھی چیز اپنے آپ آپ کی طرف نہیں آتی۔ یہ آپ ہی ہیں۔ آپ کا زمان و مکان، آپ کا ذہنی اور جسمانی محل وقوع ہی سب کچھ طے کرتا ہے۔ چاہے آپ ایک جامد لوہے کے کھمبے کی مانند ایک ہی مقام پر، کھڑے رہیں۔ مگر وہی مقام آپ کا

مقدر طے کرتا ہے۔

میں وہ پُل ہوں جو ہمیشہ سے ہی ایک ایسی کینہ پرور خوفناک، ندی کے اوپر کھڑا رہا، جس میں نہ جانے کون کون سے زمانوں کے گندے نالے آ آ کر ملتے گئے۔ صاف وشفاف جل دھارا تو کبھی نظر ہی نہ آئی — پُل کے دَر اور ڈاٹیں اس گندے پانی میں ڈوبے رہے۔ یہ پانی جس میں انسانوں کے جسم سے، میل کے ساتھ اُترا ہوا صابن، اُس کے جھاگ، پیشاب اور فضلے کی دبیز کالی پیلی پرت اور ایک بھیانک بدبو۔

تو پھر، جو کچھ میرا کیا دھرا ہے، اُسے بھگتنا بھی مجھے ہی ہے۔ میں تاریخ کے اس منحوس نقطے پر کیوں موجود تھا؟

میں انجم باجی کی گود میں کیوں آجاتا تھا؟

میں انجم آپا کو جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر کیوں سناتا تھا؟

میں انکار کرسکتا تھا۔ میں باورچی خانے کی بات ماننے سے انکار کرسکتا تھا۔ قاتل بننے سے انکار کرسکتا تھا۔ مگر جس طرح کوئی اپنے مقدر کی نفی نہیں کرسکتا۔ جس طرح کوئی پیدا ہونے اور مٹ جانے سے انکار نہیں کرسکتا، اُسی طرح یہ سب بھی ہوا۔ صاف وشفاف پہاڑی چشمے کی گونج بہت دور سے آتی رہی اور گدلی، گندی ندیوں کے بھنور میں میری روح چکّر پھیریاں کھاتی رہی تاکہ میں خود بھی ایک بار پھر سے سڑتے ہوئے بدبودار پانی میں بدل جاؤں۔

مگر میں نے اس پانی سے لڑنے کی قسم کھائی ہے۔ اس پانی سے لڑنے کے لیے میرے پاس نزلہ ہے۔ نزلے کا پانی جو میری آنکھوں اور ناک سے لگاتار بہہ رہا ہے۔ آنکھیں اور ناک دونوں لال ہیں نزلے کے پانی اور اُس کی طاقت کے نشے میں، میں جھوم رہا ہوں۔

مجھے تو اب وقت تک کا کوئی احساس نہیں۔ میں اکیلا ہوں، مگر میرا کتّا میرے ساتھ ہے۔ میرا حافظہ، ایک محفل، ایک انجمن بن کر میرے ساتھ ہے۔ نزلے کا شکار تنہا میں ہی نہیں ہوں۔ سب ہیں۔ نزلے کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ انجم کو بھی نزلہ ہے۔ وہ ہر وقت کھانستی اور چھینکتی رہتی ہے۔ دونوں بچّوں کو

بھی نزلہ ہے۔ دونوں کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے میں، انھیں اب بہت عرصہ نہیں لگے گا۔ دونوں کٹر مذہبی ہوتے جا رہے ہیں— بہت کم عمری سے ہی مسجد جا رہے ہیں۔ نہیں معلوم کہ وہ مسجد میں جا کر کیا کرتے ہیں۔ انجم نے انھیں ہمیشہ سے ہی مذہبی تعلیم دی ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بہت ضروری ہے۔ جو مجھے قاعدے سے نہیں مل سکی۔ مگر انجم ایک اچھی ماں ہے، اور کیوں نہ ہو، وہ دو دو لڑکوں کی ماں ہے، کسی چوہیا کی نہیں۔

مگر انجم کو یہ گندا پانی کیوں نہیں نظر آتا جو گھر میں چلا آ رہا ہے۔ گھر میں پانی کی کوئی ٹنکی کھولو۔ یہی سڑاندھ بھرا پانی باہر نکلتا ہے۔

انجم کیوں نہیں دیکھتی کہ یہ گندا پانی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ وہ تو میرے بہتے ہوئے نزلے کو ہی گندا پانی سمجھتی ہے اور اس سے گھن کھاتی ہے۔

چھت پر رکھے پانی کے ٹینک میں یہی پانی بھرا ہے۔ جو ٹونٹی کھولو تو بدبو کا فوارہ باہر آتا ہے۔ سڑکوں کی نالیاں بند ہیں۔ سارا پانی پلٹ کر گھر کی موریوں سے اندر چلا آ رہا ہے۔ خاص طور پر باورچی خانے میں۔ اس پانی میں برتن بہنے لگے۔ سڑتے ہوئے پانی اور بدبو نے برتنوں کو ہمیشہ کے لیے آلودہ کر کے رکھ دیا۔

دونوں بچے میری طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں ایک بُرا باپ ہوں۔ اُن کو مجھ پر شرم آتی ہے۔ میں نہ پابندی سے کبھی نماز پڑھتا تھا اور نہ روزے رکھتا تھا۔ اور اب تو ان چیزوں کی طرف سے تقریباً بیگانہ ہی ہو چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک دن میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت نفرت کرنے لگیں گے۔ بہت نفرت۔

مجھے اب ہلکا ہلکا سا بخار بھی رہنے لگا ہے۔ یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ زیادہ عرصے تک نزلہ رہنے سے حرارت ہو ہی جاتی ہے۔ شہر میں جس کو دیکھو اُس کا یہی حال ہے۔ ہر شخص نزلے میں جکڑا

ہوا، کھانستا، چھینکتا، شوں شوں کرتا ہوا۔ ناک سے بہتے پانی کے نشے میں جھوم جھوم کر چلتا جا رہا ہے۔ نزلہ میرے اوپر بصیرتوں کے نئے نئے در وا کر رہا ہے۔ ابھی ابھی مجھے یہ خیال آیا ہے کہ پانی کی اپنی یادداشت ہوا کرتی ہے۔ جدید سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے۔

پانی جس شے کو چھو لیتا ہے اُسے کبھی نہیں بھولتا۔ اپنے اوپر پڑھی گئیں اور دم کی گئیں دُعائیں وہ کبھی نہیں بھولتا۔ اور بددعائیں بھی، کینہ پرور جذبے بھی۔

تو اَب سمجھ میں آیا کہ یہ اتنا سارا گندا پانی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے؟

دراصل یہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ یہ اپنی ہاتھی جیسی یادداشت کو، اپنی گندی لہروں میں سمائے، مجھ سے اپنا پچھلا حساب بیباق کر رہا ہے۔

میں نے کتنے کمینوں کے باورچی خانوں میں کھانا کھایا تھا؟ اور پانی پیا تھا؟

وہ پانی کون سے جذبوں کے ساتھ دیا گیا تھا؟ اور وہ میرے گناہ؟ میرے گناہوں کا پانی، جو میرے خون میں شامل تھا۔ سب نے مجھے یاد رکھا۔ گندے، کینہ اور بغض سے بھرے پانی ہی میرے ساتھ رہے۔

اچھے پانی، نیک پانی اور محبت و شفقت کی یادداشت لیے ہوئے پانی تو بس کبھی کبھار ہی ایک شفاف، محنت بھرے پسینے کی ماتھے پر نمودار، چند بوندوں کی صورت تھے۔ جو وقتاً فوقتاً ستارے کی طرح چمکے اور کبھی دھندلے اور مدھم پڑ گئے۔ میں تو کبھی کبھی بھول بھی جاتا تھا، اپنے گناہ بھی، اور وہ بڑے بڑے دھبے بھی مگر پانی نہ بھولا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک ہاتھی کی یادداشت کے نرغے میں ہوں، میں اس سے لڑ نہیں سکتا، مگر اس کے تمام وار سہنے کے لیے تیار ہوں۔ میری ڈھال، میری اپنی یادداشت ہے۔

ہاتھی کے حملے سے بچنے کے لیے میرے پاس میرا کتا موجود ہے۔

اس لیے اپنی عرضیاں آگے بڑھانے کے لیے، مجبوراً میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ گندا پانی محض میرا وہم ہے۔ وہم ہی سہی، مگر مجھے آگے بھی تو لکھنا ہے، چاہے وہ عدالت بھی ایک گندا پانی کیوں نہ ہو۔

نزلے کے نشے میں، مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ شاید میری بینائی پر اثر پڑا ہے یا پھر میرے چشمے کا نمبر بدل رہا ہے۔

جب بھی میرے چشمے کا نمبر بدلتا ہے، میں اُداس ہو جاتا ہوں۔ اب پرانے فریم اور اُس کے شیشوں کا کیا ہوگا؟ سب رائیگاں۔

ایک دن ہر شے میں اپنا مسکن بنانے والی، بے مروت روح اُس شے کو دھتکار کر، وہاں سے چل دیتی ہے۔ چشمے کے فریم اور اُس کے شیشوں سے آنکھ کی روح باہر نکل آئی۔ آنکھ میں صرف جلتا پانی رہ گیا۔

مگر میری روح — وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔

مرنے کے بعد مجھے بھوت بن جانا قبول ہے، مگر ایسی بے مروّتی، ایسی بے وفائی اور ایسی بے حیائی مجھے گوارہ نہیں کہ جسم کو کہیں سڑتا گلتا چھوڑ کر روح آفاق کی پاکیزہ وسعتوں میں چہل قدمیاں کرتی پھرے۔

انجم بچّوں کو جمعے کی نماز کے لیے تیار کر رہی ہے۔ اُن کے نہانے کا پانی تیار ہے۔ وہ تینوں میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں، جو اپنی یادداشت کی کرچیاں، فرش پر سے اُٹھا اُٹھا کر بین رہا ہوں۔ یادداشت کی ان کرچیوں پر، میری ناک سے نکلے پانی کی بوندیں جمتی جا رہی ہیں جن سے وہ جگمگا اُٹھتی ہیں۔

مجھے پرانے لوگ یاد آنے لگے ہیں۔ میرے گھر کے تمام افراد جو مر گئے تھے۔ محلّے میں رہنے والے وہ سب جو مر گئے، اور دور دراز کے رشتے دار بھی۔ مجھے اپنی کھوئی ہوئی تمام اشیا یاد آنے لگی ہیں۔ میں سب تک دوبارہ پہنچنا چاہتا ہوں۔

نزلے میں، مجھے یہ یاد نہیں کہ کون سا موسم چل رہا ہے یا سال کا یہ کون سا مہینہ ہے۔ مگر شاید جون کا مہینہ ہو کیونکہ حبس بہت بڑھ گیا ہے۔ ہوا کو کائی اور پھپھوندی لگ گئی ہے۔ ایسی ہوا کو صرف چاقو

سے کاٹا جا سکتا ہے۔

مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں۔ ایک تقریب جس میں ایک بہت ہی سانولی دبلی پتلی مگر خوبصورت لڑکی اُس گھر کے باورچی خانے میں مجھے ملی تھی۔ اس نے میرے آگے پلاؤ کی رکابی رکھی تھی، پھر میری طرف بہت لگاوٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا، خدا نہ کرے کہ اس کے نام کے آگے پیچھے کبھی ''انجم'' لگا ہو، خدا نہ کرے!

آج وہ نیلے کپڑوں میں، ایک چمکتی ہوئی مکھی کی طرح میرے ذہن میں اُڑتی ہوئی آئی ہے۔ اُس کی آنکھیں نارنجی رنگ کی مٹھائی کی گولیوں کی طرح تھیں جنھیں آپ چوس سکتے ہیں، جب تک وہ میرے ساتھ رہی، اُس میں اتنی چمک پیدا ہو رہی تھی کہ مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا جسے میں نے غلطی سے بجلی کا وہ بلب نگل لیا ہو، جو باورچی خانے میں لٹکا رہتا تھا۔ وہ ہنستی تھی تو اُس کے دانت اس طرح باہر آتے، جیسے وہ کسی دھاگے کو دانتوں سے کاٹ رہی ہو۔

مگر مجھے معلوم تھا۔ اُس وقت بھی معلوم تھا کہ میرا اُس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ میری کوئی نہیں تھی۔ اور جس طرح تقریب کی رونق اور چمک آخر کار تاریکی میں بدل جاتی ہے اُسی طرح وہ اپنی تمام چمک سے مجھے چکمہ دے کر، اچانک گہرے اندھیروں میں کہیں کھو گئی۔ ہمیشہ کے لیے۔

مجھے وہ لوگ شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ اپنا باورچی خانہ بھی یاد آ رہا ہے، وہ ایک قتل گاہ، ایک میدان جنگ۔

بہت پہلے جب ہمارے گھر میں بے شمار، چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ مجھے آج بے اختیار وہ دن یاد آئے تو رونا سا آ گیا۔ پتہ نہیں ان دنوں مجھے کیا ہو گیا ہے، ورنہ میں تو اتنا بے حس، بے رحم، خود غرض اور برا۔

مگر میں رونا نہیں چاہتا۔ میں اپنے نمک کو سنبھال کر رکھنا چاہتا ہوں۔ نمک میں لاشیں دیر سے

سڑتی ہیں۔ مجھے بہت کچھ بچا کر رکھنا ہے، مجھے ڈر ہے کہ یہ نزلہ کہیں سب کچھ، بہا کر نہ لے جائے۔ سارا شہر ہی اس نزلے کی چپیٹ میں ہے اور شوں شوں کرتا پھر رہا ہے۔

تو بہت پہلے جب ہمارے گھر میں بے شمار چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ انھیں دنوں ہماری ایک دور کی رشتہ دار، بوڑھی خالہ اکثر آتیں اور سیدھے باورچی خانے میں ہی گھس جاتیں۔ چھکّن نانی اُن سے ہمیشہ بہت کھسیاتیں کیونکہ بڈھی خالہ، ہمیشہ باورچی خانے کے طاق کا جائزہ لیتی رہتیں۔ باورچی خانے کا یہ طاق صرف چھکّن نانی کی ہی ملکیت تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ میری اصل یادداشت سے پہلے کا، یہاں تو میں، صرف انگلوں سے اور کچھ منظروں کے ذریعے ہی کام چلا رہا ہوں۔

باورچی خانے کے اُس طاق میں ایک چھوٹی سی رنگ اُڑی ڈبیہ میں، نانی کے دو دانت رکھے ہوئے تھے جو شاید فروری کے موسم میں ٹوٹ کر گرے ہوں گے۔ جب درختوں سے پتے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔

سانپ کی ایک زرد کینچلی، اولوں کے سڑے ہوئے پانی کی ایک شیشی، ٹوٹی ہوئی گلابی رنگ کی صابن دانی، جھانوا اور ایک مری ہوئی شہد کی مکھی جو اُس وقت تازہ رہی ہوگی، جب میں نے دیکھا۔ اور بھی پتہ نہیں کیا کیا کاٹھ کباڑ۔

بڈھی خالہ برقع میں، ایک چمگادڑ کی طرح نظر آتی تھیں۔ اور جب وہ اپنا برقع اُتارتیں تو! خدا کی پناہ ایک باریک سے جمپر کے اندر بھی، ایسا لگتا تھا جیسے اُن کے پستان ہوا میں اُڑتے تھے۔ ایک بھیانک دیو ہیکل پرندے کی طرح۔ اُس کے ڈینوں کے سائے بہت مہیب تھے۔ میں بڈھی خالہ کے پستان دیکھ کر ڈر جاتا تھا اور رونے لگتا تھا۔ یہ بات مجھے ننّو پھوپھا نے بتائی تھی۔ مجھے یاد نہیں ننّو پھوپھا کو بچّوں سے مذاقیہ اور قدرے فحش باتیں کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے ہی یہ بھی بتایا تھا کہ بڈھی خالہ کے پستان اتنے بھیانک تھے کہ جب وہ دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھتیں تو وہ اس طرح نیچے لٹک کر زمین پر ٹک جاتے جیسے کوئی جنگلی جانور آرام کر رہا ہو۔

یہ مجھے یاد نہیں، ننّو پھوپھا مزے لے لے کر بتاتے تھے، مجبوری ہے کہ اپنی رُکی ہوئی یادداشت کو،

دوسروں کی یادداشت کے ذریعے۔ مجھے اس طرح کھینچنا پڑ رہا ہے جیسے سڑک پر خراب ہوگئی کسی گاڑی کو دوسری صحیح وسلامت گاڑی کے انجن کے ذریعے کھینچا جاتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے۔ لاشعور سے سارے کیڑے نکال کر باہر نہیں پھینکے تو میری سزا یا میرے جرم میں سے کوئی ایک بھٹک جائے گا۔ اور ایک 'غلط لفظ' کی شکل میں لکھا جائے گا۔ ویسے بھی اس وقت نزلے نے یادداشت کو دُھندلا کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے افسوس کہ مجھے بہت سے تاثرات، مناظر اور آوازوں سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ اُن کے سو فیصد درست ہونے کا میں دعویٰ نہیں کرسکتا، کم از کم جب تک نزلے کی یہ وبا پھیلی ہوئی ہے۔

نہ جانے کتنا زمانہ ہوگیا، اس وبا کو پھیلے ہوئے۔ رُکنے میں نہیں آتی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ نہیں کیا لکھ رہا تھا؟

ذرا ناک کو رومال سے پونچھ لوں تو یاد کروں۔ ہاں یاد آ گیا! مگر اُسے بتانے سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں یہ عرضیاں، یعنی یہ تحریر دوسری طرح سے بھی لکھ سکتا تھا۔ میں اپنے موزوں کو اُلٹا کرکے بھی، اُن میں پاؤں ڈال سکتا تھا۔ اُلٹے موزے بھی میرے ہی پیروں کے ناپ کے ہیں مگر میں نے یہ اسلوب اس لیے اختیار کیا ہے کہ اگرچہ، میں ناول نہیں لکھ سکتا مگر ایک مردانہ اُداسی کے سہارے قلم چلاتے چلاتے میں کم از کم ناول کی "شعریات" کی قواعد تک تو پہنچ ہی جاؤں۔ یہ کام یقیناً محض ایک مردانہ اُداسی کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے، ورنہ قانونی عرض داشتیں دُوسری طرح سے بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ گھگھیاتی اور رحم کی بھیک مانگتی ہوئیں۔

سارا گھر بڑھی خالہ سے اس لیے بدکتا تھا کہ اُن کی نظر بہت خراب تھی۔ وہ جب بھی باورچی خانے میں جاتیں تو یا تو وہاں رکھا دودھ کا برتن گر جاتا یا پھر دودھ پھٹ جایا کرتا۔ نانی بتاتی تھیں کہ ایک بار بڑھی خالہ نے نظر بھر کر دودھ کو دیکھا تو دودھ خون میں بدل گیا۔ مجھے اس واقعے پر تب یقین نہیں آتا تھا مگر اب یقینِ کامل ہے۔ دنیا محض عجیب وغریب، نہ سمجھ میں آنے والے اُوٹ پٹانگ واقعات کا ہی دوسرا نام ہے۔ اب انجم کو ہی دیکھ لیجیے۔ آج کل وہ بہت زیادہ اِترانے لگی ہے۔ دونوں بچے بڑے ہوگئے ہیں، اور دونوں نے اچھے خاصے مضبوط ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔

کل کھانے میں نمک غائب تھا، ہمیشہ کی طرح اس پر میں نے اپنی بیوی کو سخت وسخت کہا۔ پہلے تو میری بیوی مجھے ترکی بہ ترکی جواب دیا کرتی تھی، مگر اس بار وہ غرور اور اطمینان کے ساتھ، وہیں بیٹھی مسکراتی رہی کیونکہ دونوں بچوں نے اپنی ماں کی طرف سے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور مجھے خبردار کیا کہ اگر میں نے کھانے پر کوئی نکتہ چینی کی تو اچھا نہ ہوگا۔

انجم نے مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھا، میں تو وہ زیرہ تھا جسے وہ سالن میں ڈالنے والی تھی۔ پہلی بار مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک نئی چیز نظر آئی، جیسے نابینا عورت کی آنکھوں میں شہوت کی چمک۔

یا تو نزلے کا اثر ہے یا پھر واقعی ایسا ہے کہ ان دنوں اُسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اُس کے جسم کے بہت سے اعضا، جسم کے باہر، قابل رحم انداز میں لٹک رہے ہوں اور اُن سے اُس کی روح کا کوئی بھی تعلق نہ ہو۔ کیا انسان کے جسم میں فاصل کے نام پر ایک ہی آنت ہے؟ انجم کی یہ نظر بس اور اُس کا یہ حلیہ بہت خطرناک ہے۔ اگر مجھے دھوکہ نہیں ہوا تو اُس دن میرے سامنے رکھی چاول کی پلیٹ کو اُس نے آنکھیں سکوڑ سکوڑ کر دیکھا تھا اور سارے چاول، سفید بے داغ بکھرے ہوئے چاول، کچھ ہی دیر بعد، خون میں سنے نظر آنے لگے تھے۔

اگر آپ اُس وقت میرا چہرہ دیکھ پاتے تو آپ کو محسوس ہوتا جیسے اُس پر کوئی طمانچہ مار کر چلا گیا ہو۔ اب یہ ایک چہرہ نہ تھا۔ یہ دو چہرے تھے۔ ایک ہی وقت کے فریم میں بجتے ہوئے دو مختلف راگ یا سُر۔

اور جہاں تک میرا سوال ہے، مجھے لگتا جیسے میرے بدن کی کھال اُتار دی گئی ہو۔ میں بچوں کے سامنے بے عزتی اور شرم سے گویا اُلٹا لٹکتا چلا گیا۔ جس طرح قصائی کی دوکان میں، کھال اُتارے ہوئے ننگے، فحش اور مُردہ بکرے اُلٹے لٹکا دیے جاتے ہیں۔

مگر بس ایک فرق ہے جو اس تشبیہ کو بے معنی بنا سکتا ہے، میں مُردہ نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں اور میں بزدل بھی نہیں۔ میں تو اس وقت بس نزلے کی چپیٹ میں ہوں۔ مجھے ہلکا ہلکا سا بخار ہے اور گلے میں خراش ہے۔

اس بھیانک نزلے میں کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ نفرت کرنے کو، نہ غصہ کرنے کو، نہ انتقام لینے کو اور نہ ہی قتل کرنے کو۔ بس ابھی سب کچھ ٹالتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ شاید کہیں دور بارش ہو رہی ہے۔ گھٹن اور حبس نہیں۔ سردی سی محسوس ہو رہی ہے، شاید سردیاں آ گئیں؟ کیا واقعی جاڑوں کا موسم آ پہنچا۔

ہوا کا رُخ بدل گیا ہے، دور کہیں ایک ٹرین اندھیروں سے گزر رہی ہے اور اُسے کوئی نہیں دیکھتا۔ میں اُس کی آواز سنتا ہوں، دور، بارش، کہیں گہرے کھڈوں میں گر رہی ہے اور اُسے کوئی نہیں دیکھتا۔ میں آواز سنتا ہوں۔

میں چیزوں کو ملتوی کر رہا ہوں۔ میں سب کو طرح دے رہا ہوں۔ میں سب کچھ ٹال رہا ہوں اور مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ مجھے تو کوئی بھی کرتے ہوئے کچھ نہیں دیکھتا۔

مجھے تو بس اِس وقت اپنی کھوئی ہوئی چیزوں کی پرچھائیاں ہی درکار ہیں۔ میرے سارے پیارے، میرے سارے مُردے۔

میں اپنی بے عزّتی پر رضامند نہیں ہوں۔ میں نے صرف اپنے مُردوں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ چاندنی کی سفید چمک سے میری آنکھیں دُکھنے لگیں۔ سفید روشنی اتنی ہی سفاک ہوتی ہے۔

میں جھلّا کر یہ خواہش کرتا ہوں کہ چاند کا کم از کم آدھا حصّہ سوکھے خون سے ڈھک کر تاریک ہو جائے۔

میرے پیارو! کیا مرنے کے بعد، تم سب بھول گئے ہو، سارے سُکھ اور سارے دُکھ؟
کیا واپس آؤ گے؟
خوشی خوشی (یا بھاری دل سے) اُس باورچی خانے میں بیٹھ کر، ایک ساتھ کھانا کھاؤ گے؟
لڑو گے، جھگڑو گے؟

یا صرف سفید روشنی کے ذرّات میں بدل کر، اپنا حافظہ، کسی تاریک سمندر میں، پتھر سے باندھ

کر، غرق کر کے زمین پر آؤ گے۔

کیا وہاں، دور، بہت دور خلا میں لوگ، جا کر، ایسے ہی بدل جاتے ہیں۔ یا وہاں بھی کوئی رسوئی، کوئی باورچی خانہ ہے جس کے روشندانوں سے وہ سفید روشنی کی طرح آتے ہیں۔

یا کہ اپنے ہی برتنوں میں وہ کاکروچ بن کر رینگتے ہیں؟

بارش ہو رہی ہے۔ باورچی خانے کی کھڑکی کے نیچے پانی بہہ رہا ہے اور اُدھر، دور، ساڑھے چار سو میل دور، میرے شہر میں، میرے گھر کے قریب، تمھاری قبروں پر بھی پانی برس رہا ہے۔

نزلے نے اچانک شدت اختیار کر لی۔ میرے کانوں میں سخت درد ہو رہا ہے۔ وہ بہرے سے ہونے لگے۔ ناک، آنکھ کا پانی کانوں تک بھی آ پہنچا۔

چلے آ رہے ہیں یاد۔ چلے آ رہے ہیں یاد۔ اور آج تو ایک اور کرشمہ ہوا۔ وہ لڑکی جو لڑکپن میں خوابوں میں آتی تھی، مگر پھر، اُس نے نہ جانے کیوں میرے خوابوں میں داخل ہونا بند کر دیا تھا، وہی لڑکی جس کا کوئی چہرہ نہیں، شاید کوئی جسم بھی نہیں، آج اتنے سال بعد، میں نے پھر اُسے خواب میں دیکھا۔

سونے سے پہلے، میں بہت اُداس تھا۔ جیسے آنکھ بالکل خالی ہو گئی ہو۔ اُس وقت اُس میں نزلے زکام کا پانی تک نہ تھا۔ اچانک مجھے نیند آ گئی، جیسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے مجھے نیند کی دوا پلا دی ہو۔ حالانکہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نیند تو آ ہی جاتی ہے۔ میں تو ایک بار بھیانک ریت کی آندھی میں بھی سو گیا تھا۔ سوتا ہوں تو خواب بھی آتے ہیں۔ خواب یوں تو کالے، سفید ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی اُس میں رنگ بھی نظر آتے ہیں جو کہ یقیناً دماغ کی کسی گہری سلوٹ کے جاگ جانے کا انجام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ خواب تو اندھے لوگ بھی دیکھتے ہیں۔

میرے خوابوں میں جو واحد رنگ کبھی مجھے نظر آیا ہے، تو وہ وہی لڑکی ہے۔ میرا اکلوتا رنگ، ہرے، پیلے، لال، نیلے، نارنجی سارے رنگوں سے الگ اور ماورا۔

جب وہ میرے پاس آئی تو باہر ٹھیلے پر جامن والا جامن بیچ رہا تھا۔

''اب روٹی پکالوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، چنے کی روٹی۔''

''چنے کی روٹی، لال مرچ اور لہسن کی چٹنی اور دیسی گھی۔''

اُس کا کوئی جسم نہ تھا، کوئی لباس نہ تھا، مگر پھر بھی، ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا کوئی سینہ تھا، وہاں کوئی دوپٹہ بھی تھا۔ اس کا دوپٹہ سینے سے ڈھلکا، محبت خاموشی سے، اُس کے دل سے باہر آئی اور میرے ماتھے اور ہونٹوں کو چاٹتی ہوئی کمرے کے ہر تاریک گوشے سے گزری اور پھر واپس اُس کے دل میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے صاف صاف دیکھا۔ محبت اُس کے دل میں، ایک طرف جا کر اُکڑوں بیٹھ گئی۔ شرمندہ، لاچار، مجرمانہ محبت۔

آنکھ کھل گئی — اب آنکھوں میں نزلے کا پانی دوبارہ آگیا تھا۔ میرا بایاں گال تکیے میں اس طرح دھنسا ہوا تھا جیسے کوئی بدنصیب پاؤں دلدل میں۔

یقین کیجیے، میں ہرگز نہیں بتا سکتا کہ کتنا زمانہ گزر گیا اور نزلے نے کسی کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کتنی بار چاند کو گرہن لگا ہوگا اور کتنی بار سورج کو۔ نہ جانے کتنے شہابِ ثاقب، ٹوٹ ٹوٹ کر، خلا سے زمین کی طرف ایک شعلے کی مانند آئے ہوں گے اور پھر بجھ گئے ہوں گے۔ مجھے کچھ نہیں پتہ، نزلے کے سیلاب میں مجھے کچھ بھی نہیں پتہ۔ یہ نزلہ کہیں میری موت کا سبب نہ بن جائے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں اس دنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ ایک درخت کی طرح یا ایک چٹان اور کسی ندی میں پانی کے بہاؤ کی طرح اور یہاں تک کہ ایک آسیب کی طرح بھی۔ میں زندہ رہنے پر راضی ہوں۔

نزلے سے بھری، گندی آنکھوں کو صاف کر لینے کے بعد بھی، وہ دو مایوس اور اُداس آنکھیں ہیں — آنکھوں نے اپنے منظروں کو اپنے اندر ہی قید کر رکھا ہے۔ ان پر ویرانی پہرہ دیتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ کوئی استعارہ نہیں، استعاروں کے ذریعے ادب میں بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ قانون میں نہیں اور عرضیوں یا اپیلوں میں نہیں — میں کوئی ناول نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ ہی کوئی طویل نظم اس لیے

میری تحریر میں تکرار، کوئی عیب نہیں، بلکہ ایک بے حد اہم اور ناگزیر عنصر ہے۔ قانون، جرم اور سزا کی تکرار کے علاوہ اور کیا ہے۔ اور دنیا کا کوئی مقدمہ بغیر تکرار کے نہیں لڑا جاسکتا۔ زندگی میں پوشیدہ مجرمانہ ذلّت اور ذلالت کو کسی استعارے میں بیان کرنا بہت بڑی نامردی ہے اور مجھ سے اگر کبھی غلطی سے ایسا ہو جاتا ہے تو میں اپنے دل پر ایک بھیانک تھکن محسوس کرتا ہوں۔ ورنہ میں تو پوری نیت کے ساتھ ساری ذلّتوں اور ساری سازشوں کو ایک بیان کی طرح لکھنا چاہتا ہوں۔ ایک مقدمے کی تیاری کی طرح اور ایک کبھی نہ ٹوٹنے یا مکرنے والی گواہی کی طرح۔

میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے پرانے، بہت پرانے لوگ کیوں یاد آرہے ہیں؟ میرے خون کی ڈور کا سرا دھندلا پڑنے لگا ہے۔ میں خون کی پوشیدہ، نادیدہ، پُراسرار ڈور پر اپنے حافظے کا پھندہ لیے نہ جانے وقت کے کس مقام پر کھڑا ہوں۔ وقت یہاں ساکت و جامد ہے، حافظے کا یہ پھندا، پھانسی کا پھندا ہے۔ میں اُس سے، خود ہی اپنے چہرے کا ناپ لینے لگتا ہوں۔ اس پھندے میں اپنی گردن ڈال دینے کے بعد میں ابدی اور لافانی ہو جاؤں گا۔ موت مجھ سے ڈر کر اس طرح بھاگے گی جیسے پانی کو دیکھ کر کتّے کا کاٹا ہوا۔

اب پھر، وہی گندا پانی۔ اس بار تو زیادہ ہی سڑاندھ ہے۔ مگر انجم جسے صفائی کا المناک حد تک شوق ہے۔ وہ اسے کیوں نہیں صاف کرتی۔ اسے یہ بدبو کیوں نہیں محسوس ہوتی۔ کیا اُس کی قوت شامہ بھی ٹوٹ کر بکھر گئی؟ اتنی ستواں ناک ہونے کے باوجود۔ یا یہ کہ نزلے نے اُس کی ناک سے سونگھنے کی طاقت چھین لی؟

میری ناک تو برابر کام کر رہی ہے۔ میرے دونوں بیٹوں اور اُن کی ماں نے اسی گندے پانی سے غسل کرنا شروع کر دیا ہے۔ کل دونوں بیٹے، گندے پانی سے وضو کر کے ہی مسجد گئے تھے۔ میں نے انھیں ٹوکا بھی مگر اُنھوں نے مجھے جھٹلا دیا۔ وہ مجھے بہکا ہوا سمجھنے لگے ہیں۔ ایک ایسا سنکی یا احمق جسے وہم ادراک ہوا کرتے ہیں۔

یہی ہوتا ہے، ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اور دنیا دو جماعتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مگر سچائی کو تو نہیں

جھٹلانا چاہیے! یہ تینوں نہیں دیکھتے۔ کہ گھر میں باہر کے نالے اُمڈے چلے آرہے ہیں۔ پاخانے کی موری سے، غسل خانے کی موری سے، باہر کی گندگی اور کیچڑ گھر میں چلی آرہی ہے۔ شاید قصور میرا ہی ہے۔

جب آپ کے اپنے فلش کی زنجیر خراب ہوتی ہے، جب آپ کا اپنا کموڈ خراب اور گمراہ کن بن جاتا ہے، جب آپ کے ٹوائلیٹ کی سیٹ کے اندر کا کوئی حصہ کمزور ہوکر، یا گل کر ٹوٹ جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر ذرا سی بارش میں ہی دوسروں کے گھروں کی گندی، سڑکوں کی نالیوں کی کیچڑ اور غلاظت آپ کے گھر میں گھسی چلی آتی ہیں۔ دڑانہ، بے دھڑک، آپ کے منھ پر تھوکتی ہوئی۔ تب گھر، گھر نہیں رہتا۔ اُس میں جگہ جگہ گندا میلا پانی ٹھہرا نظر آتا ہے۔ آپ کی کتابوں کی الماری، پلنگ، میز اور کرسیاں، سب اسی پانی میں آدھے آدھے ڈوب جاتے ہیں اور اُن کی پرچھائیاں اس غلیظ پانی پر تھرتھراتی ہیں۔ نہ جانے کہاں سے پلاسٹک کی سفید اور کالی تھیلیاں اُڑ اُڑ کر گھر میں سڑتے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے پانی پر اکٹھا ہو جاتی ہیں۔ وہ کچھ ایسی نظر آتی ہیں جیسے کچھ ناقابل فہم قسم کے مکر یہہ الصورت پرندے اپنی چونچیں اس سڑتے ہوئے پانی میں ڈبو رہے ہیں۔

ہاں! قبول کرنا پڑے گا کہ آپ کا ہی کموڈ خراب تھا۔ آپ اپنی آنتوں کی بے چینی کو، کموڈ کی جیومیٹری اور اُس کی جمالیات سے ہم آہنگ نہیں کر سکے۔ حالانکہ آپ کو ہمیشہ سے یہ علم تھا کہ انسان اپنی آنتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ دل، دماغ، دانت اور آنکھ میں نہیں رہتا۔ وہ آنتوں میں چھپ کر رہتا ہے۔ اس کا جسم تو اصل انسان کی محض پرچھائیں ہے۔ افسوس کہ اس راز کو، نازک مزاج، نفاست پسند اور ناسمجھ لوگ یا تو لطیفہ سمجھ کر یا پھر گندگی کے التباس اور صفائی کے 'متھ'' کے نیچے دب کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایسا اس لیے بھی ہوا کہ میں نے شاید اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو کوڑے دان میں سرسراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ افسوس! میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ میرے گھر کے، (میرے بچپن کے گھر کے) پرانے باورچی خانے کی نالی بھی اکثر بند رہتی تھی۔ اس لیے ڈالڈا گھی میں لپٹی ہوئی، باسی بڑے کے گوشت کی، لال سخت بھدی بوٹیاں وہاں اٹک کر رہ گئیں (بالکل جس طرح آنتوں میں اُن کے ریشے

سڑے) دال چاول رُک رُک کر آگے بڑھے۔ انڈوں کے چھلکوں کی بساندھ سے تمہارا باورچی خانہ بھر گیا۔ پھر اُس کے بعد ادھیڑ ہوتی ہوئی، بد دماغ عورتوں کے سروں کے گرتے کھچڑی بال تک اُنھیں نالیوں میں بھر گئے۔ باورچی خانہ جھگڑوں کا اڈہ بنا، مگر تم، تم صرف انجم باجی کو کھانا پکاتے دیکھتے رہے اور اُس کے بعد، صرف پتھر کی ایک سِل۔ اُس پر چکلا ہوا سرا اور بھڑ بھڑا کر جلتا ہوا اسٹوو ہی تمھیں یاد رہا۔

اب تمھیں پھر سب کچھ، یہاں درج کرنا ہوگا۔ بہی کھاتے میں، ایک جھینگر کے بچّے کا بھی اندراج کرنا ہوگا اور چیونٹی کے ایک انڈے کا بھی — انصاف چاہتے ہو نا! پہلے خود انصاف کرو، جو کچھ نظر انداز کیا تھا، اُسے اب اپنی پوری طاقت سے یاد کرو۔

مگر دماغ کے جو خلیے مر گئے ہیں، وہ کبھی زندہ نہ ہوں گے۔ وہ دوسرے بیکار پڑے خلیوں کے برابر میں جا کر لیٹ جائیں گے تاکہ دماغ کا وزن ایک کلوگرام سے لے کر ڈیڑھ کلوگرام کے درمیان ہی رہے۔

اس لیے اب باقی بچے دماغ کے زندہ خلیوں سے ہی کام چلانا ہے۔ یاد کرو، سب کچھ یاد کرو اور لکھو — لکھنا تمھارے لیے اُتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لیے مرنا۔

انجم نے بے دلی کے ساتھ میرے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا ہے۔ اتنا کام تو وہ ایک روایتی اور منافق مشرقی عورت کی طرح کر ہی دیتی ہے۔

انجم کی پکائی ہوئی روٹی کے سارے کنارے کچے ہیں۔ یہ عجیب بھدی، موٹی اور گیلی گیلی سی روٹی ہے۔ روٹی کے کنارے دانتوں سے چبنے کے لیے تیار نہیں۔ اب میرے دانت کچھ خراب سے ہونے لگے ہیں۔ نزلے کا اثر دانتوں پر بھی پڑتا ہوگا — روٹی کے نوالے کو دال میں بہت دیر تک بھگونا پڑتا ہے۔ دال میں بھیگا نوالہ منھ تک جانے سے پہلے میرے سفید کرتے یا پاجامے پر تھوڑی سی دال اس طرح ٹپکا دیتا ہے جیسے زخم سے رستا ہوا خون، کپڑوں پر ٹپک پڑتا ہے۔ میں اس پتلی ارہر کی دال میں گزرے زمانے کا عکس دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر وہاں پہلے ہی سے نہ جانے کون سے نادیدہ

زمانوں کی اُداسی اور تنہائی اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

میں خود کو کچھ غمگین محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ اصل میں، تھا نہیں۔ غم کے بوجھ سے دبنے کے لیے بھی ایک عمر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوجوانی میں اور جوانی میں بھی دُکھ نہیں ہوتا۔ دُکھ کا التباس ہوتا ہے۔ بہت آگے چل کر سارے التباسات اچانک ایک دن نہ جانے کہاں سے آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ سب بھیانک حقیقت بن کر، عمر کے بوجھ سے تھکی ہوئی روح کی پیٹھ اور کاندھوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔ وہ سارے دُکھ جن کو ہم نے جھیل لیا تھا۔ اچانک راستہ بدل کر، پیچھے سے آ جاتے ہیں۔ ایک مکّار اور کینہ پرور گلدار کی مانند اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب تمھارا جسم کمزور پڑنے لگا ہے۔ تمھارے بالوں کی گھونگریالی لٹیں کنگھے میں پھنس پھنس کر، نالیوں میں بہہ گئی ہوں۔ تمھارے نقش و نگار، خد و خال کسی باڑھ میں بہہ گئے ہوں۔ رخسار، ناک کان، ماتھا، سب میں سے کچھ نکل کر کہیں گر گیا ہو۔ آنکھوں کی پتلیوں پر چربی کی موٹی تہہ جم گئی ہو اور اُن کا سارا نور دُھندلا گیا ہو۔ سفیدی آنے لگی ہو۔ مسکراہٹیں پھیکی اور آنسو مضحکہ خیز بن گئے ہوں۔ ایسے وقت، دُکھ تمھارے جسم پر آ کر، پیرِ تسمہ پا کی طرح اُسے جکڑ لیتا ہے۔

عمر—عمر—!

زندہ رہنے کی سزا۔ پاگل ہو جانے کے لیے تیار کرنے والا ایک اسکول۔

میری عمر ابھی اتنی نہیں ہوئی۔ میں نہ پاگل ہونے کے لیے تیار ہوں اور نہ مرنے کے لیے۔

میں اپنا ''دُکھ'' خود لکھوں گا۔ میں دُکھ کا اظہار کرنے میں، اگر کبھی مجھے موقع ملا تو، بودا نہ ثابت ہوں گا۔ میں اُن عورتوں کا سہارا کبھی نہ لوں گا جن کو رُودالیاں کہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں اپنی بیوی کی موت سے پہلے مر گیا تو وہ دنیا کو دکھانے کے لیے اور خود اپنے ضمیر کو تسلّی دینے کے لیے ضرور روئے گی، بَین بھی کرے گی۔ انجم ایک رُودالی ہے، وہ رونے کا معاوضہ پہلے ہی حاصل کر چکی ہے۔

میں انجم سے پہلے مرنا نہیں چاہتا، اس لیے میں نے گوشت اور چکنائی والے کھانے چھوڑ دیے ہیں۔ صرف اُبلی ہوئی دالیں اور سبزیاں کھاتا ہوں۔ انجم میری اس چال کو سمجھ گئی ہے، اس لیے اس قسم کا کھانا تیار کرتے وقت وہ ہمیشہ برافروختہ رہتی ہے۔

مجھے تو اب قطعی طور پر یہ یقین ہو چلا ہے کہ اگر ہر قسم کے کھانے دنیا سے اُٹھا لیے جائیں تو کوئی بھی نہیں مرے گا۔ سب کو حیاتِ جاوداں نصیب ہوگی، چرند و پرند اور حشرات الارض تک زندہ رہیں گے۔ اس دھرتی کا زخموں سے چور چور سینہ، دوبارہ نئے اور تازہ پھیپھڑوں سے سانس لے گا۔ سارے زخم بھر جائیں گے۔ دنیا جو ایک نقطے سے شروع ہوئی تھی، پھیلتی جائے گی — میں نے سنا تو ہے کہ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے اور دمادم، صدائے کن فیکون چلی آ رہی ہے۔

مگر ممکن ہے کہ یہ سب میری بے عقلی کی باتیں ہوں۔ میری سمجھ میں ایک معمولی سی قانونی دفعہ تو آتی نہیں۔ میں اس قسم کے فلسفیانہ یا سائنسی مسائل پر، گفتگو کرنے یا سوچنے تک کا اہل نہیں ہوں۔ میں تو اس نزلے جیسی حقیر بیماری تک کو نہیں سمجھ سکا۔ کسی کسی وقت تھوڑی سی دیر کے لیے، طبیعت صاف محسوس ہوتی ہے۔ میں گھر سے باہر نکلتا ہوں۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ دوسری طرح کی دھوپ ہے۔ اس دھوپ کو چیخوف، کبھی اپنے ٹوپ میں نہیں بھر سکتے تھے۔ (بے چارے رومانی چیخوف) یہ دھوپ، سر کی اوپری ہڈی پر، آگ کی بوندوں کی طرح گرتی ہے۔ یہی آگ، آنکھوں میں اور ناک کے نتھنوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ بس اُس وقت پھر نزلہ ہو جاتا ہے۔ یہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ دوسروں کا مجھے نہیں معلوم مگر مجھے اب بار بار، رُک رُک کر نزلہ ہوتا ہے۔ جیسے میں بار بار کسی اندھے کنویں میں جھانکتا ہوں۔

اور انسان کنویں ہی کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جاتا ہے۔ انسان درخت کی طرح اوپر کی طرف نہیں بڑھتا۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر دنیا کو صحیح معنی میں سمجھنا ہو تو اُسے اُلٹی طرف سے پڑھنا ہوگا۔ ساری تاریخ کو، نیچے سے اوپر یا بائیں سے دائیں کی طرف سے پڑھانا چاہیے۔ اصل معنی اِس عمل میں کہیں باقیات کی شکل میں دبے پڑے ہوں گے۔ بڑھاپے سے بچپن کی جانب لوٹنا ہی ایک سچا ارتقا ہے۔ مجھے دوبارہ، مالیوں کی پُلیا سے پار والے اسکول کی طرف چلنا ہوگا۔ آبائی گھر کی طرف چلنا ہوگا۔ اپنی گڑی ہوئی نال کی طرف جانا ہوگا۔ خوانچے والے کی پڑیا کے خالی کاغذ کی طرح، اُڑتی ہوئی خاک اور دھول کے چیتھڑے کی طرح، ایک بگولے کی طرح ہمیں اُس پانی کے مخالف چلنا ہوگا۔ جو ہمیشہ ماخذ سے

سمندر کی طرف بہتا ہے۔ ہمیں اُن تمام ہواؤں کو تھام کر دوبارہ درختوں کے پتوں سے چپکانا پڑے گا۔ جو اُن سے نکل کر ادھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہیں۔

اور آخر میں، آخر میں تو گھر کے سب سے خطرناک حصّے میں جانے کا جوکھم مول لینا ہی پڑے گا۔ جسے باورچی خانہ کہتے ہیں۔ باورچی خانہ جہاں نفرت، غصّے، لالچ اور بدنیتی کی آگ اتنی جلدی بھڑک اُٹھتی ہے کہ اُس کی لپٹوں میں مٹّی کا چولہا تک چھپ کر رہ جاتا ہے۔

نفرت اور غصہ!

یہ انسان کے دو، سب سے خالص، سچّے اور روحانی جذبے ہیں۔ صرف ان دو جذبوں میں ہی یہ کرشمہ اور طاقت ہے کہ کھانے کی رکابیاں، پیالے، کٹوریاں، قاب، ڈونگے سب کے منہ چڑیلوں کی طرح میڑھے ہو جاتے ہیں۔ برتنوں پر آدھے ہونٹوں والے بھوت دانت نکالے آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ غصّے اور نفرت سے لبالب، یہ کالے برتن، اپنی پوری مگر ناقابلِ فہم قوت کے ساتھ اُچھلتے ہیں اور تمھارے منہ پر یہ ڈھیر سا خوفناک شوربہ اُلٹ جاتا ہے۔ اِس شوربے میں، جنگلی جانوروں کے نادیدہ گوشت کی بساندھ ہے۔ تمھارا سارا منہ اِن نظر نہ آنے والی، سخت ریشے دار بوٹیوں اور نکیلی ہڈّیوں سے زخمی ہو کر سوج جاتا ہے۔ تمھاری تھوتھنی، غمناک انداز میں، نیچے کی طرف اُسی طرح لٹک جاتی ہے جس طرح پتھر کے زمانے کے انسان کی، جب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُس ''آگ'' کے بارے میں سوچنے لگتا تھا جو ابھی ایجاد ہی نہ ہوئی تھی — وہ آگ جو دو پتھروں کو آپس میں رگڑنے پر پیدا ہوتی تھی۔

تو سارا انسانی ارتقا، نفرت اور غصّے کے تپتے ہوئے، انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے راستوں پر ہی ہوتا رہا۔ ان راستوں پر چلتے ہوئے نفرت اور غصے کے لیے پر انسان اپنی قربانی دیتا رہا۔

مجھے یاد رکھنا چاہیے کہ قربانی کا سلسلہ بہت پرانا تھا۔ کالی مائی کی سرخ لپلپاتی ہوئی زبان اور خونم خون سر کٹے بکروں سے بھی پرانا۔

مجھے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ خزاں کے موسم میں درختوں کی پتّیاں گرنے سے پہلے، اِس لیے

زرد ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے حصّے کی تمام غذا، تمام توانائی، نئی آنے والی کونپلوں کو سونپ دیتی ہیں۔ ایک دن زمین پر گر جانے کے لیے اور کسی وزنی، بے رحم جوتے کے تلے کے نیچے آکر کچل جانے کے لیے خوشدلی کے ساتھ تیار۔

میں سوچتا ہوں کہ میرا ارتقا ایک اکیلا ارتقا ہے۔ جو جتنا آگے بڑھتا ہے، اُتنا ہی پیچھے اور دائیں بائیں کے اندھیروں کی طرف بھی۔

ان دائیں بائیں کے اندھیروں میں، میرے پاؤں کے نیچے وہ دلدل ہے جہاں نیچے نیچے ہی نہ جانے کتنی ندیاں آپس میں آکر مل رہی ہیں۔ اندر ہی اندر معدوم ہوتی ہوئی، مگر مجھے اِن ندیوں میں صرف قلعے کی ندی تلاش کرنا ہے۔ میرا پاؤں دلدل میں بھی چوکنا ہے۔ کتّے کی آنکھ کی طرح چوکنا۔

مجھے پرانے لوگ یاد آرہے ہیں۔ وہی مجھے بچا سکتے ہیں۔ میں جو مسلسل نزلے سے بھیگی، ہواؤں کے طمانچوں کی زد میں ہوں۔ میں جس کے پیچھے شہد کی مکھیوں کا ڈنگارا لگ گیا ہو۔ میں جس کے پیچھے گندے پانی میں شرابور، سڑک کے آوارہ کتّے، بھونکتے ہوئے لگ گئے ہیں۔

میرے جرم، میرے گناہ، میری غلطیاں، میری لغزشیں، رنگین کانچ کی گولیوں کی مانند میری دونوں جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ میں ہاتھ ڈال کر، اُنھیں محسوس کرسکتا ہوں۔ مگر باہر نکال کر دیکھ نہیں سکتا۔ ایسے وقت میں صرف اپنے پرانے زمانے کے ملبے سے لپٹ جانا چاہتا ہوں۔ اس ملبے میں، ایک باورچی خانہ ہے۔ ایک نعمت خانہ ہے، چھینکے میں لٹکتا ہوا دودھ کا برتن ہے۔ مٹی کے تیل کا کنستر ہے۔ اور پتھر کی ایک سِل ہے جس پر میری کچّی پرچھائیں جھوم رہی ہے۔

میں اب جانوروں کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ جانوروں کے ساتھ ہی میرا آب و دانہ ہے۔ میں اب باورچی خانے سے بھاگ کر بھی کہیں نہیں جاسکتا۔

اس صورت حال سے اُکتا کر، بلکہ گھبرا کر میں نعمت خانے کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ شاہی ٹکڑوں کی طرف، فیرنی کے پیالوں کی طرف، شیرمال کی طرف، ڈبل روٹی کی طرف، انڈوں کی طرف، گلاب جامن اور پیڑوں کی طرف، سیب، انار اور انگوروں کی طرف۔ منّ کے میٹھے، سفید بتاشوں کی طرف، اور سلویٰ کی بٹیروں کے نمکین گوشت کی طرف۔

مگر افسوس یہاں نعمت خانہ کہاں! یہاں تو فرج ہے اور اُس میں رکھے، ٹھنڈے، باسی اور واہیات قسم کے پھیکے سیٹے کھانے ہیں۔ اب کھانوں کو سڑنے سے بچانے کے لیے اُنھیں ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ برف کی طرح ٹھنڈا، کھانوں پر برف کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ یہ زندہ کھانے نہیں ہیں۔ یہ کھانوں کی لاشیں ہیں۔ کھانے کے وقت میری بیوی اُنھیں گیس کے چولہے پر گرم کرتی ہے۔ گیس کے چولہے کی آگ بھی ٹھنڈی اور نیلی ہے۔ گرم کرنے پر بھی ان کا اصل ذائقہ نہیں لوٹ کر آتا۔ جس طرح مرے ہوئے آدمی کا سینہ زور زور سے رگڑ کر حرارت پیدا کرنے سے، اُس میں زندگی واپس نہیں آتی۔

مگر میں یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوں کہ اگر نعمت خانہ دنیا سے ناپید ہو گیا ہے تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ساری دنیا ہی ایک وسیع و بیکراں نعمت خانہ بن کر رہ گئی ہے۔ جہاں ہر شے دوسری شے کے لیے ایک نعمت ہے۔ ایک رزق ہے اور اُس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان، انسان کو کچا کھا جائے یا اُس کا کوئی بہت عمدہ اور اعلیٰ قسم کا پکوان بنا کر یا پھر انسان کو ایک تصور یا مفروضہ بنا کر نگل جائے۔

میں نے یہی سب اوٹ پٹانگ باتیں سوچتے سوچتے سگریٹ سلگا لیا ہے اور بے تحاشہ کھانسنے لگا ہوں۔ نزلے میں پھیپھڑے سگریٹ کا دھواں برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر میرے پھیپھڑے برداشت کریں یا نہ کریں، میں دھواں برداشت کر سکتا ہوں۔ میں تو کوڑے دان میں پڑے، سڑے ہوئے کھانوں اور پھپھوندی لگے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کے نیچے بھی آرام سے زندہ رہ سکتا ہوں۔ طمانیت کے اِس احساس کے ساتھ کہ ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں۔ اِسی درجۂ حرارت اور تعفّن کے ذریعے وجود میں آئے ہیں۔

میرے سگریٹ کا دھواں کمرے میں سے تیزی کے ساتھ اُڑتا جا رہا ہے۔ کیا کوئی ہوا چلی ہے؟ نہیں باہر تو ہوا بالکل بند ہے، پھر یہ کیسی ہوا ہے؟

میں نے جان لیا کہ یہ اجنبی ہوا ''دُکھ'' کی ہے جو میرے دل میں بہہ رہی ہے۔ یہ ہوا، دل میں ہی نہیں ٹھہری، وہ دل سے باہر آئی۔ میرے ہاتھ پیروں تک اور پھر میرے تمام جسم سے بہہ بہہ کر کمرے کی دیواروں اور فرش میں بھر گئی۔ بستر کی ملگجی چادر میں، تکیے کے غلافوں میں اور گدّے کے

نیچے پلنگ کی لکڑی میں چھپے ہوئے کیڑوں تک میں یہ ہوا مجھے اُداس کر رہی ہے۔ مجھے گمراہ کر رہی ہے۔ افسوس مجھے اپنی روح کا جغرافیہ تو اب کیا ملتا، مگر اُس کا ایک نقشہ ہی مل جاتا تو میں اُس میں چند ضروری ترمیمیں کر دیتا۔ میں سوئے ہوئے آتش فشانوں کے دہانوں پر اُگے ہوئے خودرو جنگلوں کو کاٹ کر رکھ دیتا۔ وہاں جہاں میری آتما کے نقشے میں جھرنے بہہ رہے تھے۔ انھیں میں ریگستان کی علامتیں بنا دیتا۔ اپنی روح کے سارے دریاؤں، سارے پہاڑوں، سارے صحراؤں کو میں اپنی مرضی سے جغرافیائی عرصہ بخشتا۔

مجھے شبہ ہے کہ ایک بار، بہت پہلے، کسی زمانے میں مجھے میری روح کے جغرافیے کا نقشہ ملا تھا، مگر ایک بھیانک بارش میں لاپروائی سے بھیگتے ہوئے، اپنی بوسیدہ پتلون کی عقبی جیب میں، میں نے اُسے گلا دیا، گنوا دیا۔

میں اِن عرض داشتوں کو یادداشت کی گیلی مٹی کی طرح لکھ رہا ہوں تو اس سے آپ کو یہ بدگمانی نہ ہونی چاہیے کہ یہ میری زندگی کی کتاب ہے اور اگر ہے بھی تو واضح رہے کہ اس میں سے وہ پورا باب ہی غائب ہے جو اس کتاب کو ایک معتبر شناخت فراہم کر سکتا تھا۔ اس باب کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ اور یہ دیمک، کم بخت میرے ہی آنگن میں، مجھ پر ہنستی پھرتی تھی — کیا دیمک کے دانت ہوتے ہیں؟

آپ یقین کریں یا نہ کریں میں نے دیمک کو اُس کے کریہہ اور بدنما دانتوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ مجھ پر حقارت کے ساتھ تھوک رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے آسمان پر رُکی ہوئی پیلی آندھی کا غبار، آسمان کے نیلے رنگ پر حقارت کے ساتھ تھوکتا ہے۔ آندھی کے پیلے دانتوں سے، زرد تھوک کی بوندیں اُڑتی ہیں۔

وہی دیمک جو لکڑی کے گودے کو شکر میں تبدیل کر کے اپنا پیٹ بھرتی تھی، بہت پہلے، میری زندگی کی کتاب سے ایک انتہائی، بلکہ سب سے اہم باب کو کھا کر، اپنی روحانی غذا بھی پوری کر چکی تھی — ہاں روحانی غذا، دیمک کے بھی روح ہوتی ہے۔

روح تو چیونٹی تک کے ہوتی ہے، یہ اور بات کہ بہت چھوٹی اور ننھی سی کمزور روح۔

چیونٹی کی روح ہاتھی کی روح سے بہت چھوٹی ہے۔ جتنا بڑا جسم، اتنی بڑی روح۔

اس لیے ان یادداشتوں کو میری زندگی کی کتاب نہ سمجھ لیجیے گا۔ دونوں کی روحوں میں چھوٹی بڑی کا فرق ہے اور ان یادداشتوں کا، جیسا کہ میں ایک ہزار بار کہہ چکا ہوں، ایک خاص مقصد ہے۔ اس لیے میں انھیں ایک خاص انداز سے لکھ رہا ہوں۔ ورنہ میں ان یادداشتوں کو ایک دوسری طرح سے بھی لکھ سکتا تھا۔ کاغذ پر لکھے ایک مختلف راگ یا دوسرے سُر کی مانند۔ تب اس تحریر کو آپ گھٹیا لطیفوں کے ایک مجموعے کی صورت ''گڈو میاں کا دسترخوان'' کے عنوان سے ایک بازاری کتاب میں بھی پڑھ سکتے تھے۔ مگر اس سے میرا مقدمہ کمزور پڑ سکتا ہے۔ عدالت میں بیٹھا، انتظار کرتا ہوا، میرا منصف (اگر کوئی عدالت ہے)، میری اپیلوں پر قہقہے لگا کر، عدالت برخواست کر سکتا ہے۔ مجھے مجرم نہ سمجھ کر، محض ایک منہ چڑھا بھانڈ سمجھ کر، میری تمام گستاخیوں کو معاف کر سکتا ہے۔ مگر یہی مجھے منظور نہیں، مگر ابھی تو صاف صاف مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے بدلے میں منظور کیا ہے۔ خیر کچھ باتیں تو وقت ہی آپ کو بتا دیتا ہے۔

نزلہ نہیں جارہا، سارے ڈاکٹروں اور حکیموں کی چاندی ہوگئی ہے۔ کسی کے مطب میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے تو اب انگریزی دوا کھانا بند کر دی ہے۔ میں تو 'ہمدرد' کا جوشاندہ پی رہا ہوں۔ اگر چہ افاقہ ابھی تک کچھ بھی نہ ہوا۔ پتہ نہیں نزلے کے پے در پے طمانچے کھاتے کھاتے میری شکل کیا ہوگئی ہوگی؟ کب سے آئینہ نہیں دیکھا۔ دیکھ کر بھی کیا کرتا۔ میں نے ایک مکھوٹا جو لگا رکھا ہے۔ کیلے کے چھلکوں سے بنا مکوٹھا۔ کیلے کے چھلکوں سے بنا یہ بے شرم مکھوٹا میں نے زمین سے اُٹھا کر چہرے پر لگایا ہے۔ لوگ کبھی نہیں جان سکیں گے کہ میں کیا ہوں، ان کی نظریں تو نظریں، اُن کا سارا علم کیلے کے چھلکوں سے بنے اس مکھوٹے پر پھسلتا رہے گا۔

آخر کوئی تو یہ جان لے کہ میں ایک قاتل ہوں۔ ایک مجرم اور بدشگونیوں کا رازدار (اگر چہ بہت سے جرم ایسے بھی ہیں جو محض افواہوں کی طرح مجھ سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔)

مجھے پرانے لوگ یاد آرہے تھے۔ میرے جسم میں شاید ایک کتّے کی روح تھی، جو صرف بھوتوں کی

حفاظت، اور اُن کی رکھوالی کرتی ہے۔ وہ بدنصیب کتا جو انسانوں کے اوپر صرف منھ پھاڑ کر روتا تھا۔ وہ کسی پر بھونک نہیں سکتا۔ اپنے سائے پر بھی نہیں، ایک سنسان کھنڈر نما مکان میں، بھوت اُسے اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں پھینکا کرتے تھے۔ بھوتوں کے ذریعے چچوڑی گئی ان ہڈیوں کو وہ منھ میں دبائے دبائے، گھومتا تھا۔ اور بھوتوں کی رکھوالی کرتا تھا اور انسانوں پر بدشگونیوں کے زہریلے جھاگ اُڑاتا ہوا آسمان کی جانب دیکھتا تھا۔

میں نے اکثر سوچا ہے کہ کہیں اُن بدشگونیوں کا ماخذ میں ہی تو نہ تھا؟ طرح طرح کے کھانے تو یوں ہی بدنام کر دیئے گئے۔

انجم سے میرے جھگڑے بدستور قائم ہیں۔ کسی نہ کسی کھانے کو موضوع بنا کر، کتنی بار!

نزلے کے اِس کبھی نہ ختم ہونے والے دور میں، میں نے کتنی اموات کی خبر سنی۔ بہت سے پرانے یار دوست، کالج کے زمانے کے، گزر گئے۔ معلوم ہوا کہ مقیم علی بھی مر گیا اور ترپاٹھی بھی۔ کالج کے دو تین پروفیسروں کی سنوائی آئی۔ اپنے آبائی گھر کے کچھ پڑوسی بھی سدھار گئے۔ بہت سے حادثے ہوئے اور مجھے گھر میں پکنے والے ہر کھانے نے کسی انہونی کے لیے ہوشیار کیا، مگر میں اتنا منحوس اور بدنصیب واقع ہوا ہوں کہ کسی بدشگونی کو اپنے بل میں سے نکلتے ہوئے دیکھ تو سکتا ہوں مگر اُسے روک نہیں سکتا۔ میں تو یہ بھی نہیں جان سکتا کہ یہ بدشگونی کس کے گھر جا رہی ہے؟

کل کی بات ہے، یا پرسوں کی یا کچھ دن پہلے کی، یاد نہیں کہ (نزلے میں بہت کم یاد رہتا ہے) انجم سے نمک پر میری بحث ہوگئی۔ اب وہ نمک بہت کم ڈالنے لگی ہے۔

میں نے اُس سے کہا، ''نزلے سے تمھاری زبان خراب ہوگئی ہے۔''

''کھانے میں نمک مناسب ہے۔'' اس نے ترشروئی سے جواب دیا۔ میرا دل اُس کی گردن مروڑنے کو چاہنے لگا مگر ضبط کرتے ہوئے، میں نے آئندہ کھانے میں نمک کا خاص خیال رکھنے کے لیے کہا۔ چھوٹا بیٹا بے وجہ اپنی ماں کی طرف سے بکواس کرنے لگا۔ ''نمک اس سے زیادہ نہیں پڑے گا۔

کھاتے ہوتو کھاؤ ورنہ اپنا انتظام کرلو مگر امّی سے کچھ مت کہنا۔''

میں غصّے میں بھر کر اُسے تھپڑ مار دیتا اگر عقب سے بڑا بیٹا زیادہ بدتمیزی سے نہ پیش آتا۔ بڑے بیٹے نے کہا، ''تم نوالہ اتنا چبا چبا کر کھاتے ہو، بڑی گندی آوازیں نکلتی ہیں۔ یہ بدتمیزی ہے۔ تم شریف آدمیوں کے درمیان بیٹھ کر کھانے کے لائق نہیں ہو۔'' میں دونوں میں سے کس کو تھپڑ ماروں؟ میں الجھن میں پڑ گیا اور میری ناک سے زکام کی بوندیں مسور کی دال کی کٹوری میں گرنے لگیں۔ اپنی اس مایوس کن حد تک مضحکہ خیز گت بنتی دیکھ کر میں خاموشی سے کھانا چھوڑ کر اُٹھ گیا۔ بچّے تو ماں کی ہی طرف سے بولیں گے۔ ''ماں'' آج کل فیشن میں ہے اور ایک کمرشیل برانڈ میں بدل دی گئی ہے۔ ''باپ'' تو محض ایک مفروضہ ہے۔ اُس کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ فطری طور پر ہی کمزور کیونکہ ''باپ'' کو خود ہی اپنی ''اولاد'' کے ''باپ'' ہونے پر کبھی مکمل یقین نہیں ہو سکتا۔ ''باپ'' کے پاس کوئی ثبوت نہیں صرف ایک کمزور سا عقیدہ ہے۔ کائنات کے بارے میں (مذہبی لوگوں کو چھوڑ کر) حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ''خدا'' کی ہی تخلیق ہے۔ ''خدا'' اور ''باپ'' دونوں آج کے زمانے میں حاشیے پر چلے گئے ہیں۔

تو اَب منہ کا نوالہ اتنا زیادہ چبا چبا کر کھانا بھی فحش تھا؟ سالن کا نمک زبان پر نہیں پھیلتا، وہ جبڑوں کی دیواروں اور مسوڑھوں کی گہرائیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں اپنے حصّے کا نمک تلاش کرنے کے لیے دور دور بھٹکتا پھرتا ہوں۔ ایک ایسے پریشان حال ہاتھی کی مانند جو اپنے اُس غول سے بھٹک گیا ہو، جو نمک چاٹنے کے لیے دور دراز کی نمک کی چٹانوں تک کا سفر کرتا ہے۔ ہاتھی نمک چاٹنے کے لیے جلوس کی شکل میں ایک خاموش اور اُداس سفر طے کرتے ہیں۔ میں، ایک آوارہ گرد، اندھیرے اور گھنے جنگلوں کے پیچھے پوشیدہ کسی نمک کی چٹان تک نہ پہنچ سکا۔ میری زبان اسی لیے لپلپاتی ہے۔ ایک کینہ پرور سانپ کی طرح۔ نمک سے محروم یہ زبان کسی کو بھی ڈسنے کے لیے تیار ہے۔

تو سالن کے پیلے دھبّے جو سفید کرتے پجامے پر گرے تو اُن میں صرف ہلدی، مرچ، دھنیہ اور چکنائی ہی تھے۔ ان دھبّوں سے نمک بھاپ بن کر اُڑ گیا تھا، ورنہ میں ان کپڑوں کو چبا جاتا۔

واضح رہے کہ قانونی جنگ لڑنے میں، کچھ نہ کچھ جذبات تو ہتھیار کا کام دے ہی جاتے ہیں۔ میں اپنی یادوں کو ایک مقدمے کی دستاویز کی ہیئت میں ڈھالنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس لفظوں کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری تحریر میں تشبیہات کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ یہ تشبیہات ہی میری واحد نظیریں ہیں اور گواہیاں بھی۔ اگر میں اپنی صورت حال کو مثالوں کے ذریعے نہ سمجھاؤں تو پھر کیسے سمجھاؤں؟ استعارے تو یہ ٹھوس اور قانونی لڑائی لڑنے میں کام آ نہیں سکتے۔ وہ تو بس شعر و ادب کے شاہکار ہی منصۂ وجود پر لا سکتے ہیں۔ ایک بھرپور عرض داشت نہیں۔ پھر بھی غلطی سے اگر کہیں کوئی استعارہ آ گیا تو اُسے اس طرح اُٹھا کر الگ رکھ دوں گا جس طرح پلاؤ میں سے کالی مرچ کو بین کر رکابی کے کنارے پر رکھ دیا جاتا ہے۔

اور ایک بات اور، جو اس مقام پر آ کر صاف ہو جانی چاہیے، وہ یہ کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اُسے عدالت میں زبانی بیان کرنے کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ اس لیے اپنی طرف سے میں حتی الامکان یہ کوشش بھی کر رہا ہوں کہ بولتے وقت چہرے پر اور جسم پر جو ''بھاؤ'' آتے ہیں وہ میری تحریر کے سکتہ، یا ختمہ کے مماثل ہوں اور میرے سانس لینے کا جو وقفہ ہے وہی ایک جملے کا لکھا ہوا فاصلہ یا لمبائی ہو۔

مگر پھر بھی، مجھے افسوس ہے کہ بہت سی جگہوں پر میرے جملوں کی لمبائی دراصل ایک قسم کا دائرہ ہے جو لامحدود ہونے کی حد تک مبہم ہے۔ یا شاید صرف ایک نقطہ جس کے لامحدود ہونے کے امکانات اُتنے ہی ہیں جتنے کہ اُس کے مٹ جانے کے۔ اس خامی کو روکنا میرے بس میں نہیں۔ مگر دنیا بھی تو ایک نقطہ ہے اور لامحدود بھی۔ اگرچہ میں دنیا کو اتنی سنجیدگی سے کبھی کبھار ہی لیتا ہوں۔ میرے لیے تو یہ دنیا باورچی خانے میں پڑے ایسے جھوٹے برتنوں کی مانند ہے جو ابھی تک اپنے دھوئے نہ جانے پر رو رہے ہوں۔ ہاں مجھے یاد ہے تمیزن بوا اکثر کہا کرتی تھیں کہ باورچی خانے میں پڑے جھوٹے برتن رات بھر سسک سسک کر روتے ہیں۔

باہر تیز بارش ہونے لگی۔ خنکی بڑھ گئی۔ اب نزلہ اور تیزی پکڑے گا۔ یہ پھیپھڑوں میں بلغم پیدا

کرے گا اور جسم میں بخار، کھانسی اور زور زور سے گونجے گی۔

مجھے اپنے گھر کے سب لوگ یاد آرہے ہیں، بارش میں اور بھی زیادہ۔ وہ سب جو مر گئے، میں نے اپنے آبائی قبرستان کے بارے میں سوچا۔ وہاں بھی بارش ہورہی ہوگی۔ بارش سے قبرستان کی مٹی بہہ بہہ کر نہ جانے کدھر جارہی ہوگی؟ میرے پیاروں کی قبروں پر بھی بارش گر رہی ہوگی۔ نزلے میں، مجھے یہ دھیان نہ رہا کہ آج عید تھی۔ دن گزر گیا، میں نے کچھ بھی نہ کیا۔ نہ غسل کیا نہ عید کی نماز کو گیا۔ کچھ تو اپنے دونوں بیٹوں کی ضد میں اور کچھ یہ بھی کہ عید تو اپنے آبائی گھر میں ہی منائی جاسکتی ہے۔

اب رات تھی اور قبرستان میں بارش ہورہی تھی۔ قبروں کے اندر کفن گڈمڈ پڑے تھے۔ وہ سب جو ساتھ ساتھ عید مناتے تھے، ایک ساتھ عید کے کپڑے سلواتے تھے۔ وہ سب اپنے، جن کے لباس ایک دوسرے سے مس ہوتے تھے، وہ سب ایک دوسرے کے پیارے تھے (ظاہری طور پر ہی سہی) مگر اُن کے کفن ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ وہ الگ الگ بارشوں میں بھیگے گلے سیلے اور سڑے پڑے تھے۔ کیا کہیں ایسی کوئی سرنگ تھی جو ان کفنوں کو آپس میں لپٹا دینے کے لیے تیز ہوا میں ایک روشن دہانہ کھول سکتی؟ ایک محبت کرنے والے کا کفن، دوسرے محبت کرنے والے کے کفن سے جا کر لپٹ جاتا۔ بھلے ہی ان کی ہڈیاں کہیں بھی پڑی رہتیں، کیڑے مکوڑے جسم کھا جاتے تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔

مگر؟

ایک زمانے میں، میں قبرستان بہت جایا کرتا تھا۔ اگرچہ فاتحہ دینے کے لیے نہیں (انجم آپا کا گھر مجھے آج بھی یاد ہے) میں اُس قبرستان میں اتنی بار آیا تھا کہ بعد میں یہ مجھے گھر کا ہی ایک حصہ لگنے لگا تھا۔ جانا پہچانا، جیسے یہ بھی گھر کی ایک الگ کوبنی کوٹھری ہو، جہاں کباڑ اور غیر ضروری اشیا کو ایک قدرے سلیقے سے رکھ دیا گیا ہو۔ اور پھر وہاں ایک بھاری تالہ لگا دیا گیا ہو۔

سنو—! اے میرے پیارو! میرے رشتہ دارو! میرے کنبہ دارو! میں تم سب کی تلاش میں تمھاری قبروں میں اُترا مگر تم وہاں نہ تھے۔ وہاں صرف برف بھری تھی۔ لیکن مجھے خوب پتہ ہے کہ ہر قبر میں ایک کھڑکی تھی، جو ایک باورچی خانے میں کھلتی تھی۔

میں تمھارے گیلے کفن کاغذ کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اُس دن تک کے لیے جب تک کہ

قبر کا ہر مردہ اپنے اندر حرارت نہ پیدا کرلے اور اُٹھ کر باورچی خانے کے گرم چولھے کے پاس بیٹھ کر اپنے حصّے کا حلوہ نہ کھانے لگے۔ میں اندر، اور باہر دونوں دالانوں، اور دونوں کوٹھریوں سے ہو کر گزرتی ہوئی، آنگن تک پہنچ کر باورچی خانے میں جا کر گم ہوتی ہوئی لوبان کی خوشبو کے سارے تیور پہچانتا ہوں۔ مجھے اس باورچی خانے میں ایک بار پھر جانا ہوگا۔

یہ مایوسی ہے نا! ہاں یقیناً میں نے ایک مطلق مایوسی کو واضح طور پر محسوس کیا ہے۔ اب شاید میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا۔ یا زلزلہ مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتا۔ میرے پاس صرف پرانی باتیں رہ گئی ہیں۔ ایک مُردہ پرانا پن جو کہیں نظر نہیں آتا صرف مرے ہوئے یا مرنے کے قریب لوگوں کے آس پاس محسوس ضرور ہوتا ہے۔ یہ یادیں بھی نہیں، یہ ماضی بھی نہیں۔ یہ تو بس ایک پرانا، فرسودہ محاورہ ہے۔ ایک قدیم اور متروک ذخیرہ الفاظ جسے اب کوئی استعمال نہیں کرتا، مگر دیمکیں ان سے بخوبی واقف ہیں۔

کاش کہ اگر زندگی میں، کبھی میں نے کسی سے پیار کیا ہوتا تو یہ سطریں دوسری طرح سے لکھی جاسکتی تھیں۔ مگر میں نے تو پیار نام کے مہرے کو ہمیشہ غلط جگہ پر رکھا۔ میں نے ایک صحیح لفظ کو غلط کاغذ پر لکھا یا ایک غلط لفظ کو یوکلپٹس کے درخت کے دودھیا تنے پر چاقو کی تیکھی نوک سے لکھا۔

نہیں میں نے کبھی پیار نہیں کیا۔ انجم باجی سے نہیں۔ انجم آپا سے نہیں۔، انجم جان سے نہیں۔ انجم بانو سے نہیں اور انجم سے بھی نہیں!

تو پھر میں نے کیا کیا؟

میں تو تمام عمر ایک منحوس باورچی خانے میں کھڑا ہوا ایک غلط کھانے کو، صحیح طور پر، پوری ایمانداری کے ساتھ پکاتا رہا۔ میں نے قورمے کے نسخے کھچڑی میں اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ استعمال کیے اور سیب کی قاشوں کو، کسی چوپائے کی کلیجی کی طرح لیموں اور مسالے میں بھگو بھگو کر کھاتا رہا۔ سب غلط سلط ہوگیا۔ میرا بیڑہ ہی غرق ہوگیا۔ باورچی خانے کی ساری دیگچیاں بھی ایک دن دور،

وہاں پہاڑوں کی چوٹیوں پر برستے ہوئے پانی میں جا کر گم ہو گئیں۔

تو ساری غلطی میری ہی، میری ہی نکلی۔ صلیب میرے ہی گلے میں لٹکائی جائے گی۔ ایک خاموش عدالت میں گونگوں کی طرح میں اپنا فیصلہ سنتا ہوں۔ بہت مسرت سے بھرا فیصلہ — میرا پھندہ — پھانسی کا پھندہ۔

یہ فروری کا مہینہ ہے۔ دانتوں کے اپنی جگہ چھوڑنے کا مہینہ۔

دو دانتوں کے درمیان میری بھوک آ کر پھنس گئی ہے۔ آج کل میں پتلی اور رقیق غذا کھا رہا ہوں۔ رقیق کھانا دراصل کھانے کی نفی ہے۔ کھانے کا انہدام ہے۔ اس کے بعد، غذائی اجزا صرف ہوا بن کر خلا میں گم ہو سکتے ہیں۔ یہ فروری کا مہینہ ہے۔ دانتوں کے اپنی جگہ چھوڑنے کا بھیانک، تکلیف دہ موسم، وہ خزاں کے پتوں کی طرح کھانے کی رکابیوں میں گرتے ہیں اور چیونٹیاں اُنھیں کھینچ کر نامعلوم جگہوں پر لے جاتی ہیں۔ مگر میرے کسی دانت کو کبھی صحیح جگہ نہیں مل سکی۔ وہ غلط جگہ سے مسوڑھوں کا گوشت پھاڑتے ہوئے باہر آئے، اور کچھ دانت تو ابھی مسوڑھوں کے اندر ہی دبے پڑے ہیں، ابھی باہر نہیں آئے۔

بیوی اور دونوں بیٹے، میرے سامنے ناقابلِ یقین رفتار سے کھانا کھاتے نظر آتے ہیں۔ میرے سامنے دلیہ رکھا ہے، جسے کتوں اور بلیوں کو کھلایا جاتا ہے۔ رقیق گاڑھا سفیدی مائل ملغوبہ۔ میں یہ دلیا کھاتا ہوں۔ میں کھانا نہیں کھاتا، میرے منھ سے صرف کھانا کھانے کی آوازیں نکلتی ہیں۔

ادھر کچھ دنوں سے سوتے وقت پھر میری زبان دانتوں کے درمیان آ کر کٹنے لگی ہے۔ بہت پہلے لڑکپن کی بارش میں جب مجھے اس بے چہرہ لڑکی کے خواب آتے تھے، تب یہ زبان کٹتی تھی، پھر یہ سلسلہ رُک گیا تھا۔ اب میں نیند سے اُٹھ کر سب سے پہلے اپنے ہی خون کا ذائقہ چکھتا ہوں، نمکین، چلو یہاں تو نمک ہے۔ میں اپنے بزرگوں کے شجرے میں اور اُن کے حسب نسب میں اپنا نام فخر سے لکھوا سکتا ہوں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایک دن، کیا میں بھی اُن بزرگوں کے برابر کا ہو گیا؟ اُن سب کی تو، مرنے سے

پہلے یادداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی، مگر مجھے پورا اطمینان ہے۔ مرنے سے پہلے یادداشت باقی ہے۔ سارے لفظ میرے سامنے رقص کرتے ہیں۔ میں سخت سے سخت احساس کو لفظوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ لکھ سکتا ہوں، یہ آسان نہیں ہے۔ یہ ایک دُکھتے ہوئے دانت سے اخروٹ توڑ دینے کے برابر ہے۔ مگر میں نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ میں وہ سب لکھ رہا ہوں جو اگلے زمانوں میں ہوا۔ آدمی مرتا ہے، تو اُس کا مستقبل یا حال اس سے جدا نہیں ہوتا۔ جدا صرف اُس کا ماضی ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد، نقصان صرف حافظے کا ہوتا ہے۔ میں زندہ ہوں، دوسروں سے کہیں زیادہ زندہ۔ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ...

تمام رشتے، بھائی بہن، ماں باپ، بیٹا، بیٹی، شوہر بیوی اور سارے عم زاد — سب کو صرف حافظے کی ڈور ہی تو باندھتی ہے۔ خون کی زنجیر محض ایک حافظہ ہے اور ساری عبادتیں، پوجا پاٹھ، سارے اخلاقی فعل دراصل حافظے سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں ہیں۔ وہاں اُس اوپری دنیا میں کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا۔ وہاں سب اپنی تنہائی میں مسرور ہوں گے۔ ایک بھیانک بے شرمی کے ساتھ۔ ایسی بے شرمی سے تو بھوت بھی پاک ہے کیونکہ وہ اس دنیا سے کوئی نہ کوئی رشتہ تو بہرحال قائم رکھتا ہے۔ وہ انسانوں کو نہیں بھولتا، چاہے اِس رشتے میں کتنی بدنیتی، حسد اور شیطنت بھری ہوئی ہو۔ وہ کسی بھی حال میں اپنے حافظے سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس کی سزا اُسے نکیلے ناخنوں، آنکھوں کے غاروں، اور بھیانک دانتوں کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اس دنیا کے تمام رشتوں، جذبوں، محبتوں، نفرتوں اور پکوانوں کو حافظے سے نکال کر بہشت میں جانے کا کیا فائدہ؟ میدانِ حشر میں، ایک ایسی نفسانفسی کا عالم ہوگا کہ کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا۔ ایسی بہشت میں جانے کا کیا فائدہ جہاں اُسے یہ بھی یاد نہ ہو کہ اُس کا باپ کون تھا؟

میرے سارے جسم پر، میرے گناہوں کی اُنگلیوں کے نشان کھدے ہوئے ہیں۔ ایک کے نیچے ایک — پھر اُس کے نیچے، تہہ در تہہ۔ میں ان سب نشانوں کے ساتھ اپنے جسم کو ڈھوتے ہوئے، اپنی عدالت تک پہنچوں گا، میرے دونوں ہاتھوں میں، یہ بھاری پلندہ ہوگا۔

مگر کیا واقعی کوئی عدالت ہوگی؟ کیا یہ کسی عدالت میں پیش کیے جائیں گے؟ کوئی دادرس ان سیاہ

نشانوں کو دیکھے گا اور پھر اپنی بیاض انصاف میں کچھ لکھے گا؟

کون سی عدالت؟ مجھے وہ عدالت نہیں چاہیے جہاں کسی کا حافظہ اُس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ جہاں مجرم اپنے فعل اور پاپی اپنے کرموں تک کو نہیں پہچانتا۔ وہاں اعمال یا کرموں کی سزا کیسے دی جائے گی؟ بغیر حافظے کے آخر کس طرح؟ ایسی عدالت مجھے نہیں چاہیے۔ میں تو اُس عدالت کی تلاش میں ہوں جہاں میرے جسم پر لگے گناہوں کے یہ نشان سارے جسم پر اچانک اس طرح چمک اُٹھیں گے، جیسے کبھی کبھی اندھیرا چمک اُٹھتا ہے۔ اپنی گاڑھی اور مکمل سیاہی میں ہر روشنی کو جذب کرتا ہوا ایک بلیک ہول۔ شاید یہ عدالت حقیقت اور خواب کے درمیان کہیں ہو۔ جس طرح میرا جسم بھی حقیقت اور خواب دونوں کے کناروں کو چھو چھو کر بہتا رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری سزا میرے جرم کو دھتکار کر عدالت سے باہر کر دے۔ اس لیے میں دوسروں کے لکھے ایک غلط متن کو صحیح طریقے سے پڑھ رہا ہوں۔ میں کہیں اعراب لگا رہا ہوں، کہیں ہٹا رہا ہوں۔ کہیں اضافت لگا رہا ہوں، کہیں مٹا رہا ہوں۔

مجھے بہت ہوشیار رہنا ہے۔ نزلے میں کبھی کبھی مجھ سے غلطی ہو جاتی ہے۔ ابھی میرے پاس ان غلطیوں کو درست کرنے کا وقت نہیں، مگر میرا وعدہ ہے کہ اپنے مقدمے میں، میں اس غلط متن کو مکمل طور پر درست کر کے ہی پیش کروں گا۔

نزلے میں، عدالت کے باہر پڑی اپنی ٹوٹی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، اچانک سو جاتا ہوں۔ نیند مجھے میری قبر کی طرف لے جا رہی ہے۔ ہر نیند ایک ڈاک گاڑی ہے جس کی منزل قبر ہے یہ اور بات کہ اس کے پہیے بار بار دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور سفر ملتوی ہو جاتا ہے۔

نیند میں، میں اپنی قبر کے اندر اُترتا ہوں۔ وہ بالکل تندور کی طرح ہے۔ سرخ سرخ دہکتی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو، وہاں لوہے کی کالی سلاخوں میں لگی ہوئی سفید سفید بڑی بڑی خمیری روٹیاں ہیں۔ مٹی کی خوشبو، آٹے کی خوشبو میں مل گئی ہے۔

ایک جلتی ہوئی سلاخ میری طرف بڑھتی ہے۔ اس کے نوک پر، سفید تندوری روٹی لگی ہوئی ہے۔ میں سلاخ سے گھبرا کر تندور کی جلتی ہوئی سرخ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ سفید روٹی،

سلاخ کی نوک سے نکل کر پوری طاقت کے ساتھ میرے منھ پر لگتی ہے—روٹی کا ایک بھیانک تھپڑ۔ میں درد سے بلبلا اُٹھتا ہوں اور تھپڑ کھاتے اپنے منھ کو، اسی روٹی میں چھپا لینا چاہتا ہوں، میرا منھ روٹی کے آدھے حصے پر جا کر چپک جاتا ہے۔ جلتے ہوئے تندور میں وہ سفید روٹی اب ایسی نظر آتی ہے جیسے آدھے کٹے ہوئے چاند پر جما ہوا کالا خون۔

میں رونے لگتا ہوں۔

اتنے بڑے بڑے دھبے، اتنے بڑے بڑے دھبے۔ میرا ہمزاد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ہلا رہا ہے۔

نہیں دراصل وہ مجھے جگا رہا ہے۔ میں جاگ گیا۔ نزلے میں ناک سے بہی رطوبت میری مونچھوں کے بال میں جم گئی ہے۔ میں منھ دھونے کے لیے سامنے لگی پانی کی ٹنکی کی طرف بڑھتا ہوں۔ ٹنکی پر ایک کوا خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اپنا منھ پہلے ہی دھو چکا ہے۔

مجھے پرانے لوگ یاد آرہے ہیں۔ آج تو وہ بھی یاد آرہے ہیں جو گھر کے نہیں تھے۔ محلّے کے نہیں تھے۔ خاندان کے نہیں تھے، جو شریفوں کی دنیا کے بھی نہیں تھے۔

بڑے ماموں کو محلے کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا بہت شوق تھا۔ محلّے کی کوئی بھی تقریب ہو، شادی، ولیمہ، عقیقہ، چھٹی، بسم اللہ، میلاد شریف، روزہ کشائی، قوالی یا رنڈی کا ناچ۔ سب ہمارے ہی گھر کے سامنے واقع گھیر میں ہوا کرتا تھا اور بڑے ماموں، محلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ دن بھر، شامیانہ اور قناطیں لگوانے، قالین، دری، چاندنی یا میز کرسی لگوانے میں مصروف رہتے۔ محلے میں اگر کسی کے گھر غمی ہو جاتی تو بھی، نمازِ جنازہ سے پہلے، میت کو گھیر میں ہی رکھا جاتا۔ اسی گھیر میں شادی اور ولیمے کی دیگیں پکتیں، پلاؤ، زردہ اور قورمے کی دیگیں۔ روٹیاں لگانے کے لیے گھیر کی کچی زمین میں ہی تندرور کے لیے گڈھا کھودا جاتا۔ گھیر میں سوئم کی فاتحہ یا چالیسویں کے پکوان بھی تیار ہوتے۔

گھیر کیا تھا۔ گھر کے دروازے کے سامنے، ایک بالکل چوکور کچی زمین کا بڑا سا ٹکڑا۔ وہ بالکل چوکور تھا، اور اُس کے دونوں طرف نالیاں تھیں۔ جن میں کالا پانی بہتا رہتا تھا۔ میں بچپن میں اس چوکور گھیر میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ تب تو نہیں مگر اب کئی بار میں نے یہ سوچا ہے کہ ہمارے دانشور حضرات

''دائرے'' کے بارے میں بہت لن ترانیاں اور فلسفیانہ وتصوفانہ موشگافیاں کرتے رہتے ہیں، مگر ''چوکور'' پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ (میں ''چوکور'' کو مربع نہیں لکھوں گا۔ نہ ہی اس کی وجہ بتاؤں گا)

اصل میں چوکور ہونا بڑی پُراسرار بات ہے۔ چوکور چہروں کے اوپر ایک ناقابل تشریح قسم کا وقار ہوتا ہے۔ ان چہروں کو ذلیل کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ذلت کا پتھر، ان چہروں کے وقار سے ٹکرا کر، فوراً اتنی ہی قوت اور تیزی سے واپس آتا ہے اور ذلیل کرنے والے کے چہرے پر پڑ کر، اُسے لہولہان کر دیتا ہے۔

چوکور اشیا آپ کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ آپ یہاں چکر بھی نہیں لگا سکتے کیونکہ یہ وہ دائرہ نہیں جو رقص یا طواف کے لیے عین مناسب ہو۔ ہر طرف سے برابر لمبائی چوڑائی کے برابر مگر آپ کو ہر زاویے، ہر جوڑ پر رُکنا پڑتا ہے۔ لال بند سے والے بلب وہاں روشن ہیں۔ خبردار! ایک ایک قدم رُک کر، ہوشیار، سنبھل کر۔ چوکور گھیر میں تم بہت تیزی کے ساتھ چکر نہیں لگا سکتے۔

مجھے یاد نہیں کہ محلے میں کس کا ولیمہ تھا۔ اُس ولیمے کی خوشی میں رات کو رنڈیوں کا ناچ بھی ہونا تھا۔ میری عمر اُس وقت بمشکل سات سال رہی ہوگی۔ بڑے ماموں صبح سے ہی بہت جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سخت سردیوں کا زمانہ تھا۔ شام سے ہی کہرا گرنے لگتا تھا۔ وہ دو عورتیں تھیں۔ ایک کا نام کلّو جان جو بہت سانولی اور دُبلی پتلی تھی اور دوسری کا نام انجم جان جو بہت گوری اور بھرے بھرے جسم والی تھی۔

رات کے صرف آٹھ بجے ہوں گے، جب گھیر میں سازندوں نے یوں ہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

بڑے ماموں گھر میں آئے اور چپکے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''گڈو میاں، ناچ دیکھو گے۔''

''ہاں۔''

مگر گھر کے دوسرے افراد بگڑ گئے۔ ''بچے کو بھی لہو ولعب کی تعلیم دی جارہی ہے۔'' مگر بڑے ماموں نہ تو کسی کی بات مانتے تھے اور نہ کسی سے دبتے تھے۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر لے کر

آئے۔ گھر میں اندر سے کنڈی لگا کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ سب ناراض تھے اور سرِ شام ہی، اپنے اپنے لحافوں میں دُبک کر سو جانے کا بہانہ کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں رنڈیوں کا ناچ دیکھنا بہت معیوب بات تھی۔ ان سب باتوں کا شوق صرف بڑے ماموں کو ہی تھا۔ چوکور گھیر میں، دری کے اوپر سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ جہاں نہ جانے کہاں کہاں سے آ کر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سڑک پر بلکہ نالیوں تک میں پیر ڈال کر، کچھ لوگ اُچک اُچک کر گھیر میں دیکھ رہے تھے۔ محلے کی کچھ چھتوں پر، عورتوں کے سائے منڈلا رہے تھے۔ سب کی توجہ اور تجسس کا مرکز ہمارا گھیر ہی تھا۔

گھیر میں گیس کی کئی لالٹینیں روشن تھیں۔

بڑے ماموں میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجمع کو چیرتے ہوئے اندر آئے اور مجھے گھیر کے بالکل درمیان بٹھا دیا۔

اب میں نے اُنھیں دیکھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ نیلے کپڑوں میں، ماتھے پر بہت بڑا جھومر، کلائیوں میں چوڑیاں ہی چوڑیاں۔ آنکھوں میں کاجل ہی کاجل۔ ہونٹ بہت سرخ اور نرم و نازک۔ رخساروں پر جیسے سونے کے ذرات چمک رہے تھے۔

''لو انجم جان! یہ ہمارے بھانجے ہیں، گڈو میاں، گانے کی شروعات ان کی پسند سے ہوگی۔'' بڑے ماموں نے ایسی اپنائیت اور حق کے ساتھ کہا جیسے وہ انجم جان کے پرانے واقف کار رہے ہوں۔

میں شرما گیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ سازندوں نے نہ جانے کون سا ساز چھیڑ دیا۔ میرے کانوں میں فحش جملوں اور گالیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔۔۔ مجمع شور مچا رہا تھا۔

تب اُنھوں نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے میری ٹھوڑی چھوئی۔

''گڈو میاں! ہمیں دیکھو۔'' وہ اِس دنیا کی سب سے شیریں آواز تھی۔

میں نے شرماتے ہوئے اُنھیں دیکھا۔

اُن کا چہرہ چوکور تھا۔ اتنا چوکور چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اب اُن کی سفید ٹھوڑی پر ایک کالا تل بھی نظر آیا۔ انھوں نے دوپٹہ سر سے اوڑھ لیا۔

''گڈو میاں، کیا سنیں گے۔'' اُن کی مترنم آواز سے میرے کانوں میں رس گھلنے لگا۔ میں ایک چھ سات سال کا احمق سا بچہ۔ میری کیا فرمائش ہوسکتی تھی مگر اُن کے چہرے کے رعب نے مجھے اُس زمانے کے فلمی گیتوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔

''بتائیے نا کیا سنیں گے آپ؟ آپ جو کہیں گے، وہی سناؤں گی۔'' انھوں نے شاید میرے ادب میں دوپٹے کو سر پر بہت سنبھال کر اوڑھا اور اپنی کاجل بھری، بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے بہت غور سے دیکھا۔

''بہارو پھول برساؤ، میرا محبوب آیا ہے۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''آ—اچھا۔'' وہ آہستہ سے ہنسیں۔ پھر سازندوں کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ سازندوں نے محمد رفیع کے گائے ہوئے اس بے مثال گیت کی دُھن چھیڑ دی۔ وہ آہستہ سے کھڑی ہوئیں۔ ان کے نیلے رنگ کے بھاری غرارے نے چاروں طرف ایک گردش سی کی۔ میں اُن کے چوکور باوقار چہرے کی تاب نہ لا سکا۔ انھوں نے گانا شروع کیا۔ ان کی آواز میں کوئی ایسی پُراسرار شے تھی کہ میرا جی چاہتا تھا کہ اس آواز سے لپٹ جاؤں۔ وہ آہستہ آہستہ گیت کی دُھن پر رقص کر رہی تھیں۔ ایک ٹھہرا ٹھہرا، چوکنا، پاکیزہ اور پُر غرور چوکور رقص۔

مجھے ہوش نہیں کہ میں کہاں تھا۔

پھر گیت ختم ہوا۔ رقص ختم ہوا۔ ساز رُک گئے۔ محفل میں سناٹا چھا گیا۔

مگر وہ بیٹھیں نہیں، خاموش میرے سامنے کھڑی رہیں۔

تب بڑے ماموں نے اپنے کرتے کی جیب سے نکال کر مجھے پانچ روپے کا ایک نوٹ دیا۔

''گڈو میاں! انھیں دے دو۔''

میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی مگر سہم کر، میں نے اُن کی طرف بغیر دیکھے، نوٹ بڑھا دیا۔

اچانک وہ جھکیں اور میرے سامنے دوزانو بیٹھ کر، اُنھوں نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ انھوں نے مجھے سر جھکا کر سلام کیا۔ اور نوٹ کو میرے اوپر سے دوبار گھماتے ہوئے، اُسے قریب بیٹھے سازندے کو تھما دیا۔

پھر، انھوں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اُن کے ہاتھ بہت گرم تھے، جیسے اُنھیں بخار ہو، میں نے غور سے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے یاد ہے اُن کی کاجل لگی بڑی بڑی غلافی، آنکھوں میں آنسو تھے۔

اُنھوں نے جھک کر میرے ماتھے کا بوسہ لیا اور آہستہ سے کہا۔

''بس اب تم گھر جا کر سو جاؤ، گڈو میاں۔''

بڑے ماموں نے میرا ہاتھ پکڑا اور دروازے تک لے آئے۔ پتہ نہیں کس نے دروازہ کھولا اور مجھے زور سے اندر کھینچتے ہوئے کنڈی لگادی۔ بڑے ماموں، باہر دروازے پر ہی کھڑے رہے میں لحاف میں دُبک گیا۔ گھر میں اندھیرا تھا، مگر باہر گھیر میں گیس کی لالٹینوں سے چھن چھن کر، گھر کی منڈیروں پر ایک پاکیزہ، اُداس نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اب باہر سے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیچ بیچ میں کسی ساز کی آواز ہوا کے دوش پر بلند ہوتی، پھر ڈوب جاتی۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے گھٹنے پیٹ سے ملا لیے۔ آہستہ آہستہ لحاف میں گرمی آتی گئی، میں سو گیا۔

صبح جب میں جاگا تو پورے گھر میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

معلوم ہوا کہ رات بھر، شہر کے نہ جانے کون کون سے چھٹے ہوئے بدمعاش اور شہدے وہاں اکٹھا رہے، اور پھر کسی بات پر آپس میں چاقو بھی چل گئے۔ پولیس آئی اور کئی غنڈوں کو پکڑ کر لے گئی۔ پولیس نے ناچ رُکوا دیا۔ اور انجم جان اور کلو جان دونوں کے بال پکڑ کر انھیں کھینچتے ہوئے اپنی گاڑی میں ڈال کر پتہ نہیں کہاں لے گئے۔

کئی دن تک میں انجم جان کو یاد کر کے دروازے میں چھپ کر روتا رہا۔ اکثر میرا دل چاہتا کہ میں بڑے ماموں سے اُن کے بارے میں کچھ پوچھوں مگر میری ہمت نہ ہو سکی۔

لیکن افسوس کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور وہ میرے ذہن سے محو ہو گئیں۔

آج اس خوفناک نزلے نے اچانک مجھ پر یہ انکشاف کیا ہے کہ اُن کی آواز میں جو پُراسرار شے

تھی وہ ممتا تھی۔ آج ہی مجھے نزلے نے یہ بھی بتایا کہ وہ شاید میری زندگی میں پہلی عورت تھیں جنھوں نے میرا احترام کیا تھا۔ میرے معصوم بچپن کو سلام کیا تھا۔ اور پھر اُس گندی جگہ سے چلے جانے کو کہا تھا۔

مگر مجھے شکایت ہے، وہ دوبارہ کبھی مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئیں؟

پھر کبھی اُنھوں نے میرے ماتھے کو پیار کیوں نہیں کیا؟ وہ کہاں چلی گئیں؟؟ کیوں چلی گئیں؟

اور مجھ پر کیسے کیسے وقت گزر گئے۔ جس معصوم بچپن کو اُنھوں نے جھک کر سلام کیا تھا، وہ جلد ہی کتنا داغ دار اور خونم خون ہو گیا۔ اور اُنھیں پتہ بھی نہ چلا۔ وہ مجھے اس لیے تو نہیں بھول گئیں کہ بدقسمتی سے اُن کے نام کے آگے پیچھے بھی ''انجم'' ہی لگا تھا۔ کاش! اگر آج وہ میرے سامنے آجائیں تو میں نزلے میں گرفتار کھانستا، چھینکتا ایک عمر رسیدہ آدمی، جھپٹ کر اُنھیں اپنی روح پر لگے داغ دکھاؤں—

''بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔

اتنے بڑے بڑے دھبے، اتنے بڑے بڑے دھبے۔

تو میں یہ دھبے کس کو دکھاؤں؟ خدا تو خیر دیکھ رہا ہے مگر میں ان دھبوں کو کسی انسان کو بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ میری آخری آرزو ہے، پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ کیا خبر ہر انسان کی روح پر اتنے بڑے بڑے ہی دھبے ہوں۔ شاید ہر انسان اتنا ہی پُراسرار ہو جتنا کہ میں۔ ہر انسان دوسرے انسان کے لیے ایک ٹھگ ہے۔ انسان اپنے ظاہری مذہب کے ساتھ ساتھ، ایک خفیہ مذہب بھی اپنے باطن میں چھپائے چھپائے زندگی گزارتا ہے۔ ایک خونیں مذہب، ایک ٹھگ کے خفیہ مگر شاید اصل اور بھیانک مذہب کی طرح۔ ہم سب ٹھگ ہیں۔ کون کب کس کو جھرنی، کٹوری یا تمبا کو لانے کا حکم دیتا ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں چھپا ہوا، دوسرے کے گلے میں ڈالنے کے لیے ایک پھندہ ہے اور ہر شخص دوسرے کی قبر کھودنے میں مصروف ہے۔

محبت تک اس خونیں مذہب کے سامنے بے بس و لاچار ہے۔ وہ بھی ''جھرنی'' کے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔ محبت پیچھے سے آکر، گلے میں رومال کا پھندہ ڈالتی ہے۔

مجھ سے بڑا ٹھگ کون تھا؟ میں چلتا جا رہا ہوں۔ اس خونی زمین کے اوپر، ایک اکیلے ٹھگ کے مانند، قافلے سے بھٹکا ہوا۔ جہاں ہر کوئی کسی کا تعاقب کر رہا ہے۔ ٹھگوں کے سائے بڑھتے جاتے ہیں اور زمین قبروں سے بھرتی جاتی ہے۔ لہلہاتی گھاس، پھولوں اور پودوں سب کے نیچے سڑتی گلتی ہڈیاں، انسانی پنجر۔ پنجر ہی پنجر۔

یہ سب محض الفاظ نہیں ہیں، تاریخ ہیں۔ بار بار ایک خونی غسل کرتی ہوئی تاریخ، میں اس تاریخ کے کسی نقطے پر، پاگلوں کی طرح بکرے کی نلی والی ہڈیاں چوسنے لگتا ہوں۔ نلی میں گودے کی جگہ میری ہی ناک سے نکلا نزلے کا پانی بھرا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ان خالی ہڈیوں کو انجم کے منھ پر دے ماروں۔ اب تو مجھے آدھی روٹی کو چبانے میں صدیاں گزر جاتی ہیں، مگر میری رکابی کی جھوٹن نہیں ختم ہوتی۔ میری انگلیاں، اُن کے پور، میرے ہونٹوں کے کنارے، سب اس جھوٹن سے سنتے جاتے ہیں۔ میرے بچپن کے دودھ ڈبل روٹی کا، تام چینی کا سفید پیالہ، چھت کی منڈیر پر رکھا رہا اور سارا دودھ، منڈیروں پر گھومتی آسیبی بلیاں پی گئیں۔

اگر میرا پیٹ نہیں بھرا، اور اگر مجھے کھانے میں نمک نہیں ملا تو ایک دن یقیناً میں اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دوں گا۔

کئی بار، میرے جسم کے اندر رہنے والے، غصے کے اس طویل القامت تاریک سائے نے، انجم کے گلے میں پیچھے سے رومال کا پھندہ ڈالنا چاہا ہے، مگر اُسی وقت ایک معصوم توتلی زبان نے اُسے اُلٹے پاؤں واپس کر دیا ہے۔ ''پاپا— میرے پاپا۔''

مگر یہ سب کوئی نہیں جانتا۔ یہ میرا راز ہے، جس سے کوئی واقف نہیں، سوائے مُردوں کے۔

ہم اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ راز بھی، بس چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، اس لیے انھیں چھپایا جا سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرح، جیسے ہیرا، موتی، کوئی نکیلا پتھر یا کوئی چاقو۔ مگر نہیں یہ راز نہیں ہیں۔ راز تو دراصل بہت بڑا ہوتا ہے، وہ اپنی وسعت اور اپنے حجم کی وجہ سے سب کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ جیسے زمین کے لیے سورج نظر آنے کے باوجود ایک راز ہے۔

میں بھی خوفناک حد تک وسیع و عریض اسرار کے ساتھ زندہ ہوں اور لطف کی بات یہ کہ مجھے کوئی

نہیں جانتا۔ میرے راز یا بھید کو کوئی نہیں جانتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا مگر، اگر موت نے مجھے کبھی تاڑ ہی لیا تو میں ایک اکیلی موت سے اجتماعی موت کی طرف جانا چاہوں گا۔ میں بہت سی ایسی انسانی آنکھوں کو تلاش کرنا چاہوں گا جو بھیانک شور کے بعد، سناٹے میں میرا ساتھ کرسکیں۔ میں یقیناً اور واضح طور پر، اپنی موت میں کئی حصوں کا متلاشی ہوں۔ اپنے آباؤ اجداد کا شجرہ تو میں، بہت پہلے گندی نالیوں میں بہا آیا ہوں مگر موت کی جائیداد کے کاغذوں میں، میں سب کے نام روشن مگر کالی سیاہی سے لکھا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایسے بہت سے گواہ تلاش کر رہا ہوں جو میرے لیے سارے ثبوت جمع کرسکیں۔

سردی بڑھ گئی ہے، نزلہ اب سارے جسم پر گر چکا ہے۔ ایک ملبے کی طرح۔ میں اب ملبے میں ہوں۔ میرے پاؤں نزلے کے اندر کچل کر رہ گئے ہیں۔

انھیں کچلے ہوئے پیروں کے ساتھ، میں صبح اُٹھ کر کورٹ جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ بلکہ وہ صبح نہیں، آدھی رات ہوتی ہے جب میں کورٹ جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ میرے منھ سے نیند کی بو آتی ہے اور سوتے میں دانتوں کے بیچ زبان آجانے کے باعث ہونٹوں کے کنارے سے ٹھوڑی پر بہتا ہوا خون، مجھے دن کے پہلے اور آخری نمکین ذائقے سے روشناس کراتا ہے۔ میرے گالوں میں رات بھر کے بہے ہوئے نزلے کی بساندھ ہوتی ہے۔ منھ سے سانس کا جو بھبکا نکلتا ہے اُس میں رات کے کھانے کے غیر ہضم ذرات سے پیدا شدہ گیس کے ساتھ نیند کی بُو اندھیرے، ٹھنڈے فرش پر گرنے لگتی ہے۔ جہاں میں اپنی چپلیں ڈھونڈتا ہوں۔ بیت الخلا میں پیشاب کی دھار سے اُٹھتی کھراند کے ساتھ سب گڈمڈ ہوجاتا ہے۔ آدھی نیند میں کیا گیا یہ پیشاب، خواب میں کیے گئے پیشاب سے مختلف نہیں ہوتا۔ اور میرے خواب ہمیشہ ہی اس قسم کے تھے۔ وہ زیادہ تر پاخانوں یا پھر ویران مکانوں سے ہوکر گزرے بالکل اسی طرح جیسے میں بھی ایک عریاں مجرم بنا، کھنڈر ہوتے ہوئے قدمچوں پر تمام عمر کھڑا رہا۔

میں جرم اور گناہ کے لیے قربانی کا ایک جانور بنا، یہی میرا مقدر رہا۔ قربانی کا جانور جس کے ماتھے پر ایک نشان بنا ہے۔ اور یقیناً میں وہی ہوں۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ قربانی کا جانور بھی اپنے اندر ایک ایسا کینہ پرور نقص چھپائے رکھتا ہے جس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی، پھر اُس کے منھ میں ہاتھ ڈال کر،

چاہے کتنے بھی دانت گنیں جائیں اور کمر اور پیٹ کے گوشت کو کتنی ہی تھپکیاں دے دے کر، اُس کے اندر سے نکلنے والے گوشت کے وزن اور مقدار کا اندازہ لگایا جائے، وہ اپنے بھینچے ہوئے دانتوں کے عقب میں مسوڑھوں کے لال گوشت میں ایک پُراسرار کینہ پوشیدہ رکھتا ہے، جہاں سے ایک آفاقی بدُعا نکل کر، اُس کی زبان اور جبڑوں سے ٹکراتی ہے اور منہ سے نکلنے والی سانس کے ساتھ، خلا میں، لامحدود زمانوں سے جمع، سڑی ہوئی اور رُکی ہوئی آندھیوں میں جا کر چپکے سے بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے پیٹ پر جمی ہوئی چربی کی تہہ میں ایک ایسا خاموش زہر چھپا ہوتا ہے، جسے صرف قربانی کا جانور ہی جانتا ہے۔

جرم، سزا کی نقل کرتا ہے اور گناہ ثواب کی۔ میں اس تماشے کو ڈگڈگی بجا بجا کر دکھانے کے لیے قربان گاہ میں لایا جاتا ہوں۔ یہ ساری دنیا اسی طرح کا تماشہ ہے۔ نقل کر کے ہی یہ دنیا بنی ہے۔ انسانوں نے خدا کی نقل کرنا چاہی، وہ بے رحم اور آمر ہو گئے۔ جانوروں نے انسان کی نقل کی، وہ اسی کی طرح کمینے اور بے شرم ہو گئے۔ بچوں نے بڑوں کی نقل کی، ان کے زیرِ ناف بال جلدی اُگ آئے۔ عورتوں نے مردوں کی اور مردوں نے عورتوں کی نقل کی، دونوں ہجڑے بنتے چلے گئے۔

دنیا کی نوٹنکی، قربان گاہ میں جاری ہے۔ چاقو کے پھل میں لپٹی آنتیں، ٹپکتا اور بہتا ہوا خون، زمین لال، نالیوں میں بہتا رُکتا، لال پانی، مجمع کھڑا تماشہ دیکھتا ہے۔ ذبح کا تماشہ، ایک ایسا جادو جس سے زیادہ دلچسپ اور کشش انگیز دوسرا کوئی جادوئی کھیل نہیں ہو سکتا۔ جانور کا سر کس طرح اُس کے جسم سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور ذرا سے فاصلے سے، الگ کنارے پر پڑا پڑا، اپنے باقی جسم کے ٹکڑے اور بوٹیاں ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اُس کے چہرے پر لگی حیرت زدہ آنکھیں کس طرح سب کچھ دیکھتی ہیں۔ یہ رہا گُردہ اور یہ کلیجی۔ تازہ خون میں ڈوبے۔ یہ دل، یہ پھیپھڑے، یہ آنتیں اور اوجھڑیاں اور یہ پائے۔ یہ بھیجہ، یہ کان اور یہ کلّا... سب الگ الگ، سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ چھریوں کے شامیانے تلے، سکون اور آرام سے، یہ ایک الگ تماشہ ہے، ٹی وی پر چل رہے کسی تماشے کے نیچے، پٹی پر ایک کمزور سے اشتہار جیسا۔

نقل در نقل کا یہ سلسلہ طویل ہو چلا ہے۔ اب کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سزا قتل کی نقل تھی یا قتل سزا کی نقل۔ اگر کوئی جانتا ہے تو وہ نیلے آسمان میں دور بیٹھا خدا ہے یا پھر، ایک کاکروچ۔ کاکروچ جس کا بوجھ پتھر کی اُس وزنی سل سے بھی زیادہ ہے، جس پر آفتاب بھائی کے بھیجے کے ریشے ابھی بھی چپکے ہوں گے۔ ابھی میں، اُس کاکروچ کے وجود کا بوجھ نہیں سہہ سکتا۔ مگر کاش کہ ایک دن آئے جب وہ منحوس صورت کاکروچ ایک تتلی کی طرح اُڑ کر میری قمیص کے کالر پر بیٹھ جائے۔

بیت الخلا سے نکل کر، میں منہ دھوتا ہوں۔ نزلے میں، میں نہاتا نہیں ہوں۔ میری گردن پر میل جم گیا ہے۔ مگر میں اُس کی کوئی پرواہ نہ کر کے سیدھا باورچی خانے میں گھس جاتا ہوں۔ میں اپنے ہلتے ہوئے دانتوں کے لیے ایک ایسا کھانا تلاش کرتا ہوں جو کھانے کی نفی ہے۔ انجم کو دیر سے اُٹھنے کی عادت ہے، مگر دونوں بیٹے فجر کی نماز کے لیے نکل رہے ہیں۔ مجھے اُسی طرح دیکھتے ہوئے جیسے، صدیوں پہلے مجھے کسی نے دیکھا تھا۔ شاید انجم نے شادی سے پہلے مجھے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اسی طرح دیکھا تھا جیسے میں آم کی ایک کچی قاش تھا جس کا وہ گرم تیل اور مسالوں والے مرتبان میں اچار ڈالنے جا رہی ہو۔

میں اِن آنکھوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

میں کورٹ کے لیے پیدل گھر سے نکلتا ہوں۔ سڑکوں پر بھیڑ بھاڑ، اب اس شہر میں بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ مہانگر بنتے اسے بھی زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ ہر شخص نزلے میں مبتلا ہے، مگر پتہ نہیں کہاں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اس ملک میں کرنے کے لیے اتنے کام کب سے پیدا ہو گئے ہیں؟ میں سڑک پر لوگوں کے دھکوں، چھینکوں اور کھانسیوں سے بچتے بچاتے چلتا جا رہا ہوں۔

میں کورٹ پہنچتا ہوں، اس کی بلند و بالا وکٹورین عہد کی سفید عمارت صبح گیارہ بجے بھی کہرے میں ڈوبی نظر آ رہی ہے۔ یہ کہرا دوپہر سے پہلے نہیں چھٹے گا۔ اور دوپہر نہ جانے کب ہوگی۔

کچہری میں بھی عجب افراتفری کا منظر ہے۔ چھینکتے، کھانستے، رومال سے اپنی سرخ ناکوں کو رگڑتے پونچھتے ہوئے، گھٹنوں سے نیچا سیاہ چوغہ پہنے وکیل ادھر سے اُدھر بھاگتے نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے مؤکلوں کی بھیڑ ہے۔ کچھ بیکار بیٹھے وکیل، نئے مؤکلوں کی تلاش میں، چوکنے اور مستعد

ہوکر، اپنی عقابی نظروں سے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ میں ایک کورٹ میں جا کر بیٹھتا ہوں۔ جائیداد کے ایک مقدمے کی سنوائی میں، پھر اُکتا کر دوسری کورٹ میں، جہاں عصمت دری کا ایک مقدمہ چل رہا ہے۔ میں یوں ہی ایک کورٹ سے دوسری کورٹ، ایک مقدمے سے دوسرے مقدمے میں، جا جا کر بیٹھتا ہوں۔ مجھے دوپہر کا انتظار ہے، جو پتہ نہیں آسمان میں کہاں اٹک کر رہ گئی ہے۔

ہر عدالت میں بیٹھا ہوا منصف بھی اپنی ناک رومال سے پونچھ کر شوں شوں کر رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کو نزلے کے پانی نے دھندلا کر دیا ہے۔ وہ بے دلی کے ساتھ اپنے سامنے رکھی دستاویزوں کو اِدھر اُدھر پلٹ رہا ہے۔ پھر آگے کی کوئی تاریخ دے کر مقدمے کو ملتوی کر رہا ہے۔

میں لوٹ پھیر کر اپنے محرّر کے پاس آتا ہوں۔ میرے اور اُس کے پاس آج کل کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے۔ دونوں دن دن بھر بیٹھے یا تو مکھیاں مارتے رہتے ہیں یا ہائی کورٹ کی وسیع و عریض عمارت میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہاں، اِدھر آ کر میں نے یہ ضرور سوچا ہے کہ جلد ہی کورٹ کی لائبریری میں بیٹھنا شروع کر دوں گا۔ لائبریری بہت اچھی ہے اور یہاں تقریباً ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔ کتنا عرصہ گزر گیا، کب سے میں نے ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔ میں ساری سائنس، سارا فلسفہ اور سارا تنتر منتر بھولتا جا رہا ہوں۔ جہاں تک قانون کی کتابوں کا سوال ہے تو ان سے تو تقریباً میں نے اب اپنا پیچھا چھڑا ہی لیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ قانون کی کتابیں ہی مایوس اور نامراد ہوکر مجھ سے دور چلی گئی ہیں۔

اوّل تو مجھے کیس ملتے ہی نہیں تھے، اور اگر ملتے بھی تو میں اُنھیں ہار جاتا۔ خیر یہ تو کوئی اتنی خاص بات نہیں، مگر بارہا میرے ساتھ یہ ستم ظریفی بھی ہوئی ہے کہ مثال کے طور پر ایک لٹیا چور کو عدالت اور مقدمے کی کارروائیوں میں میری حماقتوں نے عمر قید بامشقت کی سزا دلا دی یا مخالف پارٹی کے کسی ڈکیت کو میری حماقت کی وجہ سے بری کر دیا گیا اور مخالف پارٹی باقاعدہ میرا شکریہ ادا کرنے آئی۔ اور ایک بار تو بلیک میں سنیما کے ٹکٹ بیچنے والا ایک غریب میری اُلٹی سیدھی پیروی اور دفعات کے غلط نمبر بیان کرنے کے نتیجے میں پھانسی کے پھندے پر جھولتے جھولتے بچا۔

ان حالات میں، ظاہر ہے کہ مجھے اپنا تھوڑا بہت جیب خرچ نکالنا بھی مشکل پڑ گیا۔ گھر کے خرچ کی مجھے کبھی پرواہ نہیں رہی۔ کیونکہ میرے بیوی بچّوں کی کفالت کا ذمہ مکمل طور پر علاء الدین نے لے رکھا تھا۔ علاء الدین کے پاس دولت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اب تو شہر میں، اس کی کئی کئی کوٹھیاں تھیں، اس طرح سے دیکھا جائے تو میں خاصی کمینگی کے ساتھ علاء الدین کے اوپر کیے گئے اپنے احسان کی قیمت وصول رہا تھا۔

کورٹ میرے گھر (انجم کا فلیٹ) سے بہت دور نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں جب آج یہ نفرت انگیز کہرا چھا ہی نہیں، اور دوپہر ہونے میں آئی ہی نہیں، تو مجھے زور کی بھوک لگنے لگی۔ حالانکہ میرے دانت بہت دُکھ رہے ہیں، اور ہل بھی رہے ہیں، جیسے ہوا سے خزاں رسیدہ پتا کانپتا ہے، مگر میرا جی بے اختیار ارہر کی دال کی کھچڑی کھانے کو چاہنے لگا۔ مجھے معلوم ہے کہ جاڑوں کے دنوں میں انجم دوپہر کے کھانے میں صرف اور صرف ارہر کی دال کی کھچڑی پکاتی ہے۔ جسے وہ طرح طرح کے اچاروں، مربّوں اور چٹنیوں کے ساتھ، خود بھی کھاتی ہے اور اپنے جوان کڑیل لونڈوں کو بھی کھلاتی ہے۔ اچار مربّوں کے خیال سے میرے منھ میں پانی بھرنے لگا۔ ادھر آکر جب سے میرے دانت ہلنا شروع ہوئے ہیں، میں کچھ ندیدہ ہو گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کی قوت شامہ اور قوت ذائقہ کے اجزا کب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھریں گے؟

میں نے ارہر کی دال کی کھچڑی کے لیے، گھر کے راستے پر لمبے لمبے ڈگ بھرنا شروع کر دیئے۔
مگر انسان کیا اپنی بدقسمتی سے بچ کر کہیں جا سکتا ہے؟

گھر میں مسالے دار بھیجہ پکا تھا!

''آج ارہر کی دال کی کھچڑی نہیں پکائی؟'' میں کھسیا کر انجم سے کہتا ہوں۔

''نہیں! بچّے بھیجہ کھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے صبح ہی لا کر رکھ دیا تھا۔'' انجم سردمہری سے جواب دیتی ہے۔

مجھے اور غصہ آ جاتا ہے۔ ''تو جو بچّے چاہیں گے کیا وہی ہوگا؟''

''ہاں بالکل اور بھیجہ تو سردیوں میں کھایا ہی جاتا ہے۔'' انجم بحث پر اتر آتی ہے۔

''کہاں ہیں وہ دونوں؟ میں انھیں سمجھاؤں گا کہ بھیجہ کھانا اچھی بات نہیں۔ اس میں کیڑے ہوتے ہیں۔ زہریلے، ننھے ننھے کیڑے جو نظر نہیں آتے۔ اور آدمی میں پاگل پن کے جراثیم پیدا کر دیتے ہیں۔ انسان کا دماغ اُلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں کبھی بھیجہ نہیں کھایا گیا۔''

''تو تم اپنے آپ کو صحیح الدماغ سمجھتے ہو؟''

''میں پوچھتا ہوں دونوں ہیں کہاں؟''

''پتہ نہیں دیر سے باہر ہیں۔ اب تو جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے ہوں گے۔''

ٹھیک اُسی وقت مجھے نزلے کا ایک شدید دورہ پڑا۔ کچھ غیر معمولی سا نزلہ۔ میرے گلے میں جیسے ڈھیر سا بلغم آکر اکٹھا ہو گیا۔

جیسے حلق میں کسی نے لوہے کی موٹی سلاخ ڈال دی ہو۔ میرا گلا پھول کر جیسے پھٹنے والا تھا۔ میں نے کھنکھارنا چاہا تو میری سانس اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ ناک اور کانوں میں رطوبت اکٹھا ہوتی ہوئی محسوس کی۔ اور دونوں میں گھناؤنی سیٹیاں بجنے لگیں۔ آنکھوں میں نزلے کا پانی جمع ہو گیا، مگر باہر نہیں ٹپکا۔ نزلہ نہ جانے کیوں بہہ نہیں رہا تھا۔

نزلہ غیر معمولی طور پر، اچانک جم گیا تھا۔ سارے جسم میں جیسے برف جمتی جا رہی تھی۔ مجھے چکر سا آتا محسوس ہوا۔

جس طرح شدید سردیوں کے دنوں میں پانی کے جم کر برف بن جانے کے باعث گھروں میں آنے والے پانی کے پائپ پھٹ جایا کرتے ہیں، اُسی طرح مجھے لگا جیسے بس میرا جسم ایک دھماکے کے ساتھ پھٹنے والا ہے۔

نہیں — یہ نزلہ نہیں ہے، یہ وہ نزلہ نہیں ہے۔ میں حواس باختہ ہو اٹھا، اور تب ہی باورچی خانے میں بھینس کے بھیجے میں میتھی کا بگھار لگا۔ میتھی کی تیز مہک، بھیجے کی بساندھ کے ساتھ مل کر پورے گھر میں چکرانے لگی۔

''اب سمجھ میں آیا۔'' اچانک میری سانس واپس آ گئی۔ آنکھوں سے پانی باہر آ گیا۔ حلق میں پھنسا ہوا بلغم واپس پھیپھڑوں کی سیاہی میں چلا گیا۔ ناک اور کان صاف ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سر کی جلن کم ہو گئی۔ نزلے کی برف پگھلنے لگی۔

''اب سمجھ میں آیا۔ آج اس وقت جب مسجد میں جمعے کی نماز ختم ہو چکی ہوگی، گھر میں بھیجہ نہیں پکنا چاہیے تھا۔'' میں نے خود سے کہا۔

انجم باورچی خانے سے باہر آئی۔ نزلے سے اُس کی ستواں بے رحم ناک اس طرح لال ہو رہی تھی جیسے چولہے کی سلیٹی راکھ میں دہکتی لکڑی کی نوک۔ اُس نے میرے سامنے پیتل کی ایک کٹوری میں میٹھا دلیہ رکھ دیا (یہ ساری واہیات کٹوریاں انجم ہی اپنے مائیکے سے لائی ہے)۔ میں بیٹھ کر دلیہ کھانے لگا۔ مگر میری بھوک اب غائب ہو چکی تھی۔ دلیہ مجھ سے کھایا نہ گیا۔ میرے ہلتے ہوئے دانتوں تک نے اُسے چبانے سے انکار کر دیا۔ میں نے پامیرین کتّوں کو کھلائے جانے والے اس کھانے کی کٹوری کو اُٹھا کر الگ رکھ دیا اور میز پر پڑے اوسط درجے کے، ایک نئے کھلنے والے ہوٹل کے مینو کا اشتہار دیکھنے لگا۔

مٹر پلاؤ۔

وِیج بریانی۔

قورمہ (بلکہ کورمہ)۔

دم آلو۔

زیرہ آلو۔

شاہی پنیر۔

کڑھائی گوشت۔

چکن چنگیزی۔

مٹن نہاری۔

قیمہ کلیجی (بلکہ کیمہ قلیجی)

کشمیری اسٹو۔

دال مکھانی۔

رومالی روٹی۔

تندوری روٹی۔

مِسّی روٹی

بٹر نان۔

فہرست بہت لمبی تھی۔ کہیں دور۔ یکے بعد دیگرے دوز بردست پٹاخے چھوٹے ہیں۔

میں سنتھیسیا کا مریض نہیں ہوں جس کے پانچوں حواس اپنی ہم آہنگی چھوڑ چکے ہوں۔ مگر پھر بھی میں رنگوں کی آواز کو سن لیتا ہوں۔ ہرے، پیلے، لال رنگ کے کھانوں کی خفیہ آوازیں۔ خون کے رنگ کو بھی میں سنتا ہوں۔ لفظ ''بریانی'' کورڑی کاغذ پر لکھا دیکھ کر ہی میں اُسے کھانے لگتا ہوں۔ میں نے سارے کھانے ہمیشہ اسی طرح تو کھائے، جو کسی نہ کسی کاغذ پر لکھے ہوتے تھے یا پھر اُن بلوں پر جو کھانا کھا چکنے کے بعد ادا کر دیئے جاتے تھے۔ اُن بلوں پر کھانوں کے نام لکھے ہوتے تھے۔ میں نے کاغذ پر لکھے کھانوں کے ناموں کو ہی واقعتاً ذائقہ لے لے کر کھایا۔ اسی لیے تو میں، 'کھانوں' کی تمام سازشوں سے بخوبی واقف ہوں کیونکہ میں نے 'کھانا' نہ کھا کر 'کھانے' کا لفظ کھایا ہے۔ لفظ جس میں دنیا زمانے کی تمام تباہ کاریاں، مغالطے اور دہشتیں پوشیدہ ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ سلسلہ دودھ میں گرنے والی ایک زہریلی چھپکلی سے شروع ہوا تھا۔ شاید وہیں سے کوئی کینچوا میری آنتوں میں پل گیا اور بصیرت کی نئی دنیاؤں سے مجھے روشناش کرا گیا۔ میری آنکھوں کی روشنی کا ماخذ یہی کیچوا ہے۔ ایک پُراسرار، نظر نہ آنے والا جگنو جس کا تعلق ہماری بھوک، بدنیتی اور اُس پکوان سے ہے جو ہم روز صبح و شام کھاتے ہیں۔ چولہے پر غذا کے پکنے کے بعد، یہ کینچوا میری آنت میں جاگ کر کلبلانے لگتا ہے اور بدقسمتی اور بدشگونی کے تمام پوشیدہ جہات مجھ پر روشن کر دیتا ہے۔ یہ کام صرف ایک کینچوا ہی انجام دے سکتا ہے۔ آنتوں کا کینچوا — دیوہیکل درندے نہیں۔ مجھے

اندیشہ ہے کہ اگر کبھی غلطی سے میرے فضلے میں لپٹ کر، یہ کینچوا نالی میں بہہ گیا تو میرا اپنا وجود ایک قطعی طور پر ناکارہ شے میں بدل جائے گا۔ کباڑ کی کسی شے کی طرح پھینک دیے جانے کے قابل۔

''یہ دونوں نماز پڑھ کر آئے نہیں؟'' میں انجم سے پوچھتا ہوں یا شاید خود سے۔ باہر ایک شور سنائی دے رہا ہے۔ پولیس کی کئی گاڑیاں، پے در پے سائرن دیتی ہوئی نکلتی چلی گئی ہیں۔ انجم کھڑکی کھول کر نیچے جھانکتی ہے۔ میں بھی کھڑکی کے قریب جاتا ہوں۔ دھوپ نہیں نکلی ہے مگر دور مشرق میں، کہرا کچھ زیادہ کالا نظر آرہا ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں، یہ کہرا نہیں، دھواں ہے، گاڑھا سیاہ، تازہ دھواں۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ انجم بڑھ کر دروازہ کھولتی ہے۔

علاءالدین ہانپتا کانپتا، زکام سے شوں شوں کرتا اور نزلہ پونچھتا، اندر آتا ہے۔ اس کی پھولی ہوئی توند زور زور سے ہل رہی ہے۔

''حفیظ! حفیظ! تم یہاں ہو— ھو۔ ھو۔ شکر ہے۔''

''کیا ہوا؟'' میں ذہنی طور پر کچھ بھی بُرا سننے کو تیار ہوں۔

''ابھی ابھی عدالت میں یکے بعد دیگرے دو خطرناک بم پھٹے ہیں۔ کم سے کم پندرہ لوگ ہلاک ہوئے ہیں، اور زخمیوں کی تعداد کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔''

''تم کہاں تھے؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''میں کورٹ میں نہیں تھا۔ بار کونسل والوں نے گلبرگ ہوٹل میں لنچ کا انتظام کیا تھا۔ میں وہاں لنچ کر رہا تھا۔ وہاں سے سیدھا تمھاری فکر میں، یہیں چلا آرہا ہوں۔ پتہ نہیں تم آج دوپہر میں گھر کیسے موجود رہ؟ ھو۔ ھو۔''

''مجھے ارہر کی دال کی کھچڑی نے بچالیا۔'' میں نے ایک سگریٹ سلگایا۔

''کیا مطلب؟ ھو۔ ھو۔''

میں جواب میں کچھ نہیں کہتا اور مسالے دار بھنے ہوئے بھیجے کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔

اچانک دونوں بیٹے بھاگتے ہوئے اندر آتے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔''

''کیا بات ہے؟'' انجم اور علاء الدین گھبرا کر پوچھتے ہیں۔

''پولیس گشت کر رہی ہے۔ مسجد کو بھی پولیس نے گھیر رکھا ہے۔'' بڑا بیٹا ہانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

''تم لوگ گھر سے مت نکلنا'' علاء الدین تنبیہ کرتا ہے۔

''کام چاہے کسی کا بھی ہو، مگر آفت تو اپنے ہی لوگوں پر آنی ہے۔''

''اچھا آپا! میں چلتا ہوں، گھر پر شبنم انتظار کر رہی ہوگی۔''

''اپنا خیال رکھنا۔ پولیس اگر گھروں کی تلاشی لے تو گھبرانا مت۔ ھو۔ھو۔''

''میں ڈی۔آئی۔جی۔ سے بات کرلوں گا کہ میرے فلیٹ کی طرف پولیس رُخ بھی نہ کرے۔''

علاء الدین نے سفلے پن کے ساتھ اپنے بارسوخ ہونے کا اظہار کیا اور چلا گیا۔

علاء الدین کی شخصیت کی سب سے بڑی کمی اُس کی بزدلی ہے، اور میرے خیال میں بزدلوں کی جماعت سے زیادہ خطرناک انسانوں کی کوئی دوسری جماعت نہیں۔ میں اس جماعت کا کبھی رُکن نہیں رہا اور اس لیئے مجھے لگتا ہے کہ علاء الدین کے مقابلے میں، میں بہت کم خطرناک ہوں۔

میں خاموشی کے ساتھ دونوں بیٹوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ جو نہ جانے کیوں ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے ہیں۔ اُن کے چہرے اس وقت بالکل زرد پڑ گئے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں، جن پر وہ بار بار اپنی زبان پھیرتے ہیں۔ اتنی سخت سردی میں بھی اُن کو پسینہ آرہا ہے۔ وہ مسجد سے جمعے کی نماز پڑھ کر آرہے ہیں۔ یہ دونوں بھی بزدل ہیں۔

میرے بڑے بیٹے کا نام ظفر ہے، وہ بہت تنگ جینز پہنتا ہے، جس میں اُس کے بھاری کولہے بے شرمی سے ادھر اُدھر ڈولتے ہیں۔ اتنے موٹے کپڑے میں بھی عریانیت اور ایک قسم کی بے رحم فحاشی چھلکی جاتی ہے۔ وہ ویسے بھی ٹانگیں چوڑی کر کے چلا کرتا ہے جو کسی طور پر بھی دیکھنے میں اچھا نہیں لگتا۔ جیسے اُس کی جانگھوں کے بیچ پھوڑا نکل آیا ہو۔ وہ اکثر جہاد کی باتیں کرتا ہے جبکہ اُسے ابھی جہاد کے معنی تک نہیں معلوم۔

چھوٹے بیٹے کا نام عدنان ہے۔ عدنان جینز یا تنگ کپڑے تو نہیں پہنتا مگر مذہبی جنون اُس پر بھی طاری ہے۔ اس کی آواز میں ایک قسم کا زنانہ پن ہے۔ جو اُس کے کلین شیو مردانے چہرے میں ایک پُراسراری بے رحمی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اُس کی آواز اتنی مہین اور زنانہ نہ ہوتی تو یہ بے رحمی اور سفاکی شاید اس میں نہ ہوتی۔ وہ اپنے بائیں کان میں بندہ پہنتا ہے، اور سر کے بال خشخشی رکھتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹوں سے مشابہ ضرور رہا ہوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ایسا نہ ہو مگر کوئی نہ کوئی زمانہ ایسا ضرور رہا ہو گا جب میں کسی ایک یا دونوں کا چربہ تھا، کب؟ کس زمانے میں؟

مجھے یقین ہے کہ میں اُن کی طرح ،مگر کسی دوسرے زمان ومکان میں، وقت کے نہ جانے کتنے ٹیلوں کے پیچھے ان دونوں سے شکل وصورت سے ملتا جلتا کبھی تھا ضرور۔ نہیں معلوم کہ کب؟

اور اب بہتا ہوا زلزلہ یہ سوچنے کی مہلت بھی کہاں دے رہا ہے؟

اب اس مقام پر آ کر یہ صاف ہو جانا چاہیے کہ میری یادداشتیں محض میری یادداشتیں ہی نہیں ہیں، بلکہ ان میں ان تمام لوگوں کی یادداشتیں بھی شامل ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں، مگر جن کی آنکھوں سے میں نے کچھ دیکھا، جن کے منھ سے میں نے کچھ سنا۔ میرے دماغ کے بائیں طرف کے تمام خلیے ان سب مردہ لوگوں کے دماغوں کا خون پی پی کر پل رہے ہیں اور خاص طور پر جب میں اپنی یادوں کو ایک عرضی اور ایک اپیل کی طرح بھی پیش کر رہا ہوں تو میرے سب سے مستند گواہ تو ان مُردہ لوگوں کی یادداشتیں ہی ہیں۔ زندوں پر بھروسہ کرنا مشکل ہے، مگر مُردوں پر مکمل بھروسہ اور یقین کیا جاسکتا ہے۔ مُردے ایسے گواہ ہیں جو اب کبھی اپنا بیان نہیں بدل سکتے۔

دوسری بات یہ کہ ادھر آ کر مجھے یہ احساس بھی ہونے لگا ہے (یہ احساس بھیانک ہے) کہ شاید میرے بس میں نہیں تھا کہ اپنی یادداشتوں کو، اپنے دُکھ اور سُکھ کو، اپنی محبت، نفرت کو اور اپنے انتقام کو لکھ سکتا۔ بلکہ میں تو شاید صرف ایک وسیلہ ہوں۔ میں کوڑے دان میں پڑا ہوا، کاربن کاغذ کا ایک پرزہ ہوں جس پر نا جانے کس کے جارحانہ قلم کی نادیدہ تحریر اور حروف جگہ جگہ اُبھر آئے ہیں۔ میں نے لکھتے

وقت، ہمیشہ ایک دباؤ محسوس کیا۔ ایک پُر اسرار قلم کا خوفناک دباؤ۔ یہ قلم، جس کا بظاہر کوئی سروکار مجھ سے نہ تھا۔ میرے اوپر ایک سفید، صاف ستھرا کاغذ تھا اور ایسا ہی ایک کاغذ میرے نیچے بھی تھا۔ وہ پُر اسرار قلم اُوپر کے سفید کاغذ پر لکھی ہوئی اپنی تحریر کو، میرے نیچے رکھے کاغذ پر بھی ثبت کرنا چاہتا تھا۔ اپنے تمام حروف، الفاظ اور جملے۔ میں ان دو، سفید اور صاف ستھرے اور دستاویزیں بن جانے کے لائق کاغذوں کے درمیان پھنسا ہوا ایک سیاہ ترین کاغذ، جسے بعد میں ایک بیکار شے کی مانند پھاڑ کر اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے، کوڑے دان میں پھینک دیا جانا تھا— وہ دونوں سفید، اعلیٰ قسم کے چکنے کاغذ معتبر ٹھہرے۔ اُسی نادیدہ پُر اسرار قلم کے حافظے کا دباؤ، میرے سیاہ رنگ پر مٹتے مسخ ہوتے یہ حروف۔ میں ان مٹتے ہوئے لفظوں کے ذریعے ہی کچھ لکھنے یا سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی میری اپیل ہے، یہی میری عرض داشت۔

میں، شاید وقت کے ایک کوڑے دان سے، رینگتے ہوئے ایک کیڑے کی مانند نکل کر باہر آیا ہوں۔ اور اُس عدالت کی تلاش میں ہوں جہاں اپنے جرائم کا اعتراف کرسکوں اور اُن مجبوریوں اور ستم ظریفیوں کا ازالہ بھی طلب کرسکوں جن میں، میں زندگی بھر قید رہا— مجھے نہیں معلوم ایسی عدالت ہے کہاں؟ اور یہ کہ اُسے لگنا بھی چاہیے کہ نہیں؟

مجھے اپنے اوپر اور نیچے اصل مقصد سے رکھے ہوئے سفید اہم کاغذوں کے بارے میں کوئی علم نہیں— میں نہیں جانتا کہ اُن کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، بے حد حفاظت اور نگرانی کے ساتھ، اُنھیں کس آرکائیو میں رکھ دیا گیا ہے؟

یہ اپنا اپنا مقدر ہے، مقدر سے بھاگ کر کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔ شاید یہ سلسلہ میرے مرتے دم تک قائم رہے یا بلکہ مرنے کے بعد بھی۔

مرنے کے نام پر مجھے یاد آیا کہ ویسے تو بدشگونیوں، بددعاؤں اور کوسنوں کے منحوس ٹوکرے کو میں بچپن سے ہی اپنے سر پر لیے گھوم رہا ہوں مگر، وہ بدشگونی جو مجھے میری موت سے ہمکنار کرے گی، اُس کا انکشاف مجھ پر کب ہوگا۔ کون سے کھانے کی مہک، میری آنتوں میں پل پل کر، بڑے ہو جانے والے بصیرت افروز کیڑے کو کلبلانے پر مجبور کرے گی؟

مگر میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ میں ابھی، اتنی جلدی اپنے گھر لوٹ کر نہیں جانا چاہتا حالانکہ آج کل روز رات کو میں اپنے آبائی مکان کو اور قلعے کی ندی کو خواب میں دیکھتا ہوں۔ قلعے کی ندی نے اپنا راستہ بدل لیا ہے، وہ اب میرے گھر کی دیوار سے لگ کر بہنے لگی ہے۔ اس کا پانی گھر کی بنیادوں کو آہستہ آہستہ گلا رہا ہے۔ کمزور کر رہا ہے۔

ایک دن آئے گا جب پورا گھر مع اپنی بنیادوں کے، ایک چھوٹا سا جزیرہ بن کر، ندی میں اُبھر آئے گا اور ہوا اور پانی کے زور سے دریا کے سینے پر بہتا پھرے گا۔

گھر کی یاد آنا ایک بات ہے، اور گھر لوٹ کر جانا دوسری بات۔ میں ابھی وہاں جانے کے لیے تیار نہیں، ہرگز نہیں۔

نزلے میں، رات کو، اچھی اور گہری نیند نہیں آپاتی۔ بار بار کھانسی کے ٹھسکے لگتے ہیں اور گلے میں بلغم آکر اکٹھا ہو جاتا ہے۔ جس کو نکالنے کے لیے میں زور زور سے کھنکارتا ہوں۔ بہت دیر تک، نہیں سو پاتا مگر جب بھی سوتا ہوں تو اپنے آبائی گھر کو ہی خواب میں دیکھتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے گھر ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ اس عرصے میں، میں نے گھر کو اتنی بار خواب میں دیکھا ہے کہ حقیقت میں بھی، شاید اتنی بار نہ دیکھا ہو۔

میں نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ میری ناک کے نتھنوں میں بہت درد ہو رہا ہے۔ نزلے کی رطوبت نے نتھنوں کے اندر کھال کو چھیل کر رکھ دیا ہے۔ اور وہاں چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ ناک کے اندر چاقو کی نوک جیسی چبھن محسوس ہوتی ہے۔ درد کی شدت سے مجھے ہلکا ہلکا بخار آگیا ہے۔ میں بلغم تھوکنے کے لیے کمرے میں لگے چھوٹے سے سفید واش بیسن پر جاتا ہوں۔ میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت لگا کر کھنکارتا ہوں۔ میری آواز ایک پریشان حال گھوڑے کی ہنہناہٹ سے مشابہ ہے۔ بلغم میں خون ہے۔ سفید واش بیسن میں جگہ جگہ سُرخ دھبے نظر آ رہے ہیں۔

''نزلہ پک گیا۔ سُنا تم نے، حفیظ الدین بابر! نزلہ پک گیا۔''

اب نزلے کے رخصت ہونے کا وقت دور نہیں۔ آخر کھانستے کھانستے پھیپڑے خون سے بھر گئے۔

میں کمرے میں واپس آتا ہوں۔

میں سونا چاہتا ہوں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے واقعی سو گیا۔ میں اپنے آبائی گھر کو دیکھ رہا ہوں۔ ویران گھر کے دروازے کے سامنے، چوکور گھیر میں عجیب بے ہنگم شور مچا ہوا ہے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں، یہ کیسا شور ہے؟ یہ بہت جی گھبرا دینے والا منظر ہے۔

چوک میں بے شمار لمبے چوڑے ہجڑے، آنکھوں میں سرمہ لگائے، فحش اشارے کرتے ہوئے، اور نقلی چھاتیاں ہلاتے ہوئے پھٹے ہوئے بانس جیسی آواز میں گا رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔

کنکریا مار کے جگایا تو کل میرے سپنوں میں آیا

بالما، تو بڑا وہ ہے، ظالما تو بڑا وہ ہے

ہجڑے ایک کھنڈر ہوتے ہوئے، ویران اور سنسان گھر کے دروازے کے سامنے اس طرح ناچ رہے ہیں جیسے گھر میں کوئی تازہ تازہ ولادت ہوئی ہے۔ ہجڑوں کے علاوہ وہاں اور کوئی بھی نہیں ہے۔ آس پاس کا یا محلے تک کا کوئی شخص نہیں۔ گھر میں بھی میرے سوا کوئی نہیں۔ میں اکیلا ہوں، قابلِ رحم حد تک اکیلا۔ ہجڑے مجھے دیکھ کر، آنکھ مارتے ہیں اور دونوں ہاتھ عجیب طرح سے ملا کر فحش ترین اشارے کرتے ہیں۔ یہ بھیانک ہجڑے میرے گھر میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

میرا دل رونے کو چاہتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ میں چیخ چیخ کر رونے والا ہوں۔ میں ڈر گیا ہوں۔ میں رو رہا ہوں۔ کوئی بے رحمی کے ساتھ میرا شانہ جھنجھوڑ رہا ہے۔ میں ہڑبڑا کر جاگ جاتا ہوں۔

انجم آنکھوں میں کیچڑ بھرے اور چڑیلوں کی طرح بال بکھرائے کھڑی ہے۔

''سارے گھر کی نیند برباد کر دی۔ اب سوتے میں جانوروں کی آوازیں بھی نکالنا شروع کر

دیں۔'' وہ چیختے ہوئے کہتی ہے۔ اور پیر ٹپکتے ہوئے نکل جاتی ہے۔

صبح کے پانچ بجے ہیں۔ سردی کے مارے میرے دانت کٹکٹانے لگتے ہیں۔

دوپہر کے ٹھیک بارہ بجے ڈاکیہ مجھے ایک بند لفافہ لاکر دیتا ہے۔ میں لفافے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ لفافہ میرے شہر سے آیا ہے۔ پتہ میرے محلے کا ہے۔ بھیجنے والا کا نام میرے لیے اجنبی ہے۔ میں کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولتا ہوں۔ اندر ایک مڑا تڑا سا کاغذ ہے۔ میں کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہوں۔

''گڈو میاں! اُمید ہے کہ تم خیریت سے ہوگے۔ شاید تم مجھے پہچان نہ پاؤ، مگر میرا اور تمھارے بڑے ماموں کا جگری یارانہ تھا۔ ایک آدھ بار میں نے تمھیں گود میں بھی کھلایا ہے۔ میں اس وقت تمھیں ایک بری خبر دینے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ تم تو شاید بہت سالوں سے اپنے گھر کو دیکھنے نہیں آئے۔ اب یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ تمھارے گھر پر محلے کے ایک بدمعاش نے قبضہ کرلیا ہے، اس نے کچہری میں سب کو پیسہ کھلاکر، گھر کی رجسٹری بھی اپنے نام کروالی ہے۔ آج کل یہ دھندہ زوروں پر ہے۔ میں اب بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ تمھارے گھر سے میرا گھر بہت دور ہے۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ میں محض تمھارے خاندان سے پرانے تعلقات کا پاس رکھتے ہوئے یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ اور یہ شکایت بھی کہ اگر تم، کم از کم اپنے بزرگوں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے، یا عید، بقرعید اور محرم کے موقع پر گھر آتے جاتے رہتے تو یہ صورت حال نہیں ہوتی۔ نہ ہی تمھارا یہ گھر کھنڈر بنتا جو بزرگوں کی نشانی تھا۔ زیادہ پڑھ لکھ کر، وکیل یا ڈاکٹر بن کر، یا مالدار بن کر کوئی اس طرح اپنے گھر کو نہیں بھولتا جس طرح تم بھولے۔ بہر حال مجھے اُمید ہے کہ تم اس خط کو پڑھ کر جلد ہی آؤگے۔ کیونکہ تم خود اتنے بڑے اور ہائی کورٹ کے وکیل ہو، تو

اگر چاہو تو اس معاملے کو نپٹا سکتے ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے تمھارا پتہ حاصل کیا اور وہاں کسی کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ میں نے تمھیں اس سازش کے بارے میں مطلع کیا ہے۔ وہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔''

خیر اندیش

شاکر علی

میں خط پھاڑ کر پرزے پرزے کر کے، کوڑے دان میں ڈال دیتا ہوں۔ بستر سے اُٹھتا ہوں، فرش پر کھڑا ہوتا ہوں۔ میرا پیر پھسل جاتا ہے۔ میں دیوار پر لگے ہوئے قدِ آدم آئینے سے ٹکرا کر، اوندھے منھ فرش پر گر جاتا ہوں۔ میں اسی طرح پڑے پڑے آنکھیں کھولتا ہوں۔ خود کو آئینے میں دیکھتا ہوں، میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔

میں اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ دروازے میں، میرے بیوی اور دونوں بیٹے ساکت و جامد کھڑے مجھے گھورے جا رہے ہیں۔ میری بیوی کے بال بھی کھچڑی ہو چکے ہیں۔ دونوں بیٹے بہت بڑے بڑے لگ رہے ہیں۔ وہ پوری طرح جوان ہو چکے ہیں۔

میں اپنی ناک سے، سانس کو پوری قوت کے ساتھ اندر کھینچتا ہوں، نزلہ نہیں ہے۔ نزلہ اپنا کام ختم کر کے چلا گیا ہے، آنکھوں میں پانی نہیں، گلے میں سرسراتا ہوا بلغم نہیں، خون نہیں کھانسی نہیں، بخار نہیں، سردی نہیں۔ نزلے کی باڑھ میں سب بہہ گیا۔ اب کچھ نہیں — میں سر پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ صدیوں پر محیط، نزلے کی نشانی بس یہ سفید بال رہ گئے ہیں۔
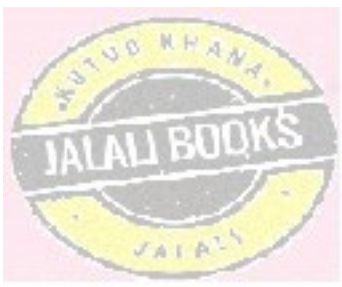
چوتھا حصّہ

شور

اب
مجھ میں سکت نہیں رہی
کاغذوں کے اس میلے پلندے کے نیچے
میری سانس گھٹ رہی ہے
اس منحوس کالی روشنائی کی بدبو سے
میری ناک بھی سڑ چکی ہے
میں کچھ دیر کے لیے گہری نیند سو جاؤں گا
اور تب وہ آئے گا
میرا منشی۔ میرا محرّر
وہ میری نقل کرنے والا
وہ مجھے گہری نیند سے جگائے گا
اگرچہ وہ خود بھی نیند میں چلتا ہے
میرا کندھا جھنجھوڑ کر
میرا آسیب، میرا ہمزاد، وہ میرا محرّر
مجھ سے طلب کرے گا میرا حافظہ
جسے میں نیند میں ہی
اُس کے ہاتھوں گروی رکھ دوں گا
پھر سو جاؤں گا
وہ نیند میں چلنے والا
اندھیری رات سے روشن صبح کی طرف بڑھے گا
اور میری عرضیوں کو آگے بڑھائے گا
وہ میرے انداز کی ہو بہو نقل کرے گا
کسی کو رتی برابر بھی، شک نہ ہو گا

کون ہے حفیظ الدین بابر؟
اور کون ہے وہ چھلاوہ، وہ آسیب، وہ محرّر، وہ منشی
حفیظ الدین بابر کے حافظے پر قابض
کوئی نہیں جانے گا
کہ سونے والوں کو، نیند میں چلنے والے ہی جگاتے ہیں

(خالد جاوید)

جیسا کہ میں شاید پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کورٹ میں، اِدھر اُدھر، آوارہ گردی کرنے کے ساتھ ساتھ میں وہاں کی لائبریری میں جا کر کتابیں بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ اگرچہ کتابیں پڑھنا بھی ایک قسم کی آوارہ گردی ہی ہے۔ سائنس، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، میں ان سب علوم کی کتابوں میں دیمک کی طرح آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا۔ اور پھر یہ جان لینے کے بعد کہ، کتابیں کاغذوں کے سوا کچھ نہیں اور ان میں جو لکھا ہے، وہ ادھورا ہے۔ وہ نہ زندگی گزارنے کے کام آسکتا ہے اور نہ مرنے کے، میں ان کتابوں کو کسی نہ کسی شکل میں برباد کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ میرا بس چلتا تو میں واقعتاً دیمک بن کر، ان کتابوں کے غرور کو نیچا دکھانے کے لیے اُن کے کاغذوں کی بھوسی نکال کر رکھ دیتا۔

اِسی طرح وقت برباد کرتے کرتے جب شام ہونے لگی تو میں گھر کی طرف چل پڑا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ دن میں سوائے دو بسکٹوں اور ایک چائے کے سوا کچھ نہیں لیا تھا۔ اب یہ بسکٹ اور چائے پیٹ میں گیس بنانے کے علاوہ اور کچھ مدد کرنے سے قاصر تھے۔ دیکھو آج انجم نے کیا پکایا ہو۔ یہی سوچتے سوچتے میں گھر تک پہنچ گیا۔ سب سے پہلے تو میں پیشاب کرنے کے لیے ٹوائلیٹ میں گھسا جو اس وقت بہت گیلا تھا اور آموں کی ناگوار بو سے بھرا ہوا تھا۔

دن بھر یہ ماں بیٹے جانوروں کی طرح آم چرتے پھرتے ہیں اور نہ جانے کتنی بار بیت الخلا میں جاتے رہتے ہیں۔ ان کا کوئی علاج ہی نہیں۔ میں نے تاسف کے ساتھ سوچا۔ ٹوائلیٹ سے باہر آکر

میں جلدی سے باورچی خانے کی طرف گیا۔

''ارے ارے، بیت الخلا سے سیدھے یہیں آ گئے۔ بغیر ہاتھ منھ دھوئے اور جوتوں سمیت اندر گھسے چلے آتے ہو۔'' انجم زور سے چلائی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی ایک ایسی چمک تھی جو انسانوں میں نہیں صرف کسی کینہ پرور سانپ میں ہی پائی جا سکتی ہے۔

''یہ بتاؤ آج کیا پک رہا ہے؟'' میں نے اُس کے جملوں اور آنکھوں کی نفرت آمیز چمک کو نظر انداز کرتے ہوئے خشک لہجے میں سے پوچھا۔

گیس کے چولہے پر رکھا پریشر کُوکر آہستہ آہستہ سیٹیاں دے رہا تھا۔ جیسے سسک سسک کر رو رہا ہو۔

انجم کی ستواں، بے رحم ناک پھولنے پچکنے لگی۔ اور اُس کی سفید گردن کی جلد دھواں مائل سی ہونے لگی۔ جیسے لکڑی کے چولہے پر کھانا پکانے والی عورتوں کی ہو جایا کرتی ہے۔

''میں پوچھ رہا ہوں، کیا پک رہا ہے؟'' میں نے قدرے بلند لہجہ میں کہا۔

''کڑھی۔'' انجم دانت پیس کر بولی۔

''کڑھی!'' میں کچھ سوچنے لگا۔ پھر چونک گیا۔ آج جمعرات ہے اور... اور جمعرات کو کڑھی ایک تباہ کن طعام ثابت ہو سکتا ہے۔ میرے سر کے بالوں میں بجلی کی ایک نامعلوم سی لہر آ کر گزر گئی۔ بال میرے سر پر ایک لمحے کے لیے بالکل سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ حلق سے سینے تک ایک آتشی سیال بہتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے آگہی کا دورہ پڑنے والا تھا۔ مدّتوں بعد — آج میں نے پھر اپنے اندر اُس پُراسرار اور منحوس روحانی صلاحیت کو محسوس کیا جو بدشگونی کو میرے سامنے قادرِ مطلق کے ایک معمولی کھیل کی طرح پیش کر دیتی تھی۔ یہ وقفہ گزر گیا۔ میرے حواس و اعصاب معمول پر آ گئے۔

''کڑھی آج نہیں پکنی چاہیے تھی۔ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔'' بڑبڑایا۔

''بڈھے، جاہل، تمہارا دماغ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ باورچی خانے سے نکلو۔ ظفر اور عدنان تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' انجم نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

میرا برسوں پرانا تجربہ ہے کہ کسی کا سر پھوڑنے کے لیے باورچی خانے سے مناسب جگہ کوئی نہیں

ہے۔ اس جدید باورچی خانے میں پھونکنی تو نہیں تھی مگر پھر بھی کچھ وزنی چیزیں ایسی تھیں کہ میں بیوی کے سر پر مار سکتا تھا، مثلاً لوہے کا توا تو سامنے ہی رکھا تھا مگر میں محض اس خیال سے خاموش رہ گیا کہ مجھے یاد آگیا کہ کڑھی چاول تو میری مرغوب غذا تھی۔ اب میرے منھ میں پانی آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر دوسروں کی موت یا اُن کے ساتھ پیش آنے والے کسی حادثے کے خوف سے کیا اپنی پسند کا کھانا کھانے سے ہی محروم رہوں گا۔ کہیں کچھ ہوتا ہے تو ہو، اور پھر ویسے بھی موت کی خبریں کبھی کبھی تو صرف دور دراز کے رشتہ داروں، اور پرانے محلے داروں سے ہی آتی تھیں۔ یا پھر ملک کے یا دنیا کے کسی سیاسی رہنما وغیرہ کی۔ میں اپنی اس منحوس روحانی طاقت کا عادی تو بچپن سے ہی تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کی موت بھی میرے لیے کھانے کی ایک مرغوب شے ہی تھی۔ جو میرے منھ میں ندیدے پن کے پانی میں گھل مل ایک خیال کی مانند کھو جاتی تھی۔

مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس بار صورت حال کچھ مختلف تھی۔ کچھ کیا، یکسر مختلف۔ میں باورچی خانے سے باہر آگیا اور انجم فرش پر بیٹھ کر ٹھیک اُسی جگہ پونچھا لگانے لگی جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔

باورچی خانے سے باہر آتے ہی میں پھر ٹھٹک گیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ میری یادداشت کا بیڑہ بالکل ہی غرق ہو چکا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جمعرات کو تو گھر میں صرف گوشت پکنا چاہیے تھا کیونکہ آج گھر کے بزرگوں کی فاتحہ کا دن ہے اور وہ سب اپنی اپنی قبروں کے باہر بیٹھے اپنی اپنی خوراک کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

میں باورچی خانے میں پھر واپس آیا۔

''کیا صرف کڑھی ہی پکی ہے۔ کوئی گوشت کا سالن نہیں؟''

''چار دن سے لگاتار تو ٹھونس رہے ہو، تمھیں اب اس بڑھاپے میں اتنا گوشت نہیں کھانا چاہیے۔'' (حالانکہ نہ جانے کب سے میں نے گوشت کی بوٹی کی شکل تک نہ دیکھی تھی)

انجم مجھے بڑھاپے کا طعنہ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ اپنی بدہنگم چھاتیوں کو نہیں دیکھتی جنھیں اگر روکا نہ جائے تو زمین کو چھونے لگیں۔ کم ظرف بڑھیا۔ میں نے دل میں سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔ ورنہ باورچی خانے کو جنگ کا اکھاڑہ بنتے ہوئے کبھی دیر نہیں لگتی۔

میں نے بے حد ضبط کے ساتھ کہا، ''آج جمعرات ہے اور فاتحہ بھی تو ہونی ہے، کیا یہ تمھیں یاد نہیں رہا۔''

''کیا فاتحہ صرف گوشت پر ہوسکتی ہے؟ اور تمھارے خاندان والوں کو تو کڑھی کا بہت شوق تھا۔ تیرے میرے گھر سے آئی ہوئی سڑی ہوئی کڑھی تک پر جھپٹ پڑتے تھے۔'' انجم کا آدھا ٹوٹا ہوا دانت غصے میں باہر کو جھانکنے لگا۔ مجھے اس سامنے کے آدھے ٹوٹے ہوئے دانت سے سخت نفرت ہے اور بہت بار میں نے سل کے پتھر سے اس دانت کو توڑ ڈالنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا ہے۔

''تم تو دراصل فاتحہ کے ہی خلاف ہو، مگر یاد رکھو، میرے جیتے جی اس گھر میں فاتحہ اور نیاز و نذر سب ہوتی رہے گی!!'' میں اس وقت جھگڑا اس لیے نہیں بڑھانا چاہتا تھا کہ دونوں وقت مل رہے تھے اور وہ سب قبرستان میں کھانے کا انتظار کر رہے ہوں گے یا پھر ان کی روحیں گھر میں بھٹک رہی ہوں گی۔ گھر! ہاں گھر جو یہاں سے گیارہ سو چار میل دور تھا۔

''چلو جلدی سے ایک انڈے کی ٹکیہ ہی کر دو اور کھانا لگاؤ۔ وقت تنگ ہو رہا ہے،'' کہتے ہوئے میں لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ وقت یقیناً تنگ ہو رہا تھا۔ جلد ہی مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ اگربتی کے دھوئیں سے لپٹے کھانے پر فاتحہ پڑھ کر جب میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو دو دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کے لمس نے مجھے میرا بڑھاپا یاد دلا دیا۔ یہ ایک بوڑھی داڑھی تھی جس کو چھو کر میری انگلیوں پر میری بڑھتی عمر کسی کوڑھ کی طرح چپکی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہی وہ داڑھی تھی، میں نے سوچا، جب پہلی بار نوعمری کی سرحد میں داخل ہوا تھا، جسے مسیں بھگینا کہتے ہیں، تو ان بالوں پر ہاتھ پھرا کر ہی میری انگلیوں، ہتھیلیوں اور یہاں تک کہ سارے جسم میں جوانی، طاقت، خواہش اور سرشاری کی ترنگیں دوڑ جایا کرتی تھیں۔

مغرب کی اذان ہونے لگی۔

''ظفر اور عدنان کہاں ہیں؟'' میں نے انجم سے پوچھا جو کھانا سمیٹتے وقت بڑبڑاتی جاتی تھی۔ ''یہ کون سا ثواب ہوا کہ خود پکاؤ، خود ٹھونس لو۔ کبھی کسی غریب کو خوراک دینا میسر نہ ہوا۔''

''ظفر اور عدنان کہاں ہیں؟''

''کیا اس گھر میں پچاس کمرے ہیں؟'' وہ طنزیہ بولی۔

ویسے یہ پوچھنا واقعی میری حماقت تھی۔ وہ اندر والے کمرے میں ہی ہوں گے جہاں بستر پر لگے پلنگ کے سامنے ٹی وی رکھا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی، مگر میں نے سوچا کہ پہلے دونوں کی بات سن لی جائے، پھر اطمینان سے بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا۔

میں اندر والے کمرے میں گیا۔ میری توقع کے مطابق وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ٹی وی پر ایک مذہبی چینل دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میں سامنے پڑے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

ظفر نے انجینئرنگ کی ہے اور وہ لمبی سیاہ داڑھی کے ساتھ ساتھ سوٹ اور ٹائی اور کبھی کبھی جینز بھی پہن لیتا ہے۔ آج بھی اسی لباس میں تھا۔ اس میں ایسی تو کوئی اعتراض والی بات نہیں، مگر مجھے یہ حلیہ ذرا اوٹ پٹانگ لگتا ہے۔ اور داڑھی کے ساتھ ساتھ سر پر ٹوپی ہو اور آدمی کرتہ پاجامہ یا لنگی پہنے ہو تو زیادہ شریف النفس معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صرف میری اپنی رائے ہے۔ ظفر کے نقطۂ نظر سے سوچیں تو ٹھیک ہے۔ شرع اور فیشن دو الگ الگ باتیں ہیں اور آدمی دونوں پر ایک ساتھ کاربند رہ سکتا ہے۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ میں ظفر کو انجینئرنگ نہیں کرانا چاہتا تھا مگر بیوی کا ارمان تھا۔ میرے خیال میں تو انجینئروں کو، خاص طور سے آج کے دور کے انجینئروں کو پڑھا لکھا ہی نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخ، نفسیات، سماج اور ہر اُس شعبے سے جس کا تعلق انسانی علوم سے ہے۔ انجینئر کو دور، دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ بس مذہبی اعتبار سے کٹر ہونا اور انسانیت کے تئیں ایک ناقابلِ فہم بے رحمی انجینئر کی علامت ضرور ہے۔ اور اگر بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت صاف ظاہر ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے شعبے روز بروز تنگ نظر اور کٹر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب تضاد ہے حالانکہ اب اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس شعبے سے انسانی عنصر کو نکال باہر کیا جائے گا وہاں یہ سب ہونا عین فطری ہے۔ اس لیے یہ لوگ مذہب کی اصل روح کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اور رہی بات ظفر کی تو— اس پر تو مجھے کچھ اور بھی شک ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی رات پولیس ہمارا دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔

عدنان نے ایم. بی. اے. کیا ہے۔ اور اُس سے پہلے کمپیوٹر سائنس میں ڈپلومہ۔ داڑھی اُس نے ابھی نہیں رکھی ہے مگر مذہب کی طرف اُس کا رجحان بھی جنون آمیز سا معلوم ہوتا ہے۔ داڑھی نہ رکھنے کے پیچھے شاید کسی غیر مسلم لڑکی کا ہاتھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی وہ اس غیر مسلم لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کر لے گا۔ اس طرح لگے ہاتھوں ثواب بھی کما لے گا۔

میں دو بار آہستہ سے کھنکارا۔ تب عدنان نے ٹی. وی آف کیا۔ دونوں بیٹے تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتے رہے بلکہ میرا جائزہ لیتے رہے۔ تب عدنان نے کہا۔

''آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''کس بارے میں؟''

''وہی جو... ہم کئی بار آپ سے کہہ چکے ہیں۔''

''مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا بیٹے، مجھے بتاؤ۔''

''ہم لوگ دوبئی میں سکونت حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اب اس ملک میں ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ امّی بھی راضی ہیں۔''

مجھے غصہ آنے لگا۔ شدید غصہ جس پر قابو پانے کے لیے میں نے بائیں ہاتھ سے اپنی پیٹھ کھجانی شروع کر دی۔ ابھی حال ہی میں، میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ غصے پر قابو پانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ والے کو بعض ضروری کام بائیں ہاتھ سے کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور بائیں ہاتھ والے کو دائیں ہاتھ سے۔ اس وقت پیٹھ کھجانے سے زیادہ ضروری کام میرے لیے کوئی اور نہ تھا۔

''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' اس بار ظفر نے بے حد سرد مہری کے ساتھ پوچھا۔

''یہاں ہم لوگوں کو کیا پریشانی ہے؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہاں ہمارے اور ہماری قوم کے لیے ایک مستقل نفرت ہے۔ ہمارے لیے روز بروز اس ملک میں عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔'' ظفر زور سے بولا۔

''مگر یہ ہمارا ملک ہے اور سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ملک چھوڑنا

مناسب نہیں۔ اور کوئی ملک ایسا نہیں جو ہمیں اس طرح قبول کرے جیسے ہم اُسی کے ہوں۔'' میرا لہجہ تیز ہو گیا۔

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ یہ ملک تو اب قائم بھی نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس ملک کے قائم رہنے کی کوئی اُمید نہیں۔ بالکل بھی نہیں، اور پھر جس ملک کی سیاست اور قیادت اتنی کھوکھلی اور بے حس ہو چکی ہو اور جس میں اقلیتوں پر اس درجہ مظالم کیے جاتے ہوں، ہمیں اُس ملک سے کوئی جذباتی تعلق نہیں رکھنا ہے۔

''یہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو، تم نے یہیں تعلیم حاصل کی، تم یہاں ایک چھوٹی موٹی سی نوکری بھی کرتے ہو۔ آگے ترقی بھی ہو جائے گی۔ اس معاملے میں ہمارے ملک کے دستور کا موقف بالکل صاف ہے۔''

''آپ اپنی ساٹھ والی ذہنیت اپنے پاس رکھیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آپ کو ان حالات کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا۔ یہاں تو پیٹ بھرنے کے بھی لالے پڑنے والے ہیں۔ آپ کو کیا خبر۔'' عدنان چیخنے سا لگا۔

''پیٹ — پیٹ... پیٹ بھرنا، کھانا، باورچی خانہ...'' نعمت خانہ میرا ذہن اچانک لاتعلق ہو کر یہی گردان کرنے لگا۔ عدنان اور ظفر کچھ کہے جا رہے تھے، مگر میں شاید سن نہ سکا۔

''پیٹ کے کتّے — کھانا۔ باورچی خانہ۔ میدان جنگ، کرم بھومی۔'' میں زور سے بڑبڑایا۔

''کیا؟'' وہ دونوں میری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے میں بالکل ہی پاگل ہو گیا ہوں۔

''کچھ نہیں — باسٹھ کی جنگ میں، رئیس چچا، پینسٹھ کی جنگ میں رحیم الدین ماموں اور بہتر کی جنگ میں فیروز پھوپھا اس ملک کے لیے شہید ہوئے ہیں اور یہاں تک کہ سیاچن میں...'' میں آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ مجھ پر پھٹ پڑے۔

''ہمیں اپنی تاریخ نہ پڑھائیے۔ ہمیں اس ملک کی اور آپ کے آباء و اجداد کی تاریخ، تہذیب اور روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم اس ملک کو اپنا وطن نہیں مانتے ہیں۔ اور ویسے بھی مادرِ وطن کا تصور آج کے دور میں کتنا فرسودہ اور مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا ہے۔''

''سب شہید ہوئے پیٹ کی خاطر، باورچی خانے کی خاطر۔ اپنی آنتوں اور معدے کی خاطر۔۔ وہ آدم خور تھے، پھر انھوں نے کھانا پکانا سیکھا۔ پھر گھر بنانا سیکھا۔ گھر میں باورچی خانہ بنانا سیکھا۔''

دونوں بیٹوں کی بلند کلامی مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ شاید میرے خون میں شکر کم ہو رہی تھی۔ کیا میں اونگھ رہا تھا؟

''تمھاری باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ انھیں اپنے تک محدود رکھو۔'' عدنان کی آنکھیں جیسے ہی لال ہوئیں، میں اچانک ہوش میں آ گیا۔

''میری باتیں۔۔؟ میری باتیں سمجھنے کی تمھارے اندر اہلیت ہی نہیں ہے۔ تم لوگ ٹیکنولوجی کے نمائندے ہونا۔'' میں نے پھر بائیں ہاتھ سے اپنی پیٹھ کھجانے کی کوشش کی۔

''اب تم فلاسفر بننے کی کوشش کرو گے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ ٹیکنولوجی نے انسان کو عظیم تحفظ بخشا ہے۔'' ظفر آپ سے تم پر اُتر آیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے، سب معلوم ہے کہ ٹیکنولوجی جو کام کرنے کی سب سے زیادہ عادی ہے، وہ ہے اپنے تمام مفروضوں میں سے انسانی شعور کو بے دخل کر دینا، مگر اسے کیا کیجیے کہ وہ خود ہی انسانی شعور کی پیداوار یا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسانی شعور اور جذبے کی نفی ہی کبھی کبھی اُس کے انہدام کا باعث بھی بنتی ہے اور ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے کہ ٹیکنولوجی اپنے آپ میں ایک نظام، بلکہ صحیح لفظ ''سسٹم'' ہوتی ہے۔ یہ سارے ہتھیار اور بم وغیرہ بھی اپنے آپ میں ایک سسٹم ہیں جو انسانی شعور اور کسی نہ کسی جذبے کی نفی ضرور کرتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ پہلے خود تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی یہ تباہی اُن تک ہی محدود نہیں ہوتی، یہ ایک الگ بات ہے۔ جس طرح ایک زہریلی چھپکلی دودھ میں گر کر پہلے خود مرتی ہے جب پھر اُس دودھ کو پینے والے تمام لوگ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ یہ تباہی کی ریاضی ہے۔۔ اور یہ سسٹم دراصل ایک بند اندھیری کوٹھری کے مانند ہے۔ یہ ایک مہر بند سسٹم کی خاصیت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی شرائط اور اپنی اخلاقیات کا غلام ہوتا ہے۔ سسٹم اپنے سے باہر کی ہر شے کو ایک سسٹم کی نظر سے ہی دیکھ سکتا ہے۔ وہ واقعی یرقان زدہ ہوتا ہے۔ وہ دہشت گردی، استحصال، تشدّد، بے رحمی، خوف اور کرب کو ایک سسٹم کی نظر سے ہی دیکھ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے حواس و اعصاب، سیاست، بے

انصافی، بدعنوانی اور مکاری کو بھی اُن کی اصل شکل میں دیکھنے یا محسوس کرنے پر بھی قادر نہیں رہے۔ یہ ایک قسم کا اندھا پن ہے۔ وہ سیّال کو محسوس نہیں کرسکتا۔ شعور سیّال ہے اور شعور کی خوبی یہ ہے کہ وہ سسٹم کی تشکیل تو کرتا ہے مگر خود سسٹم بن جانے سے یکسر انکار کر دیتا ہے۔ ایک لمبا اور فیصلہ کن انکار''مجھے معلوم ہے، سب معلوم ہے۔''

میری سانس پھولنے لگی۔ دونوں بیٹے طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ مجھے غیر متوقع طور پر اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور کمزور ہوتے ہوئے جسم کا احساس ہوا جسے فوراً ہی نوجوانی کے زمانے میں کیے گئے مباحثوں اور مناظروں کے خیال نے زائل کر دیا۔

''سنو— ظفر اور عدنان، میرے بچّو! سنو کہ ٹیکنولوجی جو انسان کے عظیم عقلی جذبے کا نتیجہ تھی، مگر سب سے پہلے اُس نے جس شے کو مجروح کیا، وہ یہ عظیم انسانی جذبہ ہی تھا۔ تمھاری ٹیکنولوجی خودکشی کر رہی ہے۔ یہ خودکشی اس کا مقدر ہے کیونکہ وہ اس شیطانی آسیب زدہ بچّے کی خوفناک اخلاقیات کو قبول کر چکی ہے جو پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کی کوکھ پر نفرت بھری لات رسید کرتا ہے۔ ایسے ناشکرے کی پہلی سانس ہی دراصل اُس کی خودکشی ہوتی ہے۔''

''تم سے زندگی بھر اس لفاظی کے سوا کچھ نہ ہو سکا اور اس لفاظی کے ذریعے بھی تم دو پیسے نہ کما سکے۔ نہ تو کورٹ میں تمھاری وکالت چلی اور نہ ہی تم کسی یونیورسٹی یا کالج میں لگ سکے۔'' عدنان نے اپنی فطری بدتمیزی کے ساتھ کہا تھا۔

مجھے غصّے اور افسوس کے شدید احساس نے بے دست و پا کرنا چاہا مگر آج فیصلے کا دن تھا۔ میں ان ٹانگ برابر کے لونڈوں سے ہار نہیں مان سکتا۔ مجھے ابھی بولنا ہے۔ میں نے پھر اپنے بائیں ہاتھ سے کچھ کرنے کی کوشش کی اور دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''یہ لفاظی نہیں ہے۔ یہ میرے نظریات ہیں اور میری فکر ہے۔ تم عدنان! تم تو کمپیوٹر سائنس کے طالب علم رہے ہو۔ دیکھو ٹیکنولوجی کس طرح ہم سب کو حافظے کے خلاف جنگ میں دھکیلتی ہے اور اس

کے لیے سب سے پہلے خیال اور فکر پر پابندی لگانا ضروری ہے جسے تم لفاظی کہتے ہو۔ تمھارا کمپیوٹر Binary System پر کام کرتا ہے یعنی وہ صرف ''زیرو'' اور اکائی کو جانتا ہے۔ کیا تمھیں کوئی یاد دلانا چاہتا ہے کہ قدیم یونانی فلسفے کے ایک حکیم فیثا غورث نے حقیقت مطلق کو ایک ہندسہ یعنی ''اکائی'' کی شکل میں ہی تسلیم کیا تھا۔ آج جب تمھارا کمپیوٹر کہتا ہے کہ (۱۰۰) نام کی کوئی شے نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک ہی ہے جسے ہم سو بار شمار کرتے ہیں تو کیا تمھارا ذہن کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتا۔ مگر ٹیکنولوجی اس قسم کے بیکار سوالات کو سائنس کی اسپرٹ کے مجروح ہونے سے تعبیر کرتی ہے اور عین ممکن ہے کہ ایسا ہو بھی مگر خیال اور فکر پر پابندی کا عمومی رجحان حافظے کو بے شرمی کے ساتھ نظر انداز کر دینے جیسا ہے۔ تمھاری ٹیکنولوجی انسان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی ہے۔ اس کا اخلاقی حوصلہ پست کرتی ہے اور انسان کے آزاد، تخلیقی اور غیر منطقی رویوں کو ذلت بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔''

''خدا کے لیے ہمیں یہ سب مت سناؤ، تمھاری باتوں میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ علت و معلول کا کوئی رشتہ۔'' ظفر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''علت و معلول کا رشتہ۔؟؟ ہاہا... ہاہا...'' میں جان بوجھ کر بے ہنگم انداز میں ہنسنے لگا۔ جس کی وجہ سے تھوک کے ذرّات میرے دانتوں کے درمیان سے باہر نکلنے لگے۔ میں نے انھیں اپنے کرتے کی آستین سے پونچھا۔ دونوں بیٹوں نے میری طرف کراہیت سے دیکھا۔

''تم نے ''ہیوم'' کو نہیں پڑھا۔ تمھیں Antimatter کے بارے میں نہیں معلوم۔ جہاں صرف لامرکزیت ہو، وہاں علت و معلوم کا رسمی سا تعلق بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی تمھاری سائنس کی ایک خامی ہے جسے فزکس کے زیادہ تر ماہرین مثلاً ہائیزن برگ، الفریڈ یئڈے، نیومن، میکس برن، میر یونگے اور ڈیوڈ ماہر سے لے کر لی یانگ تک اس خرابی کی طرف اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اور پو پر تو صاف صاف کہتا ہے کہ ٹھوس مادّی دنیا میں اصول علت و معلول کی کارفرمائی واضح ہے مگر جیسے ہی ہم لطیف دنیا یعنی الیکٹرون یا پروٹون سے بنی اصل دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو جگہ جگہ ہمارا سابقہ غیر یقینی اور غیر معین صورت حال سے پڑتا ہے۔ یہ دو باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں یا ان دونوں کے درمیان کوئی شے ہے جو متضاد ہے۔ اس متضاد شے کو دور کرنا مشکل ہے۔''

''خاموش ہو جاؤ، خاموش ہو جاؤ، بکواس سننے کے لیے ہم یہاں تمھارا انتظار نہیں کر رہے تھے۔ ہمیں اس ملک میں نہیں رہنا ہے۔ ہمیں جلد ہی یہاں سے نکل جانا ہے اور اُسی دن یہاں واپس آنا ہے جب یہاں خلافت قائم ہو جائے گی۔ تمھارے ملک کی سیکولر جمہوریت تمھیں مبارک۔ جاؤ! بابری مسجد شہید کرنے والوں کے تلوے چاٹو۔'' عدنان مٹھیاں بھینچتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی پلنگ کا کونا چھوڑ دیا۔ ''تم لوگ اپنی نفی کر رہے ہو۔ اپنی سائنس اور ٹیکنولوجی کی نفی کر رہے ہو۔ کیا تم نے کبھی جوزف کانریڈ کو پڑھا ہے۔ جوزف کانریڈ نے کہا تھا کہ دہشت گردی تخیلاتی ذہن کے بہت قریب ہوتی ہے اور میک بیتھ میں شیکسپیئر کہتا ہے کہ زندگی کون سے احمق کی چیخ ہے۔ اور والٹر بنجامن نے کہا تھا کہ ''ٹیکنولوجی سماج کی بنیادی طاقتوں کے ساتھ چلنے کے لیے نہیں، ہوتی ہے۔'' اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا کبھی نہ سکے گی کیونکہ وہ سماج اور اُس کے شعور اور انسانی جذبے کی ہی نفی کرتی ہے، اس لیے ساتھ چلنے میں اُس کی سانس پھول جانا حیرت انگیز نہیں ہے۔''

''ابھی تو تم اپنی سانس سنبھالو، خبطی بوڑھے۔ لگتا ہے گر جاؤ گے۔'' عدنان نے آہستہ سے کہا، مگر ''خبطی بوڑھے'' کے لفظ نے اچانک مجھے واقعتاً بوڑھا کر دیا۔ انجم مجھے بڈھا بڈھا اکثر کہتی رہتی تھی مگر اُس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے سر چکراتا محسوس ہوا، کیا آج کے دن ہی میں پوری طرح بوڑھا ہو جاؤں گا۔ ان بچّوں کے لیے بھی جن کو دیکھ کر ہی میری جوانی قائم تھی۔

''اچھا ہی ہوا، جو تمھیں یونیورسٹی میں نوکری نہ ملی ورنہ ان احمقانہ اور بے ربط حوالوں سے تنگ آ کر طلبا تمھارا سر پھوڑ دیتے۔'' یہ ظفر کی آواز تھی جو سامنے ہی کھڑا تھا مگر مجھے یہ آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرا سر زور سے چکرا رہا تھا۔ اور مساموں سے پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میری شکر اور بلڈ پریشر تیزی سے گر رہے ہیں۔ میں نے سوچا اور مجھے اب کچھ کھا لینا چاہیے۔ یہ خیال کر کے میں جلدی جلدی باورچی خانے کی طرف جانے لگا۔

''چپلیں اُتار کر جانا، تمھاری چپلوں میں نہ جانے کیوں کینچوئے چپکے رہتے ہیں۔'' انجم دوسرے کمرے سے نماز کا مصلّٰی لیے ہوئے نمودار ہوئی۔

میں نے ظفر اور عدنان کو غور سے دیکھا۔ ''کینچوئے'' اور پھر کینچوؤں کی ماں کو ایک گندی سی گالی

دیتے ہوئے اپنے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بے دھڑک، باورچی خانے میں گھستا چلا گیا۔ اب یہاں بھی میں نے وہی ٹوائلیٹ والی آموں کی بو محسوس کی۔ کھانا اُتارنے کے لیئے جیسے ہی میں نے کوکر کا ڈھکن اُٹھایا، مجھے یاد آیا کہ کھانے سے پہلے میں نے انی ذیابیطس والی آدھی ٹکیہ تو کھائی ہی نہیں ہے۔ اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے ٹکیہ نکالی پھر اُسے اپنے کمزور بوڑھے ناخن سے توڑنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ وہ دونوں باورچی خانے کے دروازے پر آکھڑے ہوئے ہیں۔ مجھے اس قابلِ افسوس امر کا احساس ہوا کہ مجھے اِن دونوں کے منھ نہیں لگنا چاہیے تھا اور اپنی شکست کا بھی۔ میں دراصل اپنے ہی اندر کے خوردبینی اجسام سے ہار گیا تھا۔ یہ دونوں میرے خوردبینی اجسام کے علاوہ اور کیا تھے؟

بظاہر اُن کی موجودگی سے بے پرواہ، ان کی طرف نہ دیکھتے ہوئے میں اُس نیلی ٹکیہ کو توڑ کر اُسے آدھا کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ ناخن اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ خود اُس کے ہی ٹوٹ جانے کا ڈر لاحق تھا۔

''ہم تم سے صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ گھر کا اپنا حصّہ فروخت کر دو، ہمیں رقم کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔'' عدنان کی بے رحم آواز میرے کانوں میں جاڑوں کی اُس تیز ہوا کی طرح داخل ہوئی جس کے بعد میں سخت نزلے کا شکار ہو جاتا تھا۔ یہ میرے کانوں کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوا ثابت ہوتی تھی۔ شاید اس ہوا کے جھونکے میں میری ہتھیلی پر رکھی ذیابیطس کی وہ چھوٹی سی نیلی ٹکیہ اُڑ گئی۔

''کیا—؟ میں اپنے بزرگوں کی نشانی فروخت کر دوں؟'' میری آواز میں حد درجہ غصّہ اور حیرت شامل ہو گئے۔

''تم صرف اپنے حصّہ کو بیچ دو، دوسروں کی بات نہیں ہو رہی ہے۔''

''مگر میرا حصّہ کوئی نہیں ہے۔ گھر کا کبھی کوئی بٹوارہ نہیں ہوا تھا۔''

''تو اب جا کر بٹوارہ کرواؤ اور اپنا حصّہ حاصل کر کے اُسے وہیں کسی رشتہ دار کو بیچ دو۔''

''وہاں کوئی نہیں رہتا ہے۔ وہ گھر تو ایک کھنڈر بن چکا ہوگا۔''

''کوئی تو عزیز، رشتہ دار ہوگا، کہیں نہ کہیں رہتا ہی ہوگا۔ جاؤ اُس سے ملو، جائیداد کے کاغذ نکلواؤ

اور کوئی وکیل کرلو۔ ہمیں یہ ملک چھوڑنا ہے اور اس کے لیے ہمیں پیسے کی سخت ضرورت ہے۔''

مجھے اپنے اندر کسی درندے کی غرّاہٹ سنائی دی۔ میں نے اُسی غرّاہٹ پر عمل کیا اور گیس کے چولہے پر سے کوکر اُٹھا کر زور سے فرش پر پھینکا۔ تیز آواز کے ساتھ کوکر کا ڈھکنا کھل گیا اور فرش پر پیلی پیلی کڑھی اور اُس میں پڑی ہوئی پھلکیاں بکھر گئیں۔

وہ دونوں پل بھر کو سہم گئے۔ باورچی خانے کے سفید فرش پر بہتی جاتی اس پیلی کڑھی کی چھوٹ میں اُن دونوں کے چہرے یرقان زدہ نظر آنے لگے۔

ہاتھ میں جانماز لیے انجم وہاں آگئی۔

''کیا ہوا؟ بڈھے نے تم پر ہاتھ اُٹھایا۔'' وہ حواس باختہ ہوکر بچّوں کا چہرہ چھونے لگی۔

تب ظفر نے کہا۔''یہ جائیداد کا بٹوارہ نہیں کرنا چاہتے۔''

''بٹوارہ تو ہوکر رہے گا۔ جانا پڑے گا، تمھیں جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہاں تمھارا رہنا اور جینا مشکل ہوجائے گا۔'' انجم سرد مہری سے بولی۔

''یہ میرا فیصلہ ہے۔ میرے جیتے جی جائیداد کی تقسیم نہیں ہوگی۔ میں یہ شرمناک کام نہیں کرسکتا۔ اور تم لوگ مجھے کیا دھمکی دے رہے ہو۔ میں یہیں رہوں گا۔ اگرچہ یہ میرا گھر نہیں مگر میں یہاں تم دونوں کی پیدائش سے پہلے سے رہتا آیا ہوں۔ جب چاہوں اِس ذلیل فلیٹ پر تھوک کر جاسکتا ہوں، مگر تمھاری مرضی سے نہیں۔ تمھاری کیا مجال کہ مجھے یہاں سے نکال دو۔'' میں نے اپنے لفظوں کو ناپ تول کر ادا کیا۔

''تو سن کان کھول کر بڈھے۔'' ظفر کی جھولتی ہوئی ٹائی نے اُس کی داڑھی کو چھوا۔ وہ میری طرف خطرناک ارادے سے آگے بڑھا۔ دونوں بیٹے، ماں کے آجانے سے شیر ہوگئے تھے۔

''کل سے رمضان شروع ہورہے ہیں، ہم ایک کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ماں کے..... میں گیا تمھارا سوشلزم، تمھیں تیسوں روزے رکھنا ہوں گے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنا ہوگی۔ تراویح بھی پڑھنا ہوں گی۔ اس گھر میں اب نیاز نذر اور فاتحہ واتحہ نہیں چلیں گی۔ کوئی بدعت نہیں۔ تم نے بہت

دن اپنی من مانی کر لی۔ اب جو ہم چاہیں گے، وہ ہوگا۔'' اس بار عدنان گرجا۔ اس کی آنکھیں لال ہونے لگیں۔

''کوئی مائی کا لعل مجھے اس پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں جو کروں گا اپنی مرضی سے کروں گا۔'' کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا مگر ایک ناقابل فہم قسم کی کمزوری کے احساس نے مجھے جکڑ لیا۔ مجھے علاءالدین کا خیال آیا۔ کیا مجھے اس موقع پر اُسے بُلا لینا چاہیے؟

''اپنی آخرت کی فکر کرو، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہو۔'' انجم نے اپنی جانماز کو بغل میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

میرا سر بہت بری طرح چکرانے لگا۔ میں کھڑے کھڑے جھومنے سا لگا۔ میں نے اپنی کلائیوں کو دیکھا۔ ان پر جھرّیاں نمودار ہو گئی تھیں اور اُن پر موجود تمام بال یکایک سفید ہو گئے تھے۔ میں بوڑھا ہو گیا۔ آج کے دن میں مکمل طور پر بوڑھا ہو گیا۔ میں نے تصور کیا۔

ایک پوپلا منہ اور موت کے منہ میں جاتا ہوا ایک کمزور، بیمار اور حقیر بوڑھا۔

مگر ایک بار پھر میں نے سنبھالا لینے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر میں نے تن کر، سر اُٹھا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اپنے چکراتے ہوئے سر کے خلاف، اپنی کھال پر نمودار جھرّیوں کے خلاف، اپنے پوپلے منہ کے خلاف اور اپنی موت کے خلاف اور اُن تینوں کے خلاف۔ میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، ''اگر میں یہ سب نہ کروں...؟''

میرے جسم میں خون کا دباؤ اس حد تک بڑھ گیا کہ اب وہ میرے جسم میں چھپا نہ رہنا چاہتا تھا۔ خون بہہ کر آ رہا تھا، میری ناک سے اور میرے کانوں سے وہ میری گردن اور کنپٹی پر رینگنے لگا جسے میں نے کرتے کی آستین سے پونچھ دیا۔

اُن تینوں نے ایک ساتھ جواب دیا تھا، اگرچہ اُن کی ملی جلی آوازیں سانپ کی ایک خطرناک پھنکار سے مشابہ تھیں، اگرچہ اُن کے الفاظ واضح تھے۔

''تو پھر ہم تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''تم واجب القتل ہو—بڈھے کافر۔''

''بڈھے کافر؟ واجب القتل۔'' اپنے بیٹوں کے ذریعے ایک باپ واجب القتل؟ ایک شدید گھونسہ میرے دل پر پڑا۔ میرا دل کسی درخت پر لٹکی ہوئی اس ریت کی تھیلی کی طرح دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہونے لگا جس پر نوجوان مکّے بازی کی مشق کیا کرتے ہیں۔

آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میرا سر میرے کندھوں سے دور کہیں ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ میرے پیر فرش پر بہتی ہوئی لسلسی گرھی میں پھسل گئے۔ دونوں ہاتھوں سے باورچی خانے کے دروازے کی چوکھٹ پکڑتے ہوئے میں شاید آخری بار چیخا۔ ''میں بوڑھا نہیں ہوں۔ میں حفیظ الدین بابر عرف گڈو میاں!!''

''میں ایک بچہ ہوں۔'' میں ہذیانی انداز میں چلایا۔ ''ایک بہت خطرناک بچہ۔ تم لوگ میرے ساتھ جو کرنے جارہے ہو، وہ میں بہت پہلے کر چکا ہوں۔ ایک بار نہیں بلکہ دو دو بار، ہاں دو، دو بار۔''

اپنی ہی گونجتی ہوئی پاٹ دار آواز کی ہوا میں، جھومتے ہوئے، آخر کار ایک کمزور بوڑھے درخت کی مانند میں باورچی خانے کے فرش پر گر گیا اور دونوں ہاتھوں سے بے اختیار اپنا دل پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جہاں بہت درد ہو رہا تھا۔ مگر دل میرے ہاتھوں میں نہ آیا۔ دل پتہ نہیں کہاں تھا۔ میرے پیٹ میں، آنتوں میں، پیروں میں یا پھر وہ میرے جسم کے اندر جمتے ہوئے خون میں کہیں پھنس کر اٹک کر رہ گیا تھا۔ اور تب فرش پر، تکلیف کی شدّت سے اسی طرح پڑے پڑے میری آنکھوں میں ایک تیز روشنی آنے لگی۔

میں نے دیکھا، میں نے دیکھا۔ بارش آگئی ہے اور اُس کے ساتھ بہت سے کوّے بھی باورچی خانے میں اکٹھا ہو گئے ہیں۔

آخری حصّہ

سنّاٹا

آواز آئی قتل کی
قتل کی بھی آواز ہوتی ہے کیا؟
کیا وہ الماری ہے یا چابی
قتل دیکھنے میں کیسا ہے؟
کیسے ہیں اُس کے ہاتھ پیر
ماتھے کا پچھلا حصہ
توند، کہنی
کیا وہ چلتا ہے چپکے سے؟

— وشواجیت سین

بہت پرانا باورچی خانہ ہے۔ بچپن سے بھی پرانا، کڑیوں کی چھت، جو دھوئیں سے کالی ہو گئی ہے۔ ہر کونے میں، دیواروں پر اور کڑیوں میں مکڑی کے جالے جھول رہے ہیں۔ اگر ہوا کا یہاں گزر ہوتا تو آسمان کی طرح یہاں کے بھی سارے جالے صاف ہو گئے ہوتے۔ اِدھر اُدھر کئی پیلی اور کالی چھپکلیاں چپکی ہوئی ہیں۔ اینٹوں کے کھرنجے کا فرش جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا ہے جس پر باریک لال چیونٹیاں قطار بنا کر رینگ رہی ہیں۔ دھوئیں زدہ چھت کی کولتار سے پتی ہوئی کڑیوں کے درمیان بجلی کے تار میں لٹکا ہوا ایک ننگا چالیس واٹ کا بلب ہے جس کی چمک اور روشنی دونوں کو دھوئیں کی پرت نے دھندلا کر دیا ہے۔ لال رنگ کے بجلی کے تار پر مکھیاں اتنی زیادہ تعداد میں چپکی ہوئی ہیں کہ وہ بجائے تار کے، مکھیوں کی ایک موٹی ڈور نظر آتا ہے۔ یہ بہت پرانا باورچی خانہ ہے۔ اس نے پہچان لیا، یہ رہا پام کے درخت کی طرف کھلنے والا روشندان اور یہ رہی زینے کی طرف لگی اینٹوں کی جالی، اور یہ اُدھر سامان رکھنے کی اندھیری کوٹھری۔

وہ کھرنجے کے اس فرش پر کروٹ سے گرا پڑا ہے اور اُس کا بایاں ہاتھ اس کے بائیں گال میں اس طرح دھنس گیا ہے جیسے دلدل میں۔

اُس کے سر کے ٹھیک اوپر چھت سے لٹکتے ہوئے دھوئیں زدہ بلب کی کالی پیلی روشنی پڑ رہی ہے۔ دونوں بیٹے اُس کا قتل کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں آگے بڑھ رہے ہیں مگر شش و پنج میں مبتلا ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ قتل کیسے کیا جاتا ہے۔ دونوں کی شکلیں اُس کے بچپن کی طرح ہیں۔ اُسے اپنی کھوئی

ہوئی چیزیں آسانی سے ملنے لگی ہیں۔ بیٹوں کی معصومیت پر اُسے پیار آجاتا ہے۔ وہ انھیں قتل کرنے کی نادر اور عمدہ ترکیب سکھاتا ہے۔ دونوں ذہین ہیں، جلد ہی طبعیات کے فارمولے اُن کے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

وہ جس نے داڑھی پر ٹائی لگا رکھی ہے اور نیلی جینز پہنے ہے، مسالہ پیسنے کی چھوٹی سی مگر وزنی سل دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر، آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ اُس کی طرف بڑھتا ہے۔ کسی ہوئی جینز میں اس کے کولہے فحش انداز میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ وہ ٹانگیں چوڑی کر کے چل رہا ہے۔ جیسے جانگھ میں پھوڑا نکل آیا ہو۔

وہ بیٹے کی کلائیوں کو دیکھتا ہے۔ جن پر وزن اُٹھانے کے سبب موٹی موٹی رگیں اُبھر آئی ہیں۔ کلائیاں اور انگلیاں بالکل اُسی انداز میں کانپ رہی ہیں۔ یہ اُس کے بیٹے کے وہی ہاتھ ہیں جو اس کے تھے اور بعد میں کہیں کھو گئے تھے۔ یا وہ اِن ہاتھوں کو کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ آج اچانک اُس نے اپنے ہاتھوں کو واپس پالیا۔

انھیں ہاتھوں سے وہ یہی بھاری سل لیے آفتاب بھائی کے گنجے سر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پتھر کی اس سل پر ابھی بھی آفتاب بھائی کے خون کے دھبے اور بھیجے کے ریشے چپکے ہوئے ہیں۔ کتنی بار مسالہ پسا، مگر سل سے یہ دھبے نہ گئے۔

''آگے بڑھو، اس طرح نہیں۔ اس طرح۔ پہلے دایاں پیر آگے بڑھاؤ، پھر بایاں۔'' وہ کہتا ہے مگر باہر پھیلے ہوئے دبیز گہرے سناٹے میں اُسے اپنی آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔

دوسرا بیٹا بھی ایک کونے سے سرک کر اِس طرح نمودار ہوتا ہے جیسے پتھروں سے نکل کر 'بس کھوپرا'۔ وہ بار بار اپنی پتلی مٹیالی زبان نکال کر اپنے ہونٹوں پر پھیرتا ہے، پھر اندر کر لیتا ہے۔ اس کی چال بالکل وہی ہے، وہی بالکل وہی اُسی کی طرح۔ اُسے خوشی ہوتی ہے کہ زمین پر ابھی کافی عرصے تک اس کی چال برقرار رہے گی۔ وہ وقت کے پرانے ٹیلوں کے عقب میں سے نکل کر واپس آگئی۔

چھوٹا بیٹا اب آہستہ آہستہ اینٹوں کے ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھے مٹی کے تیل کے بدرنگ کنستر کی طرف رینگ رہا ہے۔ وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھتا ہے۔ چہرہ سکڑ چکا ہے، بالکل وہی حرکت، وہی خاموشی۔

اسی انداز اور پُر اسرار خاموشی کے ساتھ اُس نے انجم آپا کے میاں کو جلا کر مار ڈالا تھا۔

''بس گرادو، کنستر کا ڈھکن آہستہ سے کھولنا، اور آہستہ، اور، چولہے میں آگ جل رہی ہے۔ دیر نہیں۔ اب دیر نہیں، گراؤ۔۔۔ گراؤ۔''

وہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر لگاتار برس رہے منحوس سناٹے کا شور اُس کی زبان بند کر دیتا ہے۔

دونوں بیٹے اس کا قتل کرنے کے لیے اپنے اپنے انداز سے اپنے اپنے راستوں سے اور اپنے اپنے زمان و مکان سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

حیرت انگیز طور پر دونوں بھائی اب ایک دوسرے کے جڑواں نظر آرہے ہیں اور ساتھ ہی اُس کے بھی۔ وہ ایک واضح تحریر کی دو دھندلی کاپیاں ہیں۔ کاربن کاپیاں، عکسی نقول!

یہ قتل کا وہی پرانا حلیہ ہے۔ دونوں قتل آپس میں گڈمڈ ہو کر دو خطرناک سانپوں کی طرح آپس میں گھ گئے ہیں۔

بڑے بیٹے نے پتھر کی وزنی سل سے اُس کا سر کچل کر رکھ دیا۔ اور چھوٹے بیٹے نے مٹی کے تیل کا کنستر چولہے پر جلتی آگ پر گرا دیا۔ وہ جل کر مر گیا۔

اور تب باہر بارش ہونے لگی۔ بارش کی بوچھار کے ساتھ آئے ایک طوفانی ہوا کے جھونکے نے تانبے کی ایک بھاری اور بڑی دیگچی اُس کے گھٹنوں پر دے ماری۔ باورچی خانے کے نیلے کواڑوں سے لگ کر، اُس کی بیوی انجم اُسے ایک ٹک گھورے جا رہی ہے۔

بغیر کسی تاثر یا جھجک کے، انجم اسی طرح پائے کی ہڈیوں کو دیگچی میں اُس وقت تک دیکھتی رہتی ہے جب تک کہ وہ اُبلنے نہ لگیں۔

پام کے درخت کی جانب کھلنے والے روشندان سے انجم باجی اور انجم آپا اچانک دو ڈھنگی بلیوں کی مانند کود کر باورچی خانے میں آگئیں۔

سفید بلی اور کالی بلی۔

وہ دونوں فرش پر مسکینیت سے بیٹھ کر اُسے قتل ہوتا دیکھ رہی ہیں۔ اس لالچ اور اُمید میں کہ جب ہڈیاں اُبل جائیں تو اس کی بیوی اُن کا گودا نکال کر خالی ہڈیوں کو اُن کے آگے چوسنے کے

لیے ڈال دے۔

وہ آہستہ آہستہ قتل ہو رہا ہے۔

اس نے یوں ہی کروٹ سے فرش پر گرے گرے دیکھا کہ انجم کی سفید شلوار میں سے پیڑو کے پاس سے خون کی ایک لکیر رینگ کر فرش پر پھیل رہی ہے۔ شلوار کے اندر اُس کی بچہ دانی کا منھ اس طرح کھل گیا ہے جس طرح شیر خوار بچہ رونے سے پہلے اپنا معصوم اور ستھرا صاف منھ کھولتا ہے، دانتوں سے پاک ایک پوپلا منھ۔

خون کی لکیر فرش پر بہتے بہتے اُس کے سر کے قریب آجاتی ہے۔ پھر اس کی کنپٹی سے نصف دائرہ بناتی ہوئی اُس کے دائیں کان کے اندر رینگ جاتی ہے۔ کان میں جا کر وہ روتی ہے۔ ایک بچی، اس کے کان میں روتی ہے۔

''پاپا— پاپا— میرے پاپا۔''

پھر بچی کی آواز خاموش ہو جاتی ہے۔

اس کے کان میں ہمیشہ کے لیے دفن، اس نے بچی کی آواز کو اپنے کان میں دی گئی ایک پاکیزہ اذان کی طرح سُنا۔

وہ آہستہ آہستہ قتل ہو رہا ہے۔

''گڈو میاں! کیا کر رہے ہو؟ کیا سو رہے ہو، گڈو میاں۔''

کہیں کوئی تکلیف نہیں، کہیں کوئی درد نہیں۔ اس کے جسم پر چاقو سے کھینچی گئی لکیروں کا جال سا بن گیا ہے۔ چاقو کی نوک پر ہزاروں تصویریں لرز رہی ہیں۔ مگر اب وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ ایک بار پھر آنکھوں میں اندھیرا سا آ گیا ہے۔

اور جب اندھیرا پوری طرح آ گیا تو برسوں پرانے اُس آدھے کٹے ہوئے چاند نے اُس کی آنکھوں کو ڈھک لیا جس پر نہ جانے کون سے زمانوں کا خون جم کر کالا ہو گیا تھا۔

پتہ نہیں کب وہ اُٹھا اور کتنے زمانے بعد۔

اس نے اپنے ''قتل'' کو وہیں فرش پر اس طرح پڑا چھوڑ دیا جیسے کوئی کوڑا کرکٹ، پڑا ہوا چھوڑ

دیتا ہے۔ لاپروائی کے ساتھ۔

اس نے اب نہانے کے بارے میں سوچا۔

''میں اب نہاؤں گا۔ ہرے رنگ کے صابن سے خوب مل مل کر نہاؤں گا۔ جی بھر کر میل چھناؤں گا۔''

ایک اندھیرے غسل خانے میں جا کر جھانوے سے رگڑ رگڑ کر وہ نہایا اور صابن کے جھاگوں سے خود کو ڈھک لیا۔ صابن کے سفید سفید جھاگوں سے تاریک غسل خانہ روشن ہو اُٹھا۔ اس نے طہارت کے تمام اُصولوں پر سختی سے عمل کیا کیونکہ وہ اپنے جنازے کو غسل دے رہا تھا مگر جب غسل خانے میں باڑھ آ گئی اور وہاں مینڈک، مچھلیاں اور کیچوے اس کے ٹخنوں کو کترنے لگے تو وہ وہاں سے بے لباس باہر نکل آیا۔

آنگن میں چاندنی رات پھیلی تھی۔ وہ بکسوں والی کوٹھری میں گیا۔ اس نے اپنے پرانے لوہے کے صندوق سے نکال کر، لال سویٹر پہنا۔ بالکل نیا لال سویٹر جو انجم باجی نے اُس کے لیے بُنا تھا، پھر وہ اونٹ کے رنگ کی خاکی پتلون جو اسکول کی ڈریس میں شامل تھی۔ صندوق کے نیچے اس کے سفید براق کرمچ کے پی۔ٹی۔ والے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے لپک کر اُنھیں اُٹھایا، پہنا اور کس کر پھول کی شکل میں فیتے باندھ لیے۔

سویٹر کے نیچے، اس کی پیاری قمیص موجود تھی۔ وہی نیلی اور اُداس قمیص جسے وہ عید کے میلے سے خرید کر لایا تھا۔ وہ تن کر کھڑا ہوا۔ اس نے بالوں میں بھرا ہوا انگیٹھی کا بُرادہ جھاڑا جو اتنا نہا لینے کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔

''تو اب چلو، گڈو میاں۔ چلو حفیظ۔ اپنے گھر چلو۔ بس بہت ہو گیا۔''

گھر جو یہاں سے گیارہ سو چار میل دور تھا اور سفر بہت خطرناک اور آفتوں سے بھرا ہوا تھا۔

اس لیے

جانے والے کے لیے مت روؤ

روؤ اس کے لیے

جو گھر کی سیڑھیاں اُترتا ہے

روؤ اس کے لیے

جو اپنی اکیلی اور آخری چابی

اپنے کوٹ کی جیب میں رکھتا ہے

آدمی سے تم پیدا ہوئے اور آدمی میں ہی جا کر گم ہو جاؤ گے۔

— یہودا امی خائی

جب وہ سفر کے لیے رخصت ہونے لگا تو ایک عورت نے، جس کی شکل دنیا کی ہر عورت سے ملتی جلتی تھی، لال کاغذ سے منڈھی ہوئی، رساول کی مٹی کی ہانڈی اور پیلے پڑ گئے، ایک بوسیدہ مڑے تڑے کاغذ پر لکھا، مسالے والی بریانی کا نسخہ اُسے تھما دیا۔ دونوں کو ہاتھوں میں تھام کر وہ تیزی سے چلنے لگا۔

چلتے چلتے ایک مقام پر اس کا بچپن کا دوست، وہ کن کٹا خرگوش بھی اُسے مل گیا۔ اب وہ سفید کن کٹا خرگوش بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلا۔

ٹھیک اُسی وقت اس کی نیلی قمیص کے کالر پر ایک مدّتوں پرانا، جانا پہچانا کاکروچ تتلی کی طرح اُڑ کر بیٹھ گیا۔

اس کا گناہ، اس کا جرم، اس کی قمیص کے اُداس نیلے کالر پر چپک گیا۔

ایک جگہ رُک کر، اس نے رساول کی ہانڈی کا کاغذ اُٹھا کر جھانکا۔ ہانڈی میں وہ لال رنگ کے کینچوے بجبجا رہے تھے جنھیں مچھلی کے شکار کھیلنے والے اپنی بنسی میں لگا کر، پانی میں بڑی مچھلیوں کو پھانسنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اُس نے بریانی کے نسخے کو، اُس زرد سڑے ہوئے کاغذ کو کھولا اور اندھیرے میں ہی پڑھ لیا۔

وہ گھر کی جائیداد اور ورثے کے کاغذات تھے۔

ایک دن وہاں بہت سی اموات اکٹھا ہوئیں
اور وقت گزر گیا مُردوں کے پر
گھر، کھنڈر اور ویرانے بن گئے
مگر کچھ بولے نہیں

— کارلوس ڈرومنڈ

سفر میں جو بہت لمبا تھا اور شروع میں صرف کالی دلدلوں والی ندیوں اور خاردار جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ زیادہ تر اپنے جنازے کے ساتھ ساتھ ہی چلا، اگرچہ کبھی کبھی وہ جنازے کو چھوڑ کر، ایک چمکتے شعلے، ایک اگیا بیتال کی طرح ادھر اُدھر بھی اُڑتا اور بھٹکتا پھرتا۔

جگہ جگہ ٹھہر کر اس نے منہ بھر بھر کے کیچڑ بھی کھائی جو بالکل چاکلیٹ کے مزے کی تھی۔ اور جس کے سبب اس کے منہ کا ذائقہ اتنا خوشگوار ہو گیا کہ اس کا جی ایک پرانا فلمی گیت گانے کو بھی چاہا مگر یہ احساس کرتے ہی کہ اس کا جنازہ بھی آس پاس ہی ہے، اس نے احتراماً یا مُروتاً گانا گانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اپنی ہی ہوا میں جھومتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔ کسی موسیقی سے باہر نکل آئے ایک اکیلے اُداس مگر مکمل سُر کی طرح ویرانے میں دیوالی تھی۔ نالوں اور چھوٹی چھوٹی ندیوں میں دیوالی کے بجھتے ہوئے دیے تیر رہے تھے۔ درختوں کے تنوں پر ننھے ننھے بلب لٹکے ہوئے تھے۔

وہ تیار تھا۔ ایک اکیلا ٹسر بن کر اپنے جنازے کے ساتھ بھیانک اور نحس ہواؤں میں رقص کرنے کے لیے۔

خدا کی بنائی ہوئی ساری زمین پر وہ کاغذ کے ایک آوارہ پُرزے کی طرح اُڑتا پھرا کیا، کوہستانوں اور وسیع و عریض کوہستانی جنگلوں پر، سمندر پر تیرتے ہوئے برف کے تودوں پر، پہاڑوں پر، اُن سوئے ہوئے آتش فشانوں پر جو اپنی آگ اُگل کر، خاموش ہو گئے تھے اور قبروں کی مانند تھے۔

اس کے پیروں کے نیچے نہ جانے کتنی سرنگیں تھیں۔ کتنی ندیوں نے راستہ بدل لیا تھا اور کتنے دریا سوکھ کر ریت کی گہری کھائی میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس لیے اس کے پیر اس کے سینے میں دھمک پیدا کرتے تھے اور وہیں پیوست ہو جاتے تھے۔ اور اُس کے دانت منھ سے نکل کر اس کے اوپر ہنستے تھے۔ ارتقا کا سفر ایسا ہی رہا ہوگا۔ یہ ایک دوسرا ارتقا ہے ایک تنہا شے کا اکیلا ارتقا، جو جتنا آگے بڑھتا ہے، اتنا ہی پیچھے اور دائیں بائیں کے اندھیروں کی سمت بھی بڑھتا ہے۔

ان دائیں بائیں کے اندھیروں میں اس کے پاؤں کے نیچے وہ گیلی دلدل ہے جہاں، نیچے ہی نیچے کئی ندیاں آکر آپس میں مل رہی ہیں، کہیں اندر ہی اندر گم ہوتی ہوئی، معدوم ہوتی ہوئی۔ وہ ان ندیوں میں صرف قلعے کی ندی تلاش کرتا ہے۔ اس کا پاؤں دلدل میں بھی چونکتا ہے۔ کتے کی سوتی ہوئی آنکھ کی طرح چونکتا کہ اسے قلعے کی ندی کے پانی کی سڑتی ہوئی کائی اور نمی کو محسوس کرتا ہے۔ اُس میں جا کر ڈوب جاتا ہے۔

نہ جانے کب بارش شروع ہوگئی، اور تب دُکھ کی ایک لہر اس کے پاؤں سے اُٹھی اور دل تک آکر ٹھہر گئی۔ یہاں سے وہ آگے نہیں گئی۔ اس نے یہیں اپنا بھنور بنا لیا۔ بارش میں وہ رُکا نہیں، چلتا رہا، جنازہ اُٹھا کر لے جانے والی چار عورتوں میں سے تین نے کالی چھتریاں اپنے ایک ایک ہاتھ سے سنبھال رکھی ہیں۔ وہ بھیگنا نہیں چاہتیں۔ اس نے ان تینوں کو پہچان لیا۔ انجم باجی، انجم آپا اور انجم جو اُس کی بیوی تھی۔ تیسری عورت جو بھیگ رہی تھی، اسے وہ نہیں پہچانتا مگر شاید کبھی خوابوں میں اُسے دیکھا ہو۔

اُس اجنبی عورت کو بھیگتا دیکھ کر اس کے اوپر گہری اُداسی چڑھ آئی۔ یہ اُداسی کی یلغار تھی۔ ایک حملہ تھا، یہ ایک سرکٹی اُداسی تھی، جس کا کوئی چہرہ، کوئی سر نہ تھا۔ صرف احساسِ جرم اور شکست خوردگی سے بھری حرکت تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی جانباز سپاہی ہاتھ میں تلوار تھامے اُس وقت بھی اُسے گھماتا اور چلاتا ہی رہتا ہے جب کہ اس کا سر کٹ کر دھڑ سے الگ ہو چکا ہوتا ہے، کیونکہ اُس کا جسم، اب جسم نہ ہو کر صرف ایک بے معنی حرکت اور لایعنی عمل ہی ہے۔ اس بے چہرہ اور سرکٹی اُداسی کا وار وہ کھاتا رہا اور جرم اور بھیانک گناہ کے احساس، اور خطرناک حد تک ذلیل اور بے مروّت ہونے کے انکشاف

نے گزرے ہوئے زمانے کی ہڈیوں کو اس کے پیروں کے نیچے لا کر ڈال دیا۔ سامنے اُس کا جنازہ تھا اور دوسری طرف گزرا زمانہ، باندوں کے پلنگ پر بیٹھا اُس کے اوپر ہنس رہا تھا۔ اس کی ہڈیوں کو ٹھوکر مارنے سے اُس کی اپنی ہی پنڈلیاں اینٹھ کر رہ گئیں۔ تو سب کچھ، دراصل، کیا صرف اُداس کر دینے کے لیے ہی ہوا؟

اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کن کٹے خرگوش نے بھیگتے ہوئے بار بار جھرجھری لی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رساول کی ہانڈی اور دوسرے میں بریانی کا نسخہ تھا۔ ورنہ وہ کانپتے ہوئے خرگوش کو گود میں اُٹھالیتا۔

قمیص کے نیلے کالر پر بیٹھے ہوئے کاکروچ کا جسم بھیگ کر سکڑ گیا۔ مگر سکڑ کر، گناہ اور بھی طویل اور بھاری ہو گیا۔ تو سب کچھ دراصل، صرف اُداس کر دینے کے لیے ہی ہوا۔ اُس نے سب کچھ ایک کٹھ پتلی کی آنکھ سے دیکھا، جس کے لیے سُکھ بھی دُکھ کی ایک پرچھائیں یا نقل ہی تھا۔ زندگی موت کی طرح تھی اور موت زندگی سے مختلف کہاں تھی؟

اب ایک سنّاٹا، ایک لامحدود سنّاٹا جس کو صرف کٹھ پتلی کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی۔ کٹھ پتلی کی آنکھ کو نیند آنے لگی۔ بوڑھے سنّاٹے کی ایک پرانی لوری میں وہ آنکھ سو گئی۔

اُس کی میت کا کفن بارش میں بھیگ کر پھولنے لگا۔ اس میں ہوا بھرنے لگی اور وہ ایک سفید غبارے کی مانند اوپر اُٹھنے لگا۔ آہستہ آہستہ جنازہ بھاری ہوتا گیا۔

چلتے چلتے ایک مقام ایسا آیا جہاں ایک دیوار نے میت کا راستہ روک لیا۔ یہ ایک جلی ہوئی دیوار تھی جس سے لگا ہوا ایک دلدلی گڈھا تھا۔ گڈھے میں کالا پانی بھرا تھا جو ہلکوریں لیتا ہوا، جلی ہوئی کالی دیوار سے ٹکراتا تھا۔ اور لوٹ آتا تھا۔

وہ خوش دلی کے ساتھ، میت کے پلنگ سے نیچے اُتر آیا۔ مع اپنے بھیگے ہوئے، غبارے جیسے کفن کے۔

پلنگ خالی اور ہلکا ہو گیا۔ جب چاروں عورتوں نے دلدل پر تیر کر، جلی ہوئی دیوار کے اوپر سے

پتنگ کو اُٹھاتے ہوئے اسے پار کرلیا تو وہ دوبارہ آرام کے ساتھ پلنگ پر جاکر لیٹ گیا۔

یہ صدیوں پر محیط سفر تھا۔ نہ جانے کتنے زمانوں بعد، ایک بار پھر اُسے بھوک لگی۔ اس نے ایک پتلی سی افسردہ ندی کے کنارے رُک کر تھوڑی سی دلدل کھائی۔ ندی کے اس کنارے پر بہت تیز مگر بہت جانی پہچانی سی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے بچپن کی ہوا؟

قمیص کا نیلا کالر ہوا میں بری طرح، پھڑ پھڑانے لگا مگر اُس پر بیٹھا ہوا کاکروچ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسے یاد آیا، بہت پہلے شاید کسی اور جنم میں اُس نے ایک اُجاڑ آنکھوں والی لڑکی کے ساتھ ایسی ہی کسی ندی کے کنارے پر بیٹھ کر، ایسی ہی ہوا میں پنیر کے چند ٹکڑے کھائے تھے جن کا مزہ اِس کیچڑ کا سا تھا۔ تب وہ رویا تھا، شاید اُن اُجاڑ آنکھوں پر رویا تھا۔

اُس نے سوچا کہ اُسے ابھی فوراً رونا چاہیے۔ وہ کب سے نہیں رویا؟ آخر وہ اپنے جنازے کے ساتھ ہے، اس لیے تھوڑی بہت گریہ وزاری تو اُسے کرنا ہی چاہیے۔ اُس نے ''گریہ'' کرنے کی کوشش کی۔

مگر افسوس کہ اب ''گریہ'' کہاں تھا۔ اُس نے آسمان کی جانب نظر اُٹھائی۔ ''گریہ'' وہاں تھا۔ آسمان کی نیلی دھند میں اُلجھا اور پھنسا ہوا۔

اُس کی آنکھ اس ''گریے''، اس ''رونے'' کو وہاں سے اُٹھا نہ سکی۔ آنکھ ''رونے'' سے نہیں ہاری، وہ آسمان کے نیلے بے رحم جال سے ہار گئی۔

اب تو بس منہ میں دلدل ہی گھل رہی تھی۔ پنیر کے ملائم ٹکڑے کی طرح۔ پنیر کے ملائم ٹکڑے کی طرح۔

تب ہی کانوں میں ایک کمینی اور ذلیل مسرت سے بھری ہوئی ہنسی گونجی۔ پھر ایک خشمگیں آواز۔ آسمان پر ایک چیل تیزی سے اُڑتی ہوئی چلی گئی۔

اب اُس نے پہچان لیا۔

قلعے کی ندی آ گئی۔ یہ قلعے کی ندی ہی تو تھی۔ ندی کے پار، دور اُس کنارے پر اُسے ایسے چھوٹے

چھوٹے گھر نظر آئے جو انسانوں کی بستی میں ہوتے ہیں۔ یہ سانپوں اور مچھلیوں کے گھر نہ تھے۔ اُس پار ایک جانی پہچانی سی لال بھوری روشنی تھی جیسے سورج ڈوب رہا ہو۔

اس کی میت کا پلنگ اُسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ نہ جانے کہاں نکل گیا، کدھر بھٹک گیا۔

ندی کے اُس پار، کنارے پر پہنچ کر اُس نے جھک کر اپنے پاؤں سے لپٹے کائی کے ریشوں کو صاف کیا اور دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ وہاں ایک واضح لکیر تھی۔ ایک دراڑ اُس کے بھیگے کائی زدہ پیروں کے نیچے تھی۔ زمین پھٹ گئی تھی۔

تو کیا سفر پورا ہوا؟؟

اب روح کا ایک تاریک برِ اعظم دوسرے برِ اعظم سے الگ ہوتا ہے۔ اسے الوداع کہتا ہے۔

اس نے اپنی خشک اور الوداعی آنکھوں سے، مڑ کر پیچھے گزری تمام ندیوں کو، دلدلوں کو، خاردار جھاڑیوں، سڑتے ہوئے پتوں اور بیجوں کو، ریت کے تودوں، کالی چھتریوں، چارپائیوں اور اپنے جنازے کو، اپنے قدموں کے نشانوں کے ساتھ دیکھنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

آخر اُس نے وہ دراڑ پھلانگی۔ جیسے دریائے نیل عبور ہو گیا۔ دراڑ پھلانگ کر وہ خالی ہو گیا۔

زمین کی طرح گردش کرتے ہوئے اس کے جسم پر اندھیرا آنے لگا۔ اس کا جسم اُس کے دماغ کی روشنی سے آڑ میں آ گیا۔

اس کے قدموں نے جو برِ اعظم طے کیا تھا وہ اب بہت تیزی کے ساتھ اُس کے قدموں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے دور ہوتے جانے کی یہ آواز سنی۔

اب کتنے شمسی سال گزریں گے جب زمین کے اس حصے پر دوبارہ روشنی پڑے گی۔

کتنا زمانہ گزر جائے گا، جب دوبارہ اُس کا گناہ گار جسم اس کے دماغ کی روشنی میں جگمگائے گا۔

دماغ جسے کسی لاش کو سڑنے سے بچانے کے لیے، ناک کے ذریعے باہر نکال لیتے ہیں۔ دونوں کو اپنی الگ الگ دنیاؤں میں ہمیشہ کے لیے بھٹکتے رہنے کے لیے چھوڑتے ہوئے۔

دراڑ پار کرتے وقت، احتیاط کے ساتھ رساول کی ہانڈی اور بریانی کے نسخے کو، اپنے ساتھ رکھنا وہ نہیں بھولا تھا۔

وہ اس پار آ گیا۔

انسان کی ازلی معصومیت اور اُس کے ازلی گناہ، اُس کے کرمچ کے جوتوں میں لپٹے ہوئے کینچوے بن کر دراڑ کے اس پار بھی چلے آئے۔

اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے خالی پن کو اچانک کسی شے نے بھر دیا ہے۔ کوئی کھوئی ہوئی شے، اُسے پھر ملی ہے، جسم پر گرتے ہوئے اندھیرے میں اور یقیناً ایسا ہی تھا۔ اُس نے مدتوں پہلے، اپنے کھوئے ہوئے، روح کے جغرافیے کو دوبارہ پالیا تھا۔ اپنی اسکول کی یونیفارم والی خاکی پتلون کی جیب میں، ایک نئے، تازے سفید کڑکڑاتے ہوئے کاغذ پر اُس کی روح کا اُداس اور پیچیدہ جغرافیہ۔

کھوئی ہوئی تمام چیزیں اُسے مل رہی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔

خاموش آسیبوں کی طرح ہم شرکت کرتے ہیں
تمھاری دعوت میں
اور تم جو زندگی میں ہم سے نفرت کرتے ہو
ہمارے میزبان بنو گے
لیکن مُردہ اور بے زبان
ہم انتقام لینے والے سائے ہیں

— الیکزینڈر سولینسٹین

✕

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سرسری طور پر دیکھنے سے وثوق کے ساتھ یہ کہہ پانا کچھ مشکل ہوتا ہے کہ وہاں کسی مکان کی تعمیر ہو رہی ہے یا یہ کہ مکان کھنڈر میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں ہی صورتوں میں گھر کی حالت تقریباً ایک سی اور قابلِ رحم ہوتی ہے۔ ایک ہی سا ملبہ، ایک ہی قسم کا بکھراؤ، ٹوٹ پھوٹ، الّم غلّم چیزوں کا انبار، اور گرتی یا ڈالی جاتی چھتوں کے نیچے ایک ہی قسم کی گھٹن اور تاریکی۔

دونوں حالتوں میں زمین کو ایک دوسرے سے ملتے جلتے دُکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

وہ تینوں سائے جب اس گھر میں داخل ہوئے تو آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔

اُن میں سے ایک وہ تھا جس کا سایہ دو پیروں پر چل رہا تھا اور انسان سے مشابہہ تھا۔ دوسرا، اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے ایک خرگوش کا سایہ تھا۔ اُچھل اُچھل کر اور کچھ لنگڑا کر چلتا ہوا خرگوش جس کا ایک کان کٹا ہوا تھا۔ تیسرا سایہ، اس کی قمیص کے کالر پر، ایک بہت بڑے مگر لرزتے کانپتے ہوئے گناہ کی شکل میں تتلی جیسے کا کروچ کا تھا۔

وہ پرچھائیاں تھیں اور پرچھائیوں کی طرح ہی گھر میں داخل ہوئی تھیں، مگر اسے داخل ہونا بھی مشکل سے ہی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وہاں نہ کوئی دروازہ تھا اور نہ کوئی چوکھٹ۔ وہاں تو صرف بلّیاں، تختے اور شہتیر تھے۔ چھوٹی بڑی اینٹوں کے ڈھیر تھے اور آدمی کے قد کے برابر برابر جنگلی گھاس تھی۔

اندھیرا تھا جسے زمین کے گیلے پن، ریت، مٹی، چونا، پتھر اور شہتیروں اور رسّیوں اور بلّیوں نے

اپنے نادیدہ ریشوں سے بُنا تھا، شاید اس لیے یہ ایک کالا اندھیرا نہ ہوکر سلیٹی اندھیرا تھا، پتھر کے رنگ کا کھردرا اندھیرا، ان سب سے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، بچتے بچاتے وہ بہت دیر تک، احتیاط کے ساتھ چلتا رہا۔

محتاط ہونے کے باوجود، اچانک کہیں اس کا بایاں پیر گیلی مٹی میں دھنس گیا۔

یہ گاڑھے لیس دار گارے کا ڈھیر تھا۔ اس کا پیر کافی گہرائی تک چکنی مٹی کے اس زرد گارے میں دھنستا چلا گیا۔

''گڈو میاں آ گئے۔'' کوئی بولا تھا؟

اس نے لاکھ کوشش کی مگر پاؤں باہر نہ آیا۔ زمین کی کششِ ثقل اور گیلی مٹی کی جکڑن نے اس کے پاؤں کو ہرا دیا۔ آدھی پنڈلی تک، اُس کے پیر پر مٹی کا پلاسٹر چڑھ گیا۔

وہ چیخا، آہستہ سے چیخا مگر اُس کی چیخ خود اُس کے لیے بیگانی تھی۔ وہ اپنے تئیں اجنبی تھا، اتنا اجنبی اور غیر متعلق، جیسے کسی دوسرے سیارے کا جاندار ہو اور جس کا کوئی رشتہ، ارتقا کے سفر میں، اس کرہ ارض کے کسی حقیر سے حقیر کیڑے تک سے نہ ہو۔ اُس نے بندروں کی اُن پرچھائیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جو اس ویران گھر میں چاروں طرف بھٹک رہے تھے۔

اُس کا کن کٹا خرگوش اچانک اُچھلتا اور کودتا ہوا، اینٹوں اور ملبوں کے تاریک ڈھیر میں کہیں گھس کر گھاس تلاش کرنے لگا جو اُسے فوراً مل گئی۔

اس کی قمیص کے کالر پر سے کاکروچ نے جست بھری اور اندھیرے میں، دوڑتے اور بھاگتے ہوئے اپنے لاتعداد ساتھیوں سے جاملا۔

وہ گناہ اب تنہا اور افسردہ نہ رہا۔ وہاں تو گناہوں کی محفل جمی تھی۔ گناہوں کا نور ہی نور۔

اور تب، دفعتاً اُس پر انکشاف ہوا کہ آگے بڑھنا بے سود ہے، اس تعمیر یا انہدام کا سلسلہ ہر طرف، ہر سمت میں بکھرا ہوا ہے۔

یہ گرے ہوئے شہتیر، یہ جھولتے ہوئے تختے، یہ آڑی ترچھی لٹکتی ہوئی بلّیاں، یہ ٹوٹے ہوئے شیشے، یہ پڑی ہوئی اینٹیں، بوڑھی زمین کے ذریعے اُگل دی گئیں، مدتوں پرانی گلی سڑی شکاری

چھریاں اور یہ قدِ آدم گھاس، یہی وہ منزل تھی جس کی خوشبو کے سہارے ایک ہجرت کرنے والے پرندے کی مانند اس نے اپنا سفر طے کیا اور راستہ نہ بھولا۔

یہ گھر ہے — اُس کا گھر۔

''گڈو میاں آگئے، گڈو میاں۔'' کون بولا تھا؟؟

اس کا بایاں پیر بدستور گارے میں دھنسا ہوا تھا۔ ایک پیر سے جب توازن برقرار رکھنا مشکل ہوگیا تو رساول کی مٹی کی ہانڈی کو اُس نے نیچے پڑی مٹی ہی کے سپرد کر دیا۔ مٹھی میں دبے ہوئے بریانی کے نسخے کو اُس نے تھوڑا جھک کر، دائیں پیر میں پہنے ہوئے کرمچ کے جوتے میں اُڑس لیا۔

اب اُس نے سہارا لینے کے لیے دونوں ہاتھ اندھیرے میں پھیلائے۔

کیا یہ اُس کے ہاتھ تھے؟

ویسے تو یقیناً یہ اُس کے ہاتھ تھے مگر اس وقت وہ کسی آکٹوپس کے ہاتھ پیروں کی طرح تھے۔ جس کا ہر ہاتھ اُس کے دوسرے ہاتھوں سے اور ہر پیر اُس کے دوسرے پیروں سے مختلف ہے، مگر آکٹوپس کے پیر بھی ہاتھ ہیں اور ہاتھ ہی پیر بھی۔ آکٹوپس کا ہر ہاتھ دوسرے ہاتھ سے مختلف انداز میں سوچتا ہے۔ ان ہاتھوں کا اعصابی نظام ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔

اندھیرے میں ایک ٹانگ پر کھڑے چمگادڑ نے پر پھیلائے۔ اس کا دایاں ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا۔

اینٹ؟

تختہ؟

شہتیر؟

نہیں — یہ لکڑی نہیں، یہ ان میں سے کوئی نہیں۔

لوہا ہے۔

اس کے دائیں ہاتھ نے پہچان لیا کہ لوہا ہے۔ شاید بایاں ہاتھ نہ پہچان پاتا جو شاید ایک قابل افسوس بات ہوتی۔ ہاں لوہا ہی تھا۔ بہتے والے نل کا موٹا پائپ۔ مہربان کالا، مضبوط اور مقناطیسی قوت

سے بھرا ہوالوہا۔ یہاں نل لگا تھا۔ ہتھا چلاتے ہی ایک سوبیس فٹ کی گہرائی سے، زمین کا میٹھا شفاف پانی موٹی دھار کی صورت نل کی حوضیہ میں گرنے لگتا۔ ادھر اُدھر فوارے کی طرح چھینٹیں بکھیرتا۔ وہی پرانا، اس کے بچپن کا نل۔

نل پر کھڑے ہوکر باورچی خانے کا سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ایک ایسی فلم کی مانند جسے دور سے دیکھا جارہا ہو۔

چولہا، چولہے سے اُٹھتا دھواں، آٹا گوندھنے کا تسلہ، روٹی کی ڈلیہ، توا اور چمٹا اور نہ جانے کیا کیا۔

اُس نے نل پر اپنا ہاتھ زور سے مارا، کوئی آواز نہیں۔ وہ اتنا چلا، اتنا بھٹکا۔ کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور کتنی چیزوں سے ٹکرایا۔ کوئی آواز نہیں گونجی۔

بس سناٹا تھا۔ ایک ازلی سناٹا۔ کائنات کی تخلیق ہونے سے پہلے کا سناٹا۔ اس نے سناٹے کی آواز کو ایسے سنا جیسے ندی میں پانی بہہ رہا ہو۔

وہ کس کنارے پر تھا۔ یہ نہ زندگی کا کنارہ تھا، نہ موت کا۔ یہ تو بس ایک بیت گئے پانی کا ہیولیٰ تھا۔ نل کے پائپ سے پانی کی پرچھائیں باہر آئی اور لمبی، اونچی ہوتی چلی گئی۔ پتہ نہیں چھت تھی یا نہیں۔ آسمان کہیں تھا یا نہیں، مگر بارش ہونے لگی۔ بے آواز بارش میں اُس کا سر بھیگنے لگا۔ ہوا بھی چلی، بہت زور کی ہوا۔

ہوا میں وقت کی راکھ اُس کے جسم سے کبھی اُڑتی ہے، کبھی کچھ زیادہ ہی جمع ہو جاتی ہے۔ ہوا کے دوطرفہ حملے کے باعث کون اُسے آلودگی سے پاک کرے گا۔ یہ دغاباز اجنبی ہوا؟ وہ گناہ جو دھوبی گھاٹ پر بھی نہیں دھل سکے، اب بھلا کیا دھلتے۔ اتنے بڑے بڑے دھبے۔ ایسے بڑے بڑے پتھروں جیسے گناہ جو بچپن میں، کھیل کھیل میں آنگن میں اکٹھا کیے تھے، وہ مورتیاں بن کر بھیا تک مکھوٹے لگا کر، کسی پوشیدہ سنگ تراش کے ذریعے، زندہ کر دیے گئے اور اب یہاں اُس کے پیچھے پیچھے چلے آئے ہیں۔

مگر بارش تو ہوتی رہی۔ ہوا بھی چلتی رہی اور وہ بھیگتا رہا۔ مٹی میں دفن ہوئے اپنے بائیں پیر کے ساتھ، اس کا احساس اعتماد میں بدل گیا۔ وہ منزل تک آ ہی پہنچا۔

''گڈو میاں آ گئے... گڈو میاں، گڈو میاں... گڈو میاں آ گئے۔''

اور اس بار اُس کے کانوں نے سناٹے کی بولی بولتے ہوئے اپنے طوطے کو پہچان لیا۔ سنبل طوطے کی توتلی اور ہری مرچ جیسی زبان۔

اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑیں۔

طوطے کا پنجرہ کون سی کڑی، کون سے شہتیر اور کس داسے میں لٹک رہا ہے؟

وہ تھک گیا۔

کیا کہیں کوئی خالی دیوار بچی کہ نہیں، جس سے وہ اپنی پیٹھ ٹکا لے؟

اُس نے ایک غیر ضروری مایوسی کے ساتھ اس خوفناک تھکان کے بارے میں سوچا۔

وہ بوڑھا ہو کر مرا مگر بوڑھا ہونے کے کیا معنی تھے۔

جسم میں عمر کا بڑھتے جانا، غبارے میں گیس کا بڑھتے جانا — اس کے بعد؟

مگر عمر بڑھنے کے ساتھ سب کچھ ختم نہیں ہوتا۔ سب ہی نہیں مٹ جاتا۔ بہت کچھ نیا بھی شامل ہوتا رہتا ہے۔ نہ جانے کون کون سے قدیم ماخذوں سے پانی، پتھر اور برف اِدھر پھسلتے اور بہتے رہتے ہیں۔ نہ جانے کون سے زمانوں کے لوگوں کی حرکات وسکنات اب اُس کے جسم میں آ کر بسیرا کرنے لگی ہیں۔ اب وہ یہاں دوبارہ زندہ ہونے کے لیے آئی ہیں۔ وہ انداز جو پہلے نہ تھے۔ نہ بچپن میں اور نہ جوانی میں۔ وہ اب چلے آ رہے تھے۔ ایک نئی روح کے ارتعاشات جسم کے پرانے خدوخال کو بدلتے جاتے تھے۔ جسم بدل رہا تھا۔ وہ نئے انداز سے کھانا چباتا تھا۔ دوسرے ڈھنگ سے ہڈیاں چوستا تھا اور اُس کے پیٹ میں آنتیں ایک نئے انداز میں بولتی تھیں۔

یہ نیا پن اس جسم کی ایجاد نہ تھا۔ یہ کہیں دور، بہت دور پرانی دنیاؤں سے آیا تھا۔ قبر میں پڑی

آباؤاجداد کی ہڈیوں سے، بن مانسوں سے اور مچھلیوں سے۔

تو بوڑھے ہونے کے کیا معنی ہیں؟ ایک تسلسل کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ کیا کوئی صحیح معنی میں ریاضی کی تعریف متعین کر سکا ہے؟

کھوئی ہوئی چیزوں کے دوبارہ ملنے کا وعدہ تھا اور یہ وعدہ جو ایک راز تھا اب اُس پر کھل گیا۔ موت بھی ایک کھوئی ہوئی شے تھی اور اس ڈرامے کی اُس پرانے انداز اور رویّے کی ایک دُھندلی کاپی ایک بڑی نقل کے سوا اور کیا تھی؟

وہی موت تھی، سڑی بُسی، صدیوں سے بھی پرانی اور وہی اِدھر آ رہی تھی۔ نئی بن کر، ایک کمزور افسانے یا ناقص ناول کی ایک گھٹیا اور بدنیت ڈرامے میں تقلیب۔ موت بھی بہرحال زندگی کی طرح وقت میں ہی مقید تھی۔ موت اور زندگی دونوں کو نہیں معلوم کہ بہت جلد ایک خوفناک ابدیت، وقت کی کمر پر زبردست لات مارنے والی ہے۔ موت اور زندگی دونوں کو ابدیت کے آگے گھٹنوں گھٹنوں جھک جانا چاہیے، ابدیت جو انسان کے جسم کا نہیں، اُس کی روح کا گوشت کھاتی ہے۔

ہاں، مگر اس میں ایک پہلو اُداسی کا ضرور تھا۔ ایک قمیص نیلے رنگ کی ہے، جو سناٹے کے زور سے ہلتی اور ڈولتی ہے۔

مگر سناٹا کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ کمزور نہیں ہوتا۔ اُس کے عقب میں ایک پُراسرار اور ریزہ ریزہ کر دینے والی طاقت ہوتی ہے جس سے کائنات کی تشکیل ہوتی رہتی ہے۔ اور کائنات تو مکمل نہیں ہو سکتی کیونکہ ابھی انسان کا پیٹ آنتوں سے خالی نہیں ہے۔ ایک مکمل کائنات میں آنتوں اور معدے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

جب تک یہ نہیں ہوگا یہ ابدی سناٹا اپنی پُراسرار ناقابلِ فہم طاقت کے ذریعے جسموں کو خوابوں میں چلنے پھرنے والی پرچھائیوں میں تبدیل کرتا رہے گا اور رُوحوں کا کچا گوشت اور ہڈیاں نگلتا رہے گا۔

سناٹے کی دھمک سے گیلی مٹی پر رکھی رساول کی مٹی کی ہانڈی چٹخ گئی اور اس میں سے کیچوے

نکل نکل کر اُس کی پنڈلی پر چڑھنے لگے۔

دائیں پیر کے کرمچ کے جوتے میں اُڑسا ہوا بریانی کا نسخہ، گھر جائیداد کی دستاویز بن کر، باہر آ گیا۔ اور اُس کے گھٹنوں سے لپٹ گیا۔

اس کے پیٹ کے اندر، آنتیں اس صدمے سے سہم کر پچک گئیں۔

اندھیرے میں نیند کی بو آنے لگی۔

سناٹے کی دھمک اُن سب کے قدموں کی دھمک تھی۔ ایک قطار میں چلتے ہوئے قدم۔ ایسی دھمک سے تو ندیوں کے اوپر بنے مضبوط پُل بھی چیخ جاتے ہیں۔

وہ آ رہے تھے — نیند سے اُٹھ کر۔

اُس کے سامنے ناک کی سیدھ میں اچانک دالان میں لٹکی ہوئی لالٹین روشن ہو گئی۔ اور وہ نظر آ گیا۔ باورچی خانہ صاف نظر آ گیا۔

یہ باورچی خانہ تھا۔ اس کا پرانا بچپن کا باورچی خانہ۔ مُردے، باورچی خانے کی چوکھٹ پر کھڑے تھے۔

چولھے سے دھواں نکلنے لگا۔

سارے مُردے وہاں بیٹھے تھے۔ اپنی اپنی پٹلیوں پر۔ ان کے سامنے تام چینی کی رکابیاں تھیں۔ سفید رکابیاں جن کے کنارے نیلے تھے۔

اس نے پہچان لیا۔ یہ سب اس کے گھر کے افراد تھے۔ وہ سوتے سے اُٹھ کر آئے تھے۔ نیند میں اُن سب کی زبانیں اُن کے اپنے ہی دانتوں سے کٹ گئی تھیں۔ منھ سے خون کی لکیریں بہتی ہوئی ٹھوڑی تک آ رہی تھیں۔

وہ سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اور اُن کوؤں سے مشابہ تھے جو اپنے ساتھی کی موت کا ماتم منانے کے لیے بہت پہلے کبھی باورچی خانے کی منڈیر پر اکٹھا ہو گئے تھے۔

اُن کی پرچھائیاں باورچی خانے کی دیواروں پر آہستہ آہستہ ڈولتی تھیں۔ دھوئیں سے بنائی گئی تصویروں کی طرح۔

تام چینی کی رکابیوں میں سوجی کا سفید حلوہ اور روٹیاں رکھی تھیں۔ ان سب نے حلوہ روٹی کھانا شروع کردیا۔

اس نے ان کے دانتوں اور جبڑوں کے چپڑ چپڑ چلنے کی آواز کو سنا۔ دانتوں کے چلنے کے اس شور میں ہرایک کے منھ کی آواز دوسرے سے یکسر منفرد اور جدا تھی۔ اس نے تو ہر آواز کو پہچان لیا۔ ہر منھ کو اور ہر دانت کو۔ کڑیوں سے ڈوری میں لٹکتے ہوئے بلب کی دھوئیں کی روشنی میں جلدی جلدی حلوہ روٹی چبانے اور نگلنے کی صدائیں اور بھی قدیم ہوگئیں۔

مگر وہ اُس کو نہیں پہچان رہے تھے۔ وہ اس کو دیکھ تک نہیں رہے تھے۔ وہ جیسے نیند میں کھا رہے تھے۔

یہ حشر کا میدان تو نہیں تھا۔ اور اُسے اپنی ماں کا نام بھی یاد نہ تھا۔

کسی نے اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہاں شناسائی کی رمق تک نہ تھی۔

کسی نے نہیں دیکھا کہ سامنے لوہے کے نل کے پائپ کو پکڑے پکڑے وہ کھڑا تھا۔ اور اُس کا ایک پاؤں مٹی میں دفن تھا، کسی نے سر اٹھا کر یہ تک نہ دیکھا کہ باورچی خانے میں ایک پتیلی خالی ہے اور سامنے تام چینی کی ایک رکابی میں سوجی کا سفید خشک حلوہ اور باسی روٹی رکھی ہے۔

وہ صرف کھا رہے تھے، چبا رہے تھے، نگل رہے تھے اور اُن کی ٹھوری سے خون بہہ کر تام چینی کی سفید رکابی میں گر رہا تھا۔

انھوں نے ایک دوسرے کی جانب بھی نظر نہ اُٹھائی۔ وہ سب، ایک دوسرے کے ماں باپ، بھائی بند، عزیز دار، قرابت دار ایک دوسرے کو پہچانتے تک نہ تھے۔ اُن میں صرف دو چیزیں مشترک تھیں۔

ایک تو روٹی اور حلوہ اور دوسری خون کی لکیر۔

کیا یہ حشر کا منظر تھا؟

اور تب اُس نے سنا، بلکہ اُس کی سال خوردہ پھوئے جیسی بدرنگ اور خشک کھال نے سنا۔ اس کے آکٹوپس جیسے الگ الگ نظامِ اعصاب رکھنے والے، اندھیرے میں پھیلے دو ہاتھوں نے سنا کہ دور کہیں اذان ہو رہی تھی۔ فجر کی اذان۔

مگر یہ اُس کے مسلک کی مسجد کی اذان نہ تھی۔ اُس اذان میں ابھی کچھ وقفہ باقی تھا۔

اس نے محسوس نہیں کیا کہ موت گلگلی پھینک کر سارے احمقوں کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اور وہ ابھی بھی ''میدان پر'' پر ہونقوں کی طرح کھڑا تھا۔

اُسے اپنی موت کے بعد بھی یہ نہ پتہ چل سکا کہ موت کس نفاست، مہارت اور سلیقے کے ساتھ، انسانوں کو حادثات، بیماریوں، تباہیوں اور بڑھاپے سے باہر کھینچ کر، اپنے لیے منتخب کر لیتی ہے۔ اور تب ایک عدالت کے لگنے کی باری آتی ہے۔

باورچی خانے میں اتنی بہت سی اموات اکٹھا تھیں۔ اور وقت مُردوں کو کُتر کُتر کر کھانے کے ساتھ خود انھیں بھی حلوہ روٹی کھلانے کا عادی ہو چکا تھا۔ اور کیوں نہ ہو، آخر وقت کو خود ابدیت کے بھیانک بھاڑ سے کُھلے منہ میں حلوہ بن کر ہی گُھل جانا تھا۔

ہر شخص کو ایک نہ ایک دن اپنے جیسے لوگوں سے جا کر ملنا ہوتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اُسے پہچان بھی پائیں گے یا نہیں۔ کیا دوبارہ زندہ ہونا اسی کو کہتے ہیں یا یہ کوئی دوسری فنا ہے یا فنا کی عدالت میں ایک مقدمہ، انسان کی آنتوں پر دائر کیا گیا۔ کبھی نہ ختم ہونے والا ازلی اور ابدی مقدمہ؟

آخرکار، مٹی میں دفن اپنے بائیں پیر کو وہیں چھوڑتے ہوئے، اپنے پیٹ کی آنتوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتا ہوا، ایک ہی پیر پر چلتا یا مضحکہ خیز انداز میں کودتا ہوا، بے رحم اجنبی ہوا اور بے آواز بارش کو اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا، وہ بھی باورچی خانے میں آ گیا اور ایک خالی کونے میں، دیوار سے لگ کر، اپنی پٹلی پر بیٹھ کر سر جھکا کر، تام چینی کی رکابی میں اپنے حصّے کی حلوہ روٹی کھانے لگا۔

گیہوں کی سفید روٹی اُس کے منہ کے خون سے کچھ اس طرح سن گئی جیسے آدھے چاند پر سوکھا ہوا کالا خون۔

دور ایک مسجد سے پھر اذان ہوئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے مختلف مسجدوں سے اذانیں ہونے لگیں۔ وقفہ ختم ہو گیا۔ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی اذانوں کی آواز سے پیدا شور نے مشرق میں ایک بار پھر سورج طلوع ہونے کی خبر دی۔

اَللہُ اَکْبَرُ اَللہُ اَکْبَرُ

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔
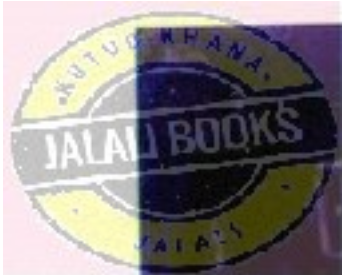
Nemat Khana (Novel)

by Khalid Jawed

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 93-81029-91-1